داستانِ ناتمام

مکمل دو حصے

خودنوشت سوانح

مولانا اسیر ادروی

کتب خانہ حسینیہ دیوبند ۲۴۷۵۵۴

داستانِ ناتمام

خودنوشت سوانح

(مکمل دو حصے)

مولانا اسیرؔ ادروی

ناشر

کتب خانہ حسینیہ دیوبند

KUTUB KHANA HUSANIA

Deoband-247554

تفصیلات

نام کتاب	:	داستان ناتمام (خودنوشت سوانح)
مؤلف	:	مولانا اسیرادوری
صفحات	:	338
طبع اول	:	نومبر ۲۰۰۹ء
ناشر	:	کتب خانہ حسینیہ دیوبند
کتابت	:	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
قیمت	:	180/=

ای میل: **kutubkhanahusainia@gyahooom**

فون نمبر: 9253210262 01336-223266

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی) 9235327576

zeyaulhaquekbd@gmail.com

☆ کتب خانہ عزیزیہ، اردو بازار جامع مسجد دہلی 110006

☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926

داستانِ ناتمام

خودنوشت سوانح

(حصہ اول)

مولانا اسیرؔ ادروی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ کتاب

یہ تاریخ کی کتاب ہے اور نہ کسی واقعہ کی تحقیقاتی رپورٹ، یہ ایک عام آدمی کی کہانی ہے جس نے نہ کوئی محیر العقول کارنامے انجام دیئے ہیں، نہ علم وفضل کا عظیم الشان مظاہرہ، اس کو پھولوں کے چمن زاروں سے بھی گذرنا پڑا ہے اور خارزار وادیوں سے بھی، وہ آدمی حساس بھی ہے اور کسی زمانہ میں شعروادب سے بھی اس کا گہرا واسطہ رہا ہے، اس لئے اس کتاب میں گفتنی اور ناگفتنی دونوں طرح کی باتیں آگئی ہیں، اس میں بچپن کی شوخیاں بھی ہیں اور نادانیاں بھی، عہد شباب کا جوش وخروش بھی ہے، رنگ وبو برستے ہوئے موسم کی بہار بھی، اس میں بڑھاپے کی سنجیدگی ومتانت بھی ہے، اور حقیقت شناسی بھی، اس لئے ہر دور کی کہانی کو اسی دور کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر پڑھنا چاہئے تبھی مطالعہ کا حق ادا ہوسکتا ہے، اس آپ بیتی سے نہ کسی کی توہین مقصود ہے اور نہ تنقیص، بلکہ مصنف کے حاشیہ خیال میں دور دور تک اس کا شائبہ بھی نہیں رہا، اس اظہارِ صداقت کے باوجود اگر کسی نازک دل کو ذہنی اذیت محسوس ہو تو میں پوری صدق دلی سے معافی چاہتا ہوں اور خدا سے بھی دعا کرتا ہوں کہ میری اس نادانستہ خطا اور غلطی سے درگذر فرمائے، یہ حقیقت تو بہرحال اپنی جگہ ہے،

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا وہ کون ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اسیر ادروی
۲۷؍ستمبر ۲۰۰۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرستِ مضامین (حصہ اوّل)

☆☆☆☆☆

داستان ناتمام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آپ کسی تیز رفتار ٹرین سے سفر کریں اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتے جائیں تو آپ کے سامنے مختلف طرح کے مناظر آتے چلے جائیں گے، مختلف طرح کی آبادیاں، مختلف طرح کے لوگ، جنگلات، میدان و بیابان، دریا، چٹیل میدان، لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں اور جھومتے ہوئے پودوں کی بہاریں آپ کو دعوتِ نظارہ دیں گی، کہیں دور پر کسانوں کی جھونپڑیوں کی قطاریں، کہیں جانوروں کے ریوڑ، کہیں ننگ دھڑنگ کسانوں کے بچوں کے جمگھٹے آپ کی نگاہوں کے سامنے آئیں گے اور برق رفتاری کے ساتھ گذر جائیں گے، آپ کی ٹرین برق رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی ہے کہ ہزاروں لاکھوں چراغوں کی جگمگاہٹ کا منظر سامنے آئے گا، جیسے کہیں دور زمین پر آسمان کا دیوتا اپنی پھول دار چادر اوڑھے ہوئے اتر پڑا ہے، پھر بلند و بالا عمارتیں، بجلی کی روشنی میں ان کا حسن و جمال جنتِ شدّاد کی طرح آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لے گا، جیسے کوئی فردوسِ گم شدہ یک بیک نمودار ہوگئی ہے، لیکن وہ ایک شہر تھا جہاں سے آپ کی ٹرین اسی تیز رفتاری کے ساتھ گذر جائے گی جیسے میدان و بیابان پر نگاہِ غلط انداز ڈالتی ہوئی نہایت شانِ بے نیازی سے گذرتی چلی آرہی ہے، آپ محسوس کریں گے کہ ایک جگہ سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں اور باہر کے مناظر متحرک، رواں دواں اور پیچھے بھاگتے جارہے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے، سارے مناظر جامد وساکت ٹھہرے ہوئے ہیں خود آپ ان کو چھوڑ کر آگے کی جانب تیز رفتاری سے

بھاگتے جارہے ہیں، اگر آپ چاہیں کہ دیکھا ہوا کوئی خوبصورت منظر دوبارہ دیکھیں تو یہ ممکن نہیں ہوگا، کیونکہ جب تک دوبارہ دیکھنے کا آپ کے دل میں خیال آئے گا تب تک وہ مناظر آپ کی نگاہوں سے کوسوں دور چلے جائیں گے، کیونکہ آپ کی ٹرین میلوں آگے جاچکی ہوگی، آپ ایک مجبور اور بے بس قیدی کی طرح نہایت بے بسی کے ساتھ ان مناظر کو دیکھیں گے جو کبھی آپ کے قابو میں نہیں آئیں گے کیونکہ وہ آپ کی دسترس سے باہر ہیں، آپ کی ٹرین وہیں جاکر رکے گی جو اس کی منزل ہے۔ زندگی بھی ایک تیز رفتار ٹرین ہے، اس کے لئے نہ سکون ہے نہ ٹھہراؤ، یہ ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے اور اپنی منزل کی طرف برق رفتاری سے بھاگتی چلی جارہی ہے جو خالق زندگی نے اس کے لئے متعین کر رکھی ہے، جب زندگی کی گاڑی اپنی منزل پر پہونچ جائے گی وہیں زندگی کا سفر ختم ہو جائے گا، دنیا اس کو موت کے لفظ سے تعبیر کرتی ہے، حالانکہ یہ زندگی کے سفر کی پہلی منزل ہے، اسی منزل پر آکر زندگی کو ابدیت ملتی ہے، دوام وثبات حاصل ہوتا ہے، یہ دن، یہ ہفتے، یہ سال پیچھے بھاگتے جارہے ہیں، یہ نظر کا دھوکا ہے جیسے انسان ٹرین میں بیٹھ کر سارے مناظر کو پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھتا ہے، درحقیقت یہ کائنات اپنی جگہ ٹھہری ہوئی ہے، انسانی زندگی خود رواں دواں ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا یہ زندگی کے مراحل ہیں، کائنات کے نہیں۔

سمندر ساری دنیا میں بادل بھیج کر جل تھل کر دیتا ہے، لیکن اس پانی کا ایک ایک قطرہ پھر لوٹ کر اسی سمندر کی آغوش میں سما جاتا ہے، اس کائنات کا وجود بھی اسی ایک واجب الوجود کی ذات میں گم ہو جاتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے مگر اظہار جرم ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں

جس طرح سفر چاہے کتنے ہی آرام وآسائش سے گذرے بذاتِ خود مقصد نہیں ہوتا بلکہ منزل مقصود تک پہونچانے کا ذریعہ ہوتا ہے، سفر میں ہر طرح کے آرام کے باوجود آپ کا دل چاہتا ہے کہ جلد از جلد یہ سفر ختم ہوتا کہ جس مقصد کے لئے یہ سفر اختیار کیا گیا ہے اس کی تکمیل ہو سکے، پھر کاروانِ حیات کا یہ سفر بذاتِ خود مقصد کیسے ہوسکتا ہے، یقیناً یہ کارواں بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے، زندگی بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ کچھ بلند مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

لوگ شہروں اور ملکوں کے سفر نامے لکھتے ہیں، میں خود زندگی کا سفر نامہ لکھ رہا ہوں لیکن یہ سفر نامہ نامکمل ہوگا، یہ داستان تشنۂ تکمیل رہ جائے گی کیونکہ اس کا آخری باب میں خود نہیں لکھ سکوں گا، میں نے یہ کام کلکِ قدرت کو سپرد کر دیا ہے اور جب قدرت کا قلم اس باب کو لکھے گا تو اسے آپ پڑھیں گے، آپ کے ساتھ اور دوسرے بہت سے لوگ پڑھیں گے لیکن مجھے خود اس کتاب کے اس آخری باب کو پڑھنے کا موقعہ نہیں ملے گا اور نہ اس باب میں ایک حرف کی کمی بیشی کا مجاز رہوں گا کیونکہ جب یہ باب مکمل ہوگا تو میرے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر چکا ہوگا، روشنائی خشک ہو چکی ہوگی، حتیٰ کہ میں اس کے مطالعہ سے بھی محروم رہ جاؤں گا کیونکہ جب یہ لکھا جائے گا تو مری آنکھوں کی روشنی رُخصت ہو چکی ہوگی اور میرا وجود ایک گہرے اندھیرے میں ڈوب چکا ہوگا۔

نام، خاندان، ماحول..................

میرا خاندانی نام نظام الدین اور والد صاحب کا اسم گرامی شیخ عبدالکریم ہے، والد صاحب اپنے عہد میں پڑھے لکھے سمجھے جاتے تھے، بڑے مذہبی آدمی تھے، محلّہ کی مسجد میں پانچوں وقت کی نمازیں وہی پڑھاتے تھے، علماء سے بڑی قربت رکھتے تھے، اسلامی حمیت ان میں بے پناہ تھی، اپنی محترم شخصیتوں کی قومی وملی سرگرمیوں سے

واقف ہی نہیں تھے بلکہ عملی طور پر ان میں حصہ بھی لیتے تھے، وہی بتاتے تھے کہ تحریک خلافت کے زمانے میں فنڈ جمع کرنے کے سلسلہ میں ادری میں جلوس نکالا جاتا تھا اور ہم لوگ اس میں حالیؔ کی مشہور نظم پڑھتے تھے جس کا پہلا شعر ہے،

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

ہمارے ضلع میں سب سے بڑا چندہ ادری میں ہوا، اور خلافت کمیٹی کو بھیجا گیا تھا، والد صاحب میلاد پڑھتے تھے، تین آدمیوں کا گروپ تھا، حکیم عبدالعزیز خاں، حافظ محمد ضمیر صاحب اور والد مرحوم، ادری اور ادری کے ملحقہ مواضعات شاہ پور، خالص پور، علی نگر بھی میلاد پڑھنے جانے تھے، میں نے اُردو پڑھ لی تو گھر میں مولودِ طیش، مولود سعیدی، مولودِ مجیدی تینوں میلاد کی کتابیں موجود تھیں، ان میں کچھ نثر ہے اور کچھ نظمیں بھی، اس وقت ادری میں سب ایک مسلک پر تھے اور وہ آباء واجداد کا مسلک تھا، بدعات وخرافات کی پورے معاشرے پر حکمرانی تھی، چڑھاوا، نذر و نیاز، فاتحہ، تیجہ، چہلم، تعزیہ داری بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھی، محرم میں بڑے اہتمام سے ملیدہ بنتا تھا، رات رات بھر مرثیہ خوانی ہوتی، کربلا جا کر مٹی لائی جاتی اور ہر محلّہ کے چوک پر رکھ کر مٹی کے برتن سے ڈھانک دی جاتی اور اس دن سے روزانہ شام کو گھنٹوں خوب جم کر ڈھول اور تاشے بجتے اور ہم سب بچے اس میں جوش وخروش سے شریک ہوتے، محرم کے جلوس میں بنوٹ، گدکا پھری اور بنیٹھی کا تماشہ ہوتا، ایک لاٹھی کے دونوں سروں پر پُرانے کپڑوں کے لتّے باندھ دیئے جاتے اور ان کو مٹی کے تیل میں ڈبو دیا جاتا، ۹؍محرم کی شب میں جب پورا گاؤں پھاٹک کے صحن میں جمع ہوتا تھا تو نوجوان بنیٹھی بھانجنے کے لئے میدان میں آتے تو دونوں سروں میں ماچس سے جلا دیا جاتا

اوراس کو بیچ سے پکڑ کر گردش دیا جاتا، یہ گردش اتنی تیز ہوتی تھی کہ آگ کا ایک دائرہ بن جاتا تھا اور شعلۂ جوالہ کا منظر نظر آنے لگتا تھا، یہ بڑا پُر لطف نظارہ ہوتا تھا، اس زمانے کے بڑے نیک اور صوفی صافی سمجھے جانے والے لوگ بھی بنیٹھی کا کرتب دکھاتے تھے۔

رسم ورواج میں جکڑے ہوئے اس معاشرے کی تشکیل میں کچھ تو شیعہ افسروں کا ہاتھ تھا جنھوں نے مسلمانوں کی ہر آبادی میں ایک پختہ چبوترہ بنوا دیا اور اس پر ایک یا دو بیگھ زمین وقف کرادی تھی، اس طرح تعزیہ داری کو ہر مسلم بستی میں رواج دیدیا تھا، دوسرے مصنوعی پیروں اور فقیروں کا ہاتھ تھا جو نذر و نیاز، فاتحہ، گیارہویں وغیرہ کی نیازیں جاری کررہے تھے، حال یہ تھا کہ میلاد میں قیام اس یقین کے ساتھ کیا جاتا تھا کہ حضور اکرم ﷺ یہاں تشریف لائے ہیں خوب جھوم کر اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ یا نبی سلام علیک والی نظم پڑھی جاتی تھی۔

عدم کے اندھیرے سے وجود کے اُجالے میں..................

ادری، ضلع اعظم گڈھ میں میری پیدائش ۱۹۲۶ء میں ہوئی، یہ تاریخ ہمارے یہاں لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب ہمارے محلّہ کوٹ کی مسجد کی بنیاد پڑی تھی اور تعمیر ہو رہی تھی اسی سال میری پیدائش ہوئی، مسجد پر ۱۳۴۵ھ کندہ ہے، بس اسی بنیاد پر میں نے سن عیسوی سے تطبیق دے کر اپنا سالِ ولادت ۱۹۲۶ء مان لیا، مجھے اپنے بچپن کے واقعات بالکل یاد نہیں، البتہ دو ایک واقعات ایسے ہوئے جو نا قابل فراموش تھے، اس لئے آج بھی وہ میرے ذہن کے ایک گوشے میں پڑے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ زلزلہ کا ہے، میری عمر چھ سات سال کے قریب تھی، میں باہر اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ زلزلہ کا

جھٹکا شروع ہوا، اچنبھا ہوا، کھڑا ہو گیا، پھر گرنے لگا، ہر گھر، ہر درخت جھومتا ہوا نظر آتا تھا، تھوڑی دور پر ایک مسجد تھی دیکھا کہ اس کے دونوں مینار اس طرح جھوم رہے تھے جیسے کوئی بہت ہی قد آور بھوت جھوم رہا ہے، بس چیخ ہی تو نکل گئی، گرتا پڑتا بھاگتا ہوا گھر آیا تو دیکھا کہ ابا، اماں اور میری بڑی بہن آنگن میں زور زور سے اللہ رحم کر، اللہ رحم کر کہہ رہے ہیں، میں حواس باختہ گم صم وہیں کھڑا ہو گیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کی کھپریل ہمارے اوپر گرا چاہتی ہے، چند ہی جھٹکوں کے بعد خدا خدا کر کے زلزلہ تھما، دل خوف وہراس کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، ہر شخص دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تک رہا ہے جیسے ہوش وحواس سے عاری ہے، وہی منظر تھا جس کو قرآن نے بتایا ہے: إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ لَشَيْءٌ عَظِيْمٌ ، پھر یہ نقشہ کھینچا گیا ہے: وَتَرَى النَّاسَ سُكَارىٰ وَمَاهُمْ بِسُكَارىٰ وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ، جب دل ٹھہرا، لڑکپن کا کھلنڈرا پن جاگا تو باہر نکلا دیکھا کہ ہماری جامع مسجد کا بلند و بالا ایک مینار گر چکا ہے، عید گاہ کا بھی ایک مینار ٹوٹ کر زمیں بوس ہو چکا ہے، اس واقعہ سے میرے دل میں ایسی دہشت بیٹھ گئی کہ کسی کھیل میں دل نہیں لگتا تھا، ایک ہفتہ تک پیشگوئی کرنے والے پیش گوئی کرتے رہے کہ آج فلاں وقت زلزلہ آئے گا، کل فلاں وقت زلزلہ آئے گا، یہ سن کر لوگوں کی روح فنا ہونے لگتی تھی ان پیشگوئیوں کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لوگ گھروں سے نکل کر کھلے میدان میں آجاتے، اللہ اللہ کرتے عورتیں گھروں کے آنگن میں جمع ہو جاتیں لیکن دوبارہ زلزلہ نہیں آیا، اس وقت کا خوفناک ماحول، دہشت زدہ لوگوں کا منظر میں آج تک نہیں بھولا ہوں، یہ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔

دوسرا واقعہ اسی سال ادری میں دیوبندی بریلوی مناظرے کا تھا، میری عمر وہی سات سال کی تھی، مناظرہ کا معنیٰ مطلب کچھ نہیں سمجھتا تھا، بس لوگوں کی زبانی سنا

کرتا تھا لیکن ذہن کے پردے پر سارے واقعات کی تصویریں مرتسم ہیں اور آج بھی وہ منظر نگاہوں میں ہے کیونکہ یہ ساری ہنگامہ آرائیاں میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر ہورہی تھیں، اس مناظرہ کا پس منظر یہ تھا کہ ہمارے گاؤں ادری میں سالانہ ایک جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا، میں کچی عمر کا تھا، معلوم نہیں کس طرح کے علماء بلائے جاتے تھے، جس جلسہ نے دیوبندی بریلوی کا مسئلہ کھڑا کیا اور مناظرہ کی نوبت آئی اور گاؤں میں ہمیشہ کے لئے دوفریق ہوگئے وہ جلسہ ادری کا یادگار جلسہ ہوگیا، مجھے خوب یاد ہے کہ جس صبح کو ہنگامہ کا آغاز ہوا اس دن ہمارے گھر مہمانوں کی بہت بھیڑ تھی کیونکہ ہماری اکثر رشتہ داریاں مئو میں تھیں زیادہ بھیڑ وہیں سے آئی تھی، بچوں کو تو جشن اور تفریح چاہئے، یہ اِزدحام، یہ بھیڑ، ہزاروں ہزار آدمیوں کا یک بیک ایک چھوٹے سے گاؤں آجانا بڑا حیرتناک تھا، ہم لوگ ہر دم چکر لگایا کرتے تھے۔

آبادی کے کنارے جانب شمال ایک تالاب ہے پھر اس کے بعد باغوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے، اب تو وہاں آبادی ہی آبادی ہے، وہی باغ مناظرہ گاہ بنا۔ علماء دیوبند میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی وغیرہ اسٹیج پر تھے، مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلی مناظر تھے، رضا خانیوں کے مناظر مولوی حشمت علی پیلی بھیتی تھے، جو اپنے دور کے سب سے منہ پھٹ مقرر ومناظر کہے جاتے تھے، صدارت کی کُرسی پر ادری کے مولانا عصمت اللہ صاحب تھے جو پٹنہ کے کسی کالج میں پڑھاتے تھے، تین دنوں تک مناظرہ چلتا رہا، باہر سے آنے والوں کے لئے عارضی ہوٹل کھل گئے تھے، بڑے بڑے دیگوں میں شادی بیاہ کی طرح کھانا پکتا تھا، ہم بچوں کے لئے اس کی حیثیت ایک میلے کی تھی، اتنا بڑا مجمع ابھی اس عمر میں کہاں دیکھا تھا اس لئے پورا پورا دن اسی بھیڑ میں گزرتا تھا، چوتھے دن پولیس نے مناظرہ بند کرادیا، ایک

چھوٹا سا گاؤں ادری پھر اپنی محدود آبادی میں سمٹ کر رہ گیا، ہنگامہ فرو ہو گیا البتہ ایک ایسی آگ لگا گیا کہ برسوں باہمی عداوت کے انگارے دہکتے رہے اور ادری کا امن وسکون اس میں جل کر خاکستر ہو گیا، بچپن کے یہی دو واقعات مجھے یاد ہیں۔

مکتبی تعلیم: میری عمر جب پڑھنے کی ہوئی تو میرے سب سے پہلے استاذ میرے والدین ہوئے، انھوں نے مجھے قاعدہ بغدادی عم پارہ اور الم کا پارہ پڑھا دیا، جب میں نے دوسرا پارہ شروع کیا تو ادری کے مدرسہ فیض الغرباء میں مجھے پہونچا دیا گیا، یہ واحد مدرسہ تھا جو ادری کی قدیم جامع مسجد کے مشرقی جانب ایک لمبے سائبان میں تھا، اس سائبان میں شمالی جانب ایک نیم تاریک چھوٹی سی کوٹھری تھی، اسی سائبان اور کوٹھری میں یہ مدرسہ چلتا تھا، بڑے لڑکے مسجد کے صحن میں بیٹھتے تھے اور چھوٹے بچے اسی لمبے سائبان میں دورویہ بیٹھتے تھے، اسوقت مدرسہ کے واحد استاد مولانا محمد زمان خاں شاہ پوری تھے جو اسی سائبان والی کوٹھری میں بیٹھتے تھے، یہ موضع شاہ پور کے رہنے والے تھے اور مشہور مصلح مولانا امام الدین پنجابی کے صاحبزادے تھے جنھوں نے مئو میں مدرسہ مفتاح العلوم قائم کیا تھا جس کو الٰہ داد پورہ سے شاہی کٹرہ میں منتقل کیا گیا اور خوب ترقی کی۔

مدرسہ میں تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ قاعدہ سیپارہ پڑھنے والے بہت سے بچوں کو عربی پڑھنے والے لڑکوں کے سپرد کر دیا جاتا تھا وہی ان کو پڑھاتے تھے اور ان کا سبق سنتے تھے، میں بھی انھیں بچوں میں شامل تھا اور کسی عربی پڑھنے والے لڑکے سے پڑھتا تھا، اس لئے میں سائبان کے بجائے مسجد کے فرش پر بیٹھتا تھا، بقیہ زیادہ تر بچے اسی سائبان میں چیخ چیخ کر سبق یاد کرتے تھے، جب تھک جاتے اور خاموش ہو جاتے اور یہ خاموشی طول پکڑ لیتی تو کوٹھری سے ایک گونج دار آواز بلند ہوتی تھی ''پڑھو، پڑھو'' اگر

پھر شور بلند ہو گیا تب تو غنیمت ہے، لیکن بچوں نے اگر سنی اَن سنی کر دی اور شور بلند نہیں ہوا تو مولوی صاحب بانس کی ایک پتلی لمبی سی چھڑی لے کر کوٹھری سے برآمد جیسے شیر کچھار سے نکلتا ہے، بچے صورت دیکھتے ہی جھوم جھوم کے الف خالی، ب کے نیچے ایک نقطہ، ت کے اوپر دو نقطہ، پڑھنے لگتے، مگر مولوی صاحب کو اُٹھ کر آنے کی زحمت ہوئی اس لئے پہلے لڑکے سے لے کر پوری صف کے آخری لڑکے تک کو پیٹھ پر شڑاک شڑاک ایک ایک چھڑی لگاتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہونچ جاتے تھے، چھوٹے چھوٹے بچے، نازک نازک ہاتھ ہاتھ پاؤں، اس چوٹ پر بل کھا جاتے، ٹیڑھے ہو جاتے، منہ بسورنے لگتے، کچھ سسک سسک کر رونے لگتے، روتے جاتے، سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان پڑھتے بھی جاتے، مکتب میں کسی کی رعایت نہیں ہوتی تھی، سبق یاد ہو یا نہ ہو، جب مولوی صاحب کوٹھری سے برآمد ہو گئے تو ہر لڑکے پر چھڑی پڑنا ضروری تھا، مولوی صاحب کی چھڑی کمسن بچوں کی نرم نرم کھالوں پر لمبی لکیر کی قوس وقزح بنا کر چھوڑ جاتی تھی، اسی لئے بچے مدرسہ کے نام سے کانپتے تھے اور بھاگ بھاگ جاتے تھے، مدرسہ جانے کے نام پر ان کی روح کانپنے لگتی تھی، اس سے زیادہ عبرتناک منظر وہ ہوتا تھا جب مولوی صاحب کبھی کبھی کسی لڑکے کی لمبی غیر حاضری پر چند لڑکوں کو اس کی گرفتاری کے لئے بھیجتے تھے اگر وہ لڑکا مل گیا تو سارے لڑکے مل کر اس کو پکڑتے، کسی نے اس کا ایک ہاتھ، کسی نے دوسرا ہاتھ، دو چار لڑکوں نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لئے، اب آٹھ دس لڑکوں کے ہاتھوں میں جھولتا ہوا لڑکا چیخ رہا ہے، چلا رہا ہے، مغلظ گالیاں بک رہا ہے، پکڑنے والے قہقہہ لگا رہے ہیں، جب شبخون مار کر یہ لڑکے جنگی قیدی کی طرح اس لڑکے کو لے کر مدرسہ آتے تو مولوی صاحب کی ناگن کی طرح لپلپاتی ہوئی چھڑی دری کے نیچے سے برآمد ہوتی اور

شٹا شٹ اس کی پیٹھ پر پڑنے لگتی جیسے جلاد مجرم پر کوڑے برسا رہا ہے، یہ چھڑی بچے کی نرم ونازک پشت پر درجنوں قوس وقزح بنا کر رکتی تھی، انھیں مناظر کو دیکھ کر چھوٹے بچے مدرسہ جانے کو جانور کے مذبح جانے سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

مدرسہ ٹوٹ گیا........................

میں فیض الغرباء میں قرآن ختم کرلیا اور کچھ اردو کی کتابیں بھی پڑھ لیں کہ اسی دوران دیوبندی بریلی مناظرہ کی آویزش اور شدید اختلاف کی وجہ سے مدرسہ ٹوٹ گیا، جس جامع مسجد میں مدرسہ تھا وہی پورے گاؤں کی واحد جامع مسجد تھی، مناظرہ کے بعد جو جمعہ آیا تو امامت کا سوال اٹھ کھڑا ہوا، امام دیوبندی ہو یا رضا خانی؟ اس مسئلہ کو لے کر مسجد میں ہنگامہ ہوگیا، شور وشغب، گالم گلوج اور ہاتھا پائی کی نوبت آگئی، اس وقت گاؤں کا مکھیا ایک ریٹائرڈ کانسٹبل رسول خاں تھا، وہ شخص بڑا زمانہ ساز تھا اور بڑا ہی چالباز، اس نے ایک نفسیاتی حربہ چلایا، دیوبندی جماعت کے ایک معزز آدمی حاجی ہدایت سے کہا کہ حاجی صاحب یہ خبیث نہ نماز پڑھیں گے نہ پڑھنے دیں گے اور ہماری نماز کا وقت نکل جائے گا، چلئے ہم لوگ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھ لیں پھر یہاں کی امامت کا فیصلہ ہوتا رہے گا، یہ سیدھے سادے بھولے بھالے اس داؤ کو سمجھ نہ سکے، رسول خاں کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئے، دیوبندی جماعت کے لوگوں نے جب ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو وہ لوگ بھی حاجی صاحب کے ساتھ مسجد سے نکل آئے، رسول خاں دیوبندی جماعت کو لے کر گاؤں کے ایک دم مشرقی کنارے کی ایک مسجد میں لے آیا اور یہاں اذان اور نماز کی تیاری ہونے لگی، رسول خاں نے جب دیکھا کہ تمام دیوبندی جماعت کے لوگ مسجد میں پہونچ گئے تو وہ چپکے سے کھسک گیا اور قدیم جامع مسجد میں چلا گیا اور بریلویوں سے کہا کہ اب جس کو چاہو

امام بناؤاورنماز پڑھومیں وہابیوں کو کھدیڑ آیا، پھر بریلوی امام نے جمعہ کی نماز پڑھائی، اس طرح قدیم جامع مسجد پر رضاخانیوں کا ہمیشہ کے لئے قبضہ ہوگیا، دوبارہ دیوبندیوں کو جامع مسجد میں جانے کی نوبت نہیں آئی، اسی جمعہ کی شام کو ایک اور حادثہ ہوگیا، جامع مسجد میں ایک شخص نے عشا کی اذان دیدی جو دیوبندی تھا، ابھی وہ اذان دے ہی رہا تھا کہ رضاخانی جماعت کے کچھ افراد آگئے اوراس کی پٹائی شروع کردی، جب اس کی خبر دیوبندی جماعت کے لوگوں تک پہونچی تو لوگ مؤذن کی مدد کے لئے جامع مسجد چلے، اب جتنے دیوبندی جامع مسجد کی طرف چلے تو رضاخانی پہلے سے اپنی اپنی دالانوں میں گھات لگائے بیٹھے تھے، ان کے گھر کے سامنے جو دیوبندی پہونچا اس کو چار لاٹھی ماری اور گھر میں گھس گئے، حافظ نعت اللہ، حاجی ہدایت، حاجی علیم اللہ اور بہتوں کے سر ٹوٹے، چوٹیں آئیں لیکن کوئی تھانے رپورٹ کرنے نہیں گیا، رضاخانی جماعت کا رسول خاں گاؤں کا مکھیا بھی تھا اور تھانے میں ہیڈ محرر بھی رہ چکا تھا، وہ تھانے گیا اور ایف، آئی، آر لکھوادی، دوسرے دن پولیس آگئی اور یکطرفہ دیوبندیوں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں، یہ مقدمہ بہت دنوں تک چلتا رہا لیکن سزا کسی کونہیں ہوئی البتہ ذہنی پریشانی بہت رہی۔ انھیں حالات کے پیش نظر والد صاحب مرحوم نے اَدری کی سکونت ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اندارار ریلوے اسٹیشن کے شمالی جانب ۲۸ ربیگھہ زمین کا ایک پلاٹ رانی دھن دیوی جونپور سے خریدلیا، لیکن مکانات کی تعمیر ابھی شروع نہیں کی گئی تھی کہ کچھ دنوں کے بعد حالات میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تو ارادہ بدل گیا، پھر کئی سالوں کے بعد دس بارہ مکانات کی ایک ساتھ بنیاد ڈالی گئی اور ایک پختہ مسجد والد صاحب نے بڑی جدوجہد کے بعد تعمیر کرائی اور کچھ لوگوں نے وہاں سکونت اختیار کرلی، والد صاحب کے نام پر اس گاؤں کو ''کریم آباد'' کہا جانے لگا۔

اس ہنگامہ میں مدرسہ فیض الغرباء ٹوٹ گیا، والد صاحب کے ایک دوست مولوی محمد تقی صاحب مرحوم تھے، پڑھے لکھے تو واجبی ہی سے تھے، البتہ وضع قطع مولویانہ تھی، خوشحال تھے، ۴۰ ربیگھہ زمین کے مالک تھے، ہمیشہ سفید پوش رہتے، تہبند، کرتا، ٹوپی رومال سب سفید براق پہنتے تھے، کچھ طبابت بھی کرتے تھے، شاید شرح جامی وغیرہ تک پڑھے ہوئے تھے، ہمارے مکان سے دوتین مکانوں کے بعد ان کا مکان تھا، گھر کے باہری حصہ میں سائبان تھا، والد صاحب نے ان سے میری تعلیم کے بارے میں گفتگو کی تو انھوں نے رضامندی کا اظہار کیا، میرے ساتھ دس پندرہ لڑکے اور بھی اس سائبان میں پڑھنے کے لئے آ گئے، انھوں نے کیا پڑھایا کیا لکھایا، مجھے کچھ یاد نہیں، لیکن جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو والد صاحب نے مجھے مفتاح العلوم مئو میں لے جا کر داخل کر دیا، چونکہ میرا ننیہال مئو میں تھا اس لئے والد صاحب سے بہت سے لوگ واقف تھے، محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے والد صاحب کے مراسم تھے، مجھے ان کے سپرد کر دیا لیکن میرا قیام مدرسہ کے بجائے ننیہال میں تھا اس لئے شہر کے لڑکوں کی طرح میں صرف تعلیم کے اوقات میں مدرسہ جاتا تھا اور پھر گھر آ جاتا تھا، میری فارسی اور عربی تعلیم یہاں چلتی رہی۔

مفتاح العلوم شاہی کٹرہ........................

میرا داخلہ مفتاح العلوم مئو میں جس زمانے میں ہوا تو مدرسہ کے نام سے وہاں کوئی عمارت نہیں تھی، پوری مسجد میں درسگاہیں پھیلی ہوئی تھیں، صحن مسجد میں نیم کے بہت سے درخت تھے، ہر درخت کی جڑ میں ایک مدرس کی دری بچھی ہوئی ہے، دو ایک تپائیاں رکھی ہوئی ہیں، بعض مدرسین مسجد کے سائبان میں درس دیتے تھے، ایک نیم کے درخت کے نیچے ہمارے فارسی کے استاذ منشی ظہیر الحق صاحب نشاؔط سیمابی

بیٹھتے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ فارسی بہت اچھی جانتے ہیں۔ صاف ستھرا رنگ، چوڑی پیشانی، گول چھوٹی داڑھی، مونچھوں کے دنبالے لمبے، علی گڈھ پاجامہ، کف دار قمیص، گاندھی کیپ ڈینگی نما، آگے پیچھے کی نوک خوب نکلی ہوئی، وہ ہر دم گنگناتے رہتے، شاعری کرتے تھے، اردو میں بھی اور فارسی میں بھی، وہ اپنے کو سیماب اکبرآبادی کا شاگرد کہتے تھے، اسی نسبت سے وہ اپنے کو نشاط سیمابی کہتے تھے، کسی رسالہ یا اخبار میں میں نے ان کی نظم یا غزل کبھی چھپی ہوئی نہیں دیکھی اور سچی بات تو یہ تھی کہ ابھی مجھ میں شعر وشاعری سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی، نہ اخبار اور رسالہ پڑھتا تھا، وہ ہم لوگوں کے بڑے شفیق استاد تھے، ہماری جماعت کو بڑی محبت وشفقت اور بڑے ذوق وشوق سے جھوم جھوم کر پڑھاتے تھے، ان سے ہم نے اخلاق محسنی، یوسف زلیخا، سکندر نامہ اور انوارِ سہیلی پڑھی۔

دوسری نیم کے درخت کے نیچے میرے دوسرے انتہائی شفیق استاد مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم کی دری بچھتی تھی، ان کو تمام بڑے اساتذہ صوفی جی کہتے تھے، لفاظ بالکل نہیں تھے، کم سخن، کم آمیز تھے، چہرے پر گہری فکرمندی کا احساس ہوتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اندر اندر کوئی غم ان کو کھائے جا رہا ہے، جب وہ چلتے تھے تو ان کے جسم کا کوئی عضو حرکت نہیں کرتا تھا صرف پاؤں آگے پیچھے اُٹھ رہے ہوتے، درس میں وہ طلبہ سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے، فضول باتوں کا کوئی سوال ہی نہیں، میں نے ان سے بہت مار کھائی ہے مگر یہ مار لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں نہیں صرف شرارتوں پر مار کھائی ہے، ہم لوگ کوئی شرارت کرتے تو وہ پہلے کھک کھک کرتے یہ ان کی ہنسی تھی اور ہماری سزا کا الارم، پھر کان کھینچ کر پیٹھ پر دھپ دو ہاتھ جما دیتے اور ہنستے رہتے، ہم لوگ بھی کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ جاتے تھے، وہ قاعدہ سیپارہ اور اردو کی چھوٹی چھوٹی

کتابیں بیچتے تھے، جب کچھ کام بڑھا تو کتابیں زیادہ منگانے لگے اور اپنے مکتبہ کا نام ''کتب خانہ دینیہ'' رکھا، بعد میں اس کتب خانے نے بڑی ترقی کی اور مولوی صاحب بہت خوشحال اور مالدار ہوگئے، یہ ہمارے ناقابل فراموش اساتذہ میں تھے، ہم نے ان سے **القرأة الرشیدة** تینوں حصے، **دروس الادب** کے بعد پڑھے تھے جو کسی مصری مصنف کی تصنیف تھی، اس وقت مفتاح العلوم کے نصاب میں شامل تھی، مولوی صاحب نے ہم لوگوں میں ایسا ذوق پیدا کر دیا تھا کہ جن لفظوں کے ہم معنی تک نہیں جانتے تھے ان کے بارے میں پوچھتے تھے کہ اس کی کیا جمع ہو سکتی ہے؟ ہم لوگ اجتہاد کرتے اور فوراً بول پڑتے تھے اور بسا اوقات وہ صحیح ہوتا تھا، مجھے یاد ہے کہ ایک لفظ **شباک** آیا، معنی ابھی معلوم نہیں تھا انھوں نے پوچھا کہ اس کی جمع کیا بناؤ گے؟ میں نے جھٹ کہہ دیا **شبابیک**، بہت خوش ہوئے، بہت دعائیں دیں، میں نے انھیں سے میزان منشعب، نحو میر، پنج گنج، فصول اکبری او علم الصیغہ وغیرہ پڑھیں، غالباً کافیہ بھی ان ہی سے پڑھی۔

میرے تیسرے استاذ مولانا عبد اللطیف صاحب نعمانی تھے، مسجد کے سائبان میں ایک دم شمالی جانب کی دیوار کے پاس ان کی دری بچھتی تھی، وہ ہنس مکھ، دلچسپ جملہ چست کرنے والے تھے، متوسط القامت گٹھا ہوا کسرتی بدن، جب چلتے تھے تو خوب تن کر چلتے تھے جیسے کوئی بہت طاقتور آدمی چلتا ہے، ان کے سامنے سے دوسروں کو گزرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، ان کی رفتار و گفتار، لب و لہجہ ہر بات سے بے پناہ خود اعتمادی، جرأت اور مرعوب کن بیبا کی کا اظہار ہوتا تھا۔ بنوٹ کے ماہر، ورزشی بدن، پتلی موری کا پاجامہ، لمبا سفید کرتا، دو پلی گاڑھے کی ٹوپی، جب وہ مدرسہ میں داخل ہوتے تو طلبہ کی روح ان کو دیکھ کر کانپ جاتی تھی جبکہ وہ بہت سخت گیر نہیں

تھے اور نہ بات بات پر سزا دیتے تھے بس ان کی شخصیت کا رعب تھا، وہ منطق وفلسفہ کے امام کہے جاتے تھے، ہم نے ''شرح تہذیب'' ان سے پڑھی اتنا تو یاد ہے، اس کے علاوہ کئی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن اچھی طرح یاد نہیں، ہماری جماعت میں صغیر احمد نام کا ایک لڑکا تھا جیم شحیم، خوب موٹا تازہ فربہ اندام، پوری جماعت میں تنہا وہی لڑکا داڑھی والا تھا، رنگ آبنوسی تھا، صبح کا وقت ہم لوگ کتاب لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہمارے بیٹھتے ہی صغیر احمد سے کہا، تم پڑھو، مولانا نے جب خود کبھی کسی سے عبارت پڑھنے کے لئے کہہ دیا تو سمجھ لو کہ اس کی خیر نہیں، پہلے ہی مرحلہ میں طالبعلم کی روح تھرا جاتی تھی اور بدحواسی میں غلط سلط پڑھنے لگتا تھا، جب صغیر احمد سے پڑھنے کے لئے کہا تو اس کی روح تو پہلے ہی کانپ گئی، اس نے عبارت شروع کی اعراب غلط پڑھا، مولانا نے ''ہوں'' اتنی زور سے کہا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ کر رہ گیا، پھر غلطی پر غلطی، اگر صحیح بھی پڑھ رہا ہوتا تو سوال ہوتا کہ اس کی وجہ بتاؤ، دو چار لفظوں کی اَدلا بدلی کے بعد اپنی موٹی چھڑی جو ہر جگہ آپ کے ساتھ رہتی تھی نہ جانے کس لکڑی کی تھی، اٹھائی اور اس کی پیٹھ پر بھد سے اتنی زور سے ماری کہ وہ دو ٹکڑے ہوگئی، آدھی چھڑی مولانا کے ہاتھ میں رہ گئی آدھی دور جا کر گری، پوری جماعت پر کپکپی طاری ہوگئی، معلوم ہوتا تھا کہ میدان حشر میں کھڑے ہیں اور ہر طرف عذاب کے فرشتے گرز ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں نہ جانے کب وار کردیں۔

منطق وفلسفہ کے درس میں کمال حاصل تھا، طریقہ یہ تھا کہ طالب علم نے عبارت خوانی کی آپ نے گردن اٹھائی اور پوری بحث بالترتیب نہایت سہل انداز میں بیان فرمادی، دورانِ تقریر کبھی کتاب کے صفحات پر نظر نہیں ڈالتے تھے، پوری بحث زبانی سمجھا لینے کے بعد عبارت سے طلبہ کو مطابقت بتادیتے تھے۔

بہت حاضر دماغ ، بے انتہا ذہین ، ہر بات کا تڑ سے جواب دینے والے ، مخالف کوئی بات کہہ کر گذر جائے یہ ممکن ہی نہیں تھا ، وہ مذہبی مسائل میں اختلافات کی بات ہو یا ملکی سیاست یا شہر کے مسائل ، رضاخانیوں اور غیر مقلدوں کی رَد میں جب تقریر کرتے تھے تو ایک منہ زور سیلاب کی طرح الفاظ کے آبشار جاری ہوجاتے ، آواز میں ایک طرح کا کرارا پن تھا ، لب ولہجہ مرعوب کن تھا ، مخالفین ان کی صورت سے گھبراتے تھے ، جس مجلس میں ہوتے دوسرے بڑی احتیاط سے ناپ تول کر بات کرتے ، کیونکہ ذرا زبان پھسلی کہ دو جملوں میں زبان کتر لی گئی ، ان کی اس جرأت وہمت اور بیباک گفتاری کا ہم سب طلبہ پر اثر تھا کہ ہم کو مخالفین سے ٹکرانے اور بھڑ جانے کے لئے شہ دیا کرتے تھے ، یہ ہمارے تیسرے استاذ تھے ، زندگی بھران کی شفقتیں اورعنایتیں مجھ کو حاصل رہیں اور خود میں بھی ان کا ہمیشہ معتمد علیہ بنا رہا۔

فراغت کے بعد بھی اکثر مسئلوں میں وہ میری راہ نمائی فرماتے رہے ، ان کا مشورہ بہت صحیح ہوتا تھا ، ایک بار ادری میں ہندو مسلم دنگا ہوگیا ، مسلمان نوجوانوں نے دس بارہ ہندوؤں کو مار کر بچھا دیا ، ضلع کو ٹیلیفون ہوگیا ، فورس آگئی ، ڈپٹی نے تھانیدار کو حکم دیا کہ پچاس مسلمان نوجوانوں کو باندھ کر بھیج دو ، بڑی سراسیمگی پھیل گئی ، فسادات کا وہ دور ہی تھا ، افسران متعصب تھے ، مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں تھی ، بدحواسی میں ہم لوگ بھاگے کہ اعظم گڈھ جا کر ایس پی سے بات کریں اور مئو مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کی قیادت میں وفد جائے ، اتفاق سے مولانا مبارکپور گئے ہوئے تھے ، ہم لوگ بس سے مبارکپور کے لئے چلے ، محمد آباد میں مولانا سے ملاقات ہوگئی ، فرمایا کہاں؟ ہم نے مختصر لفظوں میں صورت حال بتائی اور کہا کہ ایس پی آج کل ایک سکھ ہے ، ہوسکتا ہے کہ وہ ہندوؤں کی جانبداری نہ کرے ، انھوں نے فرمایا بالکل نہیں ، تم

لوگ یہیں سے واپس چلو اور سیدھے کو پا گنج تھانے چلے جاؤ اور تھانیدار سے بات کرو جو مانگے وہ دیدو اور اس کو خرید لو، انھوں نے وضاحت کی کہ ایس پی سے ہم بات کریں گے تو وہ تھانیدار سے رپورٹ طلب کرے گا جیسا وہ لکھے گا ایس پی وہی کرے گا، اگر تھانیدار تمہارا مخالف ہے تو تمہارے خلاف رپورٹ دے گا اور نتیجہ خراب نکلے گا، بات ہماری سمجھ میں آ گئی، ہم دو آدمی تھانیدار سے ملے، معاملہ طے ہو گیا، ہم نے کہا کہ کل آپ ادری آ جائیں ہم رقم پیش کر دیں گے، وہ حسب وعدہ آیا ہم تین آدمیوں نے تنہائی میں دو ہزار کی رقم اس کی جیب میں ڈال دی، اس نے کہا آپ لوگ بالکل مطمئن رہیں، اب کچھ نہیں ہوگا، نہ کوئی گرفتاری ہوگی البتہ میرے سامنے ہرگز نہ آئیں، اپنے گھروں میں رہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا، ڈپٹی کے پاس سے ریمانڈر پر ریمانڈر آ رہا ہے، تھانیدار لکھ رہا ہے کہ ملزمان فرار ہیں، اس نے ایک مسلمان کو بھی گرفتار نہیں کیا، ہم نے اس سے کہا کہ دس بارہ ہندو مجروحین اسپتال میں ہیں، ان کے داخلہ کو ۱۵/دن ہو گئے تو یہ پولیس کیس بن جائے گا، مجروحین کو ہسپتال سے نکلوانا آپ کی ذمہ داری ہے، اس نے دوسرے دن اسپتال جا کر مجروحین کو دھمکایا اور گالی دے کر کہا کہ سالے گھر چلو اور وہاں معاملہ کی گفتگو کرو ورنہ انجام بھگتنے کے لئے تیار رہو اور پھر ڈاکٹر سے مل کر ان کو اسپتال سے نکلوا دیا، پھر تین چار دنوں کے بعد اس نے ہندو مسلمانوں کی میٹنگ بلائی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ صلح کر لیں، ایک جگہ رہ کر لڑنا جھگڑنا اچھا نہیں اور اگر آپ لوگ صلح نہیں کرتے تو اس کا علاج میں خود کروں گا، تمام سرغنوں کو باندھ کر بھیج دوں گا، مسلمان تو صلح چاہتے ہی تھے، ہندوؤں کو سردی گرمی دکھا کر صلحنامہ پر دستخط کرا لیا اور معاملہ کو دفن کر دیا، مسلمانوں کا بال بیکا نہیں، یہ سب مولانا نعمانی کے صحیح مشورے کی وجہ سے ہوا، اس طرح اکثر معاملات و مسائل

میں وہ ہماری رہنمائی فرماتے تھے اور زندگی کے اخیر لمحات تک ہم ان سے مشورے لیتے رہے، وہ جس دن اس دنیا سے گئے، میں ان دنوں لکھنؤ میں قیام پذیر تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آج یتیم ہو گیا۔

مفتاح العلوم کے میرے چوتھے استاد بلکہ سرپرست حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی تھے، جو مفتاح العلوم کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے، بڑے جاہ وجلال کے بزرگ تھے، اتنا عظیم المرتبت ومحقق مگر ان کی درسگاہ ایک عبرت کدہ تھی، شاہی مسجد کی مشرقی دیوار سے متصل کسی کا خام سفالہ پوش اور خستہ سا مکان تھا انھیں دنوں خریدا گیا تھا، کھپریل بہت نیچی اس کا ہر کمرہ اندھیرا اندھیرا سا تھا، دیواروں پر سیل اوپر تک چڑھی ہوئی برسات کے زمانے میں اس کی چھت چھلنی بن جاتی تھی اور ہر طرف ٹپکنے لگتی تھی، اسی خستہ مکان کے باہری کمرے میں آپ کی درسگاہ تھی، آپ کا رنگ گہرا سانولا تھا، بھرا بھرا بدن، سر پر پٹہ بال، سنہری کمانی کا چشمہ، دوپلی ٹوپی، جاڑوں میں موٹے اونی کپڑے کی شیروانی زیب تن ہوتی تھی، ہاتھوں میں نازک سی چھڑی ہمیشہ رہتی تھی جاہ وجلال اور رعب داب کا عالم یہ تھا کہ ان کی جھلک دیکھ لینے کے بعد کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے سامنے سے گزر جائے، طلبہ تو طلبہ اساتذہ بھی ان کے سامنے مؤدب رہتے تھے، صرف مولانا عبد اللطیف نعمانی ان سے قدرے بے تکلف تھے مگر احترام وہ بھی کرتے تھے، اس سال دورے میں نو دس طلبہ تھے ان کے بیشتر اسباق آپ کے ذمہ تھے، ان کی شفقت وعنایت ہم پر ایسی تھی کہ جس کو بچپن کی عمر اپنے لئے مصیبت تصور کرتی تھی، وہ کبھی کبھی جمعرات کو سب میں مغرب بعد گھر سے مدرسہ تشریف لاتے، ان کی درسگاہ کے سامنے چارپائی بچھا دی جاتی، بستر اور تکیہ لگا دیا جاتا، آپ اس پر لیٹ جاتے، چند طلبہ حاضر ہو جاتے، کوئی سر میں تیل کی مالش

کرتا، کوئی پیر دابتا اور کوئی ہاتھ، ٹھیک اسی کیفیت میں حکم ہوتا کہ ادری کے تینوں لڑکوں کو بلالاؤ، ہم تین لڑکے اس وقت مفتاح العلوم میں زیر تعلیم تھے، تینوں ایک جماعت میں تھے، ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھتے تھے، اگر ہم مل گئے تو چارپائی کے پاس کھڑے ہوجاتے اور ہم لوگوں کا امتحان شروع ہوجاتا، القرأۃ الرشیدہ کے الفاظ کے معنی، مصدر، اردو کے عربی الفاظ، واحد کی جمع اور جمع کا واحد، لفظ، باب، مصدر، مادہ یعنی علم ادب کے سوالات ہوتے، ہم تینوں مجرم کی طرح کھڑے ہوئے جواب دیتے، اگر کہیں چوک ہوگئی یا ذرا دیر کے لئے خاموش ہوگئے تو حکم ہوتا قریب آؤ، یہاں قربت بمعنی پھانسی کے تختے پر چڑھنا تھا، کان پکڑا، جہاں ذرا سا جھکے کہ ایک چانٹا تڑاق سے لگ جاتا اس کے بعد جب تک کھڑے رہتے، ہر لمحہ سزا کا خوف طاری رہتا تھا، ہمارا تیسرا ساتھی زیادہ تر سزا کا سزاوار ہوتا اور جب ڈانٹ کر بھگائے جاتے تو بعد میں خدمتگار طلبہ سے فرماتے بڑے ذہین لڑکے ہیں آئندہ بڑے کام کے ہوں گے۔

مفتاح العلوم کی چوتھی شخصیت ناظم صاحب کی تھی، یہی عرفی نام ہر زبان پر تھا، آپ مولانا محمد ایوب صاحب صاحب اعظمی ناظم مدرسہ مفتاح العلوم تھے، بہت اچھے مقرر، بہت اچھے واعظ، عرصۂ دراز تک مفتاح العلوم کے ناظم رہے، بعد میں بیسیوں سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث رہے اور نہایت محترم رہے۔ ان کی دری شاہی مسجد کی سب سے بلند محراب میں بچھتی تھی، اسی دری پر ایک طرف موٹی آبنوسی مولویانہ چھڑی، پان کی ڈبیہ، تمباکو اور سپاری کا بٹوا پڑا رہتا تھا، بائیں طرف ایک اگالدان، بڑے وجیہ اور شکیل بزرگ تھے، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں پر چشمہ، گول لمبی داڑھی، مونچھ کے دنبالے خوب بڑے، لباس بہت صاف ستھرا، پریس کیا ہوا، سفید باریک کپڑے کا بہت لمبا بغیر چاک کا کرتا، پاجامہ پنڈلیوں پر چپکا ہوا بہت تنگ

موری کا، ٹوپی گول دفتی والی ہلکے زعفرانی رنگ کی اس پر باریک کشیدہ کاری جو گجراتی سیٹھ یا میمن خوجہ پہنتے ہیں، ایسی ٹوپی پورے مئو میں دو تین آدمی ہی پہنتے تھے جن میں ایک ہمارے ناظم صاحب بھی تھے، ہاتھوں میں آبنوسی مولویانہ چھڑی ہمہ وقت ساتھ رہتی، چھڑی پر سہارا دے کر دائیں بائیں ذرا جھوم کر چلتے تھے، پان کثرت سے استعمال کرتے تھے، یہ تینوں اکابر روزانہ کچھ دیر کیلئے اسی بیچ والی محراب میں بچھی ہوئی دری پر جمع ہوتے اور تبادلۂ خیال کرتے۔

مدرسہ کی عمارت........................

مدرسہ کی اپنی عمارت کچھ نہیں تھی، جنوبی جانب شاہجہانی عہد میں مسجد کی تین سمتوں میں گچ کے چھوٹے چھوٹے محدب کمرے ہوتے تھے جن میں چار فٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا، ان میں نہ دروازہ نہ کواڑ، وہی قطار جنوبی سمت میں مسجد سے متصل ہوکر گذرتی تھی، صحن مسجد کے جنوبی کنارے دورویہ آٹھ دس بھدے، بے ڈیل ڈول کے بھاری بھرکم گھروندوں کی قطار تھی، یہی بھدے گھروندے دارالمطالعہ، دارالاقامہ یا ہوسٹل تھے، باہر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ ان میں جانور باندھے جاتے ہوں گے، پورے مدرسہ میں درسگاہ نام کی کوئی عمارت نہیں تھی، چار بجے شام کو جب چھٹی ہوتی تو تمام دریاں، تپائیاں سمیٹ کر مسجد کے مشرقی کنارے پر بنے سائبان میں انبار کردی جاتیں، دوسرے دن صبح کو وہی جھاڑ پونچھ کر اپنی اپنی جگہوں پر بچھادی جاتی تھیں، جب میری تعلیم کا یہاں چوتھا سال شروع ہوا تو میں نانیہال کے بجائے مدرسہ میں رہنے لگا تھا، اسی سال مسجد کی مشرقی جانب والا خستہ مکان خریدا گیا تھا، اس میں تین چار کمرے تھے، ایک میں مطبخ تھا جس میں ایک موٹی بھاری بھرکم بوڑھی عورت کھانا پکاتی تھی، سارے طلبہ اس کو اماں کہتے تھے، اسی مطبخ کے بالمقابل ایک بوسیدہ سا کمرہ

تھا جس میں ادری کے تین، کوپا گنج کے دو اور بہادر گنج کا ایک لڑکا، یہ سب رہتے تھے، اس کمرے میں فارغ اوقات میں طلبہ کا شوق لکھنوی پلہ ٹوپی بنانے کا تھا، جہاں چھٹی ہوئی کمرے میں آئے کتابیں ایک طرف رکھیں اور سوئی دھاگہ اور چھپا ہوا کپڑا گھٹنوں پر رکھ کر کڑھائی شروع ہوجاتی تھی، میں نے بھی شاید ایک دو ٹوپیاں بنائی تھیں اور پہنی تھیں، اسوقت اس طرح کی ٹوپیوں کا رواج تھا۔

مفتاح العلوم سے فرار.........................

مجھے مفتاح العلوم میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے چار سال ہو چکے تھے اور میں شرح جامی وغیرہ پڑھ رہا تھا، ایک دن ہم تینوں ادری والے لڑکوں کے ذہن میں شیطان نے یہ بات ڈالی کہ یہاں سے بھاگ چلو، تینوں متفق ہوگئے، مدرسہ میں ایک منشی جی غازیپور کے مدرس تھے، ان سے دل کی بات کہہ دی انھوں نے مشورہ دیا کہ غازیپور میں ایک مدرسہ ہے وہاں چلے جاؤ، بس ایک دن چھوٹے چھوٹے بستر لئے اور فجر کے وقت نکل پڑے، ان دنوں غازی پور کے لئے لاریاں چلا کرتی تھیں، بیس پچیس پیسے کرایہ دے کر غازی پور پہونچ گئے جس مدرسہ میں ہم پہونچے اس کا نام ''چشمۂ رحمت'' تھا جس کا شمار قدیم مدارس میں تھا، ایک زمانہ میں اس کی تعلیم مشہور تھی، غالباً سرسید کے دور میں یہ مدرسہ قائم کیا گیا تھا اور اس کو حکومت سے امداد بھی ملتی تھی، اس کا نصابِ تعلیم عام مدارس کے نصاب سے قدرے مختلف تھا، وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ کل سے مدرسہ میں گرمیوں کی چھٹی ہورہی ہے اور مدرسہ دو ہفتہ کے لئے بند ہوجائے گا، پھر داخلہ کا کیا سوال؟ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن

غازی پور سے جون پور.........................

ہم تین ہم سفروں میں دو تین روپئے کا بینک بیلنس تھا، غازی پور پہونچتے

پہونچتے یہ بینک دیوالیہ ہو چکا تھا، اس لئے نہ ٹرین سے جاسکتے نہ بس سے ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' گھر واپس ہونے کو غیرت قبول نہیں کرتی تھی، رات میں تہیہ کیا گیا کہ علی الصباح پیدل جونپور کے لئے قافلہ چلے گا، راستہ کے لئے ریلوے لائن کو منتخب کیا گیا، چھوٹے چھوٹے بستر سر پر رکھے تین نوعمر لڑکے جن کی عمریں تیرہ تیرہ سال کی تھی چل پڑے، دن بھر بھوکے پیاسے چلتے رہے، شام ہوتے ہوتے ہم سید پور پہونچے، مغرب سے کچھ پہلے ایک مسجد میں اُترے، پیسے پاس نہ تھے، کھانے کی کوئی سبیل نہیں تھی، صبح سے ایک گھونٹ پانی حلق کے نیچے نہیں اُترا تھا، آنتیں بھوک کی شدت سے اینٹھ رہی تھیں، تکان سے نڈھال تھے، خیال تھا کہ مغرب کی نماز کے بعد اعلان کر دیا جائے گا کہ ہم مسافر ہیں، شاید کھانے کا کوئی نظم ہو جائے، مغرب کی نماز پڑھی گئی لیکن غیرت وخودداری نے زبان پکڑ لی اور ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکل سکا ہم تینوں ایک دوسرے کا منہ حسرت سے دیکھ کر رہ گئے، بستر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے، محلّہ کے لوگ نماز پڑھ کر جا چکے تھے، ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں، بھوک کی شدت سے آپس میں گفتگو کا بھی یارا نہیں تھا، سوچ لیا کہ اب پوری رات پیٹ پر پتھر باندھ کر گذارنی ہے کہ عشا کی اذان ہوگئی، نماز پڑھی گئی، پھر ارادہ ہوا کہ نماز بعد اپنی مسافرت کا اظہار کر دیا جائے لیکن بھوک نے ہم تینوں کو جتنا کمزور کر دیا تھا غیرت اس کے مقابلہ میں بڑی طاقتور نکلی اور ہماری راہ میں پھر حائل ہوگئی، زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا، لوگ نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، اب مایوسی نیم غشی بن کر ہمارے وجود پر چھا گئی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک صاحب جن کا نام غالباً ڈاکٹر عثمان تھا ایک بڑی سی سینی میں کھانا لیکر حاضر ہوئے، انھوں نے بڑی شفقت سے کہا کہ تم لوگوں کو پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا، اب جلدی اٹھو اور کھانا کھالو، یہ نعمت غیر مترقبہ تھی ہم

تینوں نے شکم سیر ہوکر کھانا کھایا، وہ برتن لینے آئے تو ہم لوگوں سے مقصد سفر پوچھا تو ہم نے بتادیا کہ ہم لوگ جونپور پڑھنے جارہے ہیں، انھوں نے جیب سے ڈیڑھ روپۓ نکال کر دیئے اور کہا کہ اپنے پاس رکھ لو، راستہ میں کام آئے گا، ہم نے جھجھکتے ہوئے پیسے لے لئے، انھوں نے دیکھا کہ یہ تین نوعمر بچے گورے چٹے، شریفانہ لباس میں یقیناً اچھے گھرانوں کے ہوں گے، صورت سے نجابت وشرافت ٹپکتی ہے، ہوسکتا ہے ان پر کوئی اُفتاد پڑگئی ہو، ان کا دل بھرآیا اور بڑی محبت سے کہا کہ دیکھو کراکت میں فلاں وکیل صاحب کے گھر چلے جانا، وہیں رات میں قیام کرنا، یہ مشورہ دیا اور برتن لے کر چلے گئے، جب کھانا کھا چکے تو نیند آنے لگی، تھکے ماندے تھے ہی بے خبر سو گئے لیکن فجر سے پہلے آنکھ کھل گئی، طے ہوا کہ ابھی نکل چلیں، گرمیوں کے دن تھے غالباً مئی کا مہینہ تھا، پھر وہی ریلوے لائن اور تین ننھے مسافروں کا علمی سفر شروع ہوگیا، عصر کے وقت کراکت پہونچے، وکیل صاحب کا مکان سرراہ ہی تھا، کچھ اونچائی پر ان کا مکان تھا، مکان کے باہر چھپر پڑے ہوئے تھے، اس میں پلنگ اور چارپائیاں پڑی تھیں، غالباً یہ چوپال تھی اور شام کو لوگ یہاں بیٹھا کرتے تھے، وکیل صاحب سے ہم نے اپنی مختصر داستان سنادی، بڑی محبت سے پیش آئے، رات میں مہمانوں کی طرح کھانا کھلایا اور بچھے ہوئے پلنگوں پر آرام کرنے کے لئے کہا اور جیب سے بارہ آنے نکال کر دیئے کہ اس کو جیب میں رکھ لو صبح راستہ میں ناشتہ کرلینا۔

شیرازِ ہند جون پور میں:..........................

کراکت سے ہم لوگ فجر سے پہلے نکل پڑے اور صوفی پور میں ناشتہ بھی کرلیا کیونکہ جیب میں پیسے موجود تھے، اس طرح پاپیادہ چل کر تین دنوں میں ہم لوگ شہر جونپور میں داخل ہوئے، پوچھنے پر لوگوں نے بڑی مسجد کا پتہ بتادیا، ہم لوگ

سیدھے بڑی مسجد پہونچ گئے ، بڑی شاندار مسجد تھی اس کے صدر گیٹ اور بیچ کی محراب کی عظمت دیکھ کر ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے ، اس چھوٹی سی عمر میں ایسی مسجد کہاں دیکھی تھی فرش کے کنارے کنارے حجرے بنے ہوئے تھے، ان میں طلبہ رہتے تھے ، ہم نے بھی ایک کمرے میں اپنا رَختِ سفر اتار دیا ، دوسرے دن مولانا ایوب صاحب تشریف لائے ، پتلے دبلے لمبے قد کے شیروانی پاجامے میں ملبوس عالم فاضل دیکھتے ہی معلوم ہوتے تھے، انھوں نے نہایت مسرت کے ساتھ ہمیں مدرسہ میں داخل کرلیا ، اتفاق سے اسی دن شام کو ہمیں بتا دیا گیا کہ فلاں جگہ دعوت میں جانا ہے ، مغرب کی نماز کے بعد قدیم طلبہ کے ساتھ ہم تینوں بھی گئے ، وہاں پہونچے تو عجیب سا ماحول نظر آیا ، بجھے بجھے سے لوگ ، چہرے اُترے ہوئے ، اُداسی پورے ماحول پر مسلط تھی ، رونے سے آنکھیں سوجی ہوئیں ، گھر میں ایک جگہ لیپ پوت کر صاف ستھرا بنایا گیا وہیں چٹائیوں پر طلبہ کو بٹھا دیا گیا ، ہمیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسی دعوت ہے جہاں نہ کہیں مسکراہٹ ہے نہ خوشی کا کوئی نشان جبکہ دعوت کے لفظ سے ہمارا تصور کچھ اور ہی تھا، ایک ادھیڑ عمر عورت نے اپنے مرے ہوئے لڑکے کا ذکر بلک بلک کر روتے ہوئے شروع کر دیا اس کو مرے ہوئے تین دن ہو چکے تھے آج اس کا تیجہ تھا جس میں فقیروں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے جب معلوم ہوا کہ یہ تیجہ کا کھانا ہے، تو میری طبیعت نالش کرنے لگی اور دورانِ سر شروع ہو گیا خطرہ ہوا کہ قے نہ ہو جائے ، جلدی سے اٹھ کر باہر آ گئے ، مدرسہ آ کر میرے دونوں ساتھیوں نے بھی یہی شکایت کی ، بڑی مشکلوں سے طبیعتوں کو سنبھالا گیا ، بڑی مسجد آ کر دیر تک گم صم لیٹے رہے، طبیعت کو بہلانے کی کوشش کرتے رہے، کسی طالب علم سے تعارف نہیں تھا، کس سے کیا کہتے ، ہم تینوں نے عشاء کی نماز کے بعد فیصلہ کیا کہ

ایسے مدرسہ میں رہنا چونکہ ممکن نہیں اس لئے کوئی دوسرا مدرسہ تلاش کرنا چاہئے، صبح کو باتوں باتوں میں دوسرے لڑکوں سے معلوم ہوا کہ یہاں ایک دوسرا مدرسہ حنفیہ جو نواب صاحب کا مدرسہ کہا جاتا ہے، بس اتنا معلوم کر کے ہم لوگ خاموش ہو گئے اور دل میں فیصلہ کرلیا کہ مدرسہ حنفیہ کو دیکھنا چاہئے۔

مدرسہ حنفیہ میں.............................

دوسرے دن ہم تینوں دوست مدرسہ کی تلاش میں نکلے، جلد ہی مل گیا، ایک بہت لمبی چوڑی باؤنڈری تھی، لب سڑک اس کا پھاٹک تھا، اندر پہونچے تو سامنے ایک خام سفالہ پوش مکان نظر آیا، ایک وسیع وعریض چبوترہ ہے، پھراس پر ایک سائبان جس میں چوکیاں لکڑی کے تخت بچھے ہوئے ہیں، اس کے بعد اندر کا بڑا کمرہ ہے، اسی کمرہ سے متصل دائیں جانب ایک دروازہ تھا جو ایک وسیع صحن میں کھلتا تھا، یہی اصل مدرسہ تھا، اس صحن میں چاروں سمت کمرے بنے ہوئے تھے، شمالی جانب کے کمروں میں طلبہ رہتے تھے اور کچھ طلبہ مغربی سمت کے کمروں میں تھے، اسی جانب مدرسہ کا مطبخ تھا باورچی شہر کا باغ وبہار آدمی تھا، نام محمد اسمٰعیل تھا، اس کا معاون ایک چھوٹے قد کا کالا کلوٹا آدمی تھا اس کا نام کلو تھا، جنوبی جانب سائبان اور پھر ایک کمرہ تھا اس میں ایک استاد پنجاب کے رہنے والے تھے پچپن چھپن کی عمر رہی ہوگی، خوب گورے چٹے، دوہرا بدن، بھری بھری کھچڑی داڑھی بہت ہی وجیہ وشکیل، چہرے سے بزرگی ہویدا تھی وہی سائبان ان کی درسگاہ تھی اور اندر کا کمرہ ان کی رہائش کے لئے تھا، باہر چبوترے والے مکان میں فرنگی محل لکھنؤ کے مولانا محمد قائم صاحب رہائش پذیر تھے، باہری سائبان ان کی درسگاہ تھی، یہی صدر مدرس تھے، پتلے دبلے لمبے قد کے بزرگ، سارے دانت مصنوعی تھے، لکھنوی تہذیب اور وضعداری ان میں بدرجۂ اتم تھی،

ساری زندگی تجرد کی گذاری شادی نہیں کی ، اس لئے تن تنہا رہتے تھے ، لطف یہ کہ روزانہ صبح کو مگدر گھماتے تھے ، مگدروں کی ایک جوڑی کونے میں رکھی رہتی تھی ، روزانہ لباس بدلتے تھے ، وہی لکھنؤ کی دو پلی ہوائی ٹوپی گرمیوں میں آبِ رواں یا تن زیب کا باریک کرتا ، تن زیب ہی کی اچکن زیب تن رہتی تھی ، چھالٹی کا علی گڈھ پاجامہ ایک دم زرق برق رہتے تھے ، عوام سے شاید ہی ملتے تھے ، اسی احاطہ کے مغربی سمت میں ایک حویلی نما مکان تھا جو نائب صاحب کا مکان کہا جاتا تھا ، وہی نائب صاحب عصر بعد مولانا فرنگی محلی کے پاس بیٹھتے تھے ، ایک پلنگ دو تین کپڑے کی کرسیاں ، ایک میز چبوترے پر رکھ دی جاتی ، اسٹینڈ والا پنکھا ذرا دوری پر کھڑا کر دیا جاتا جو موم بتی جلا کر اسٹارٹ کیا جاتا تھا ، بجلی کے پنکھے ابھی رائج نہیں تھے ، وہ پنکھا گھن گھن کی آواز کے ساتھ چلنے لگتا تھا جیسے کوئی بوڑھی عورت چرخے پر روئی کات رہی ہے ، ہم لوگ اس کو حیرت سے دیکھتے تھے۔

مدرسہ میں چالیس پچاس کے قریب طلبہ پڑھتے تھے ، جس میں سب بنگالی اور داڑھی والے تھے ، ان میں صرف ایک طالب علم بلیا ضلع کا عبد الصمد تھا جس کی ایک آنکھ مصنوعی تھی ، چھپرا ضلع کے دو فقیر نما لڑکے تھے باقی سب بنگالی تھے جو کئی کئی برسوں سے یہاں تھے ، بنگالی طلبہ شہر کی مختلف مسجدوں میں رہتے تھے ، مدرسہ کے دار الطلبہ میں کوئی بنگالی طالب علم نہیں تھا ، ہم نے مولانا فرنگی محلی سے اپنی حاضری کا مقصد بیان کیا ، انھوں نے بغیر کچھ پوچھے بلا تردد فرمایا ، آپ لوگ ابھی آجائیں ، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ، نہ جانچ نہ پرتال ، نہ درخواست نہ امتحان ، نہ داخلہ کی کارروائی نہ رجسٹر کی خانہ پُری ، نواب صاحب کا مدرسہ تھا کوئی کھیل نہیں ، یہاں سب کام نوابوں کی ہی طرح ہوتا تھا ، ہم لوگ خوشی خوشی اُٹھے اور سلام کر کے چلے آئے اور چار بجے بڑی

مسجد سے اپنا سامان اٹھایا اور مدرسہ حنفیہ میں آ گئے اور شمالی جانب کے غربی سمت کے آخری کمرے میں دس ماہ کے لئے رِختِ سفر کھول دیا، سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ یہاں طلبہ دعوتوں میں نہیں جاتے تھے جس سے ہم لوگوں کو نفرت تھی، مدرسہ میں مطبخ تھا، باورچی ماہر تھا، کھانا صاف ستھرا اور اچھا پکاتا تھا، یہاں آزادی خوب تھی، نہ کوئی نگراں، نہ کوئی پابندی، نہ اصول نہ کوئی قاعدہ، نہ حاضری رجسٹر نہ رُخصت نہ تعطیل، البتہ درس کا ایک معمول تھا جس میں تخلف نہیں ہوتا تھا، فجر کی نماز کے بعد فوراً اسباق شروع ہو جاتے تھے، ہم لوگوں نے مفتاح العلوم چھوڑا تھا تو شرح جامی وغیرہ پڑھ رہے تھے، یہاں ہم لوگوں کو مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ کی جماعت میں شریک کیا گیا تھا، مشکوٰۃ مولانا فرنگی محلی پڑھاتے تھے، ہدایہ وغیرہ مولانا پنجابی پڑھاتے تھے، ہم لوگ مطمئن ہو گئے، یہ عمر سودوزیاں کے باریک مسائل پر غور کرنے کی نہ تھی۔

جونپور کی دلچسپیاں.............................

دس بجے تک اسباق ختم ہو جاتے تھے، اب دن بھر آزاد تھے جہاں چاہیں جائیں، جو چاہیں کریں، ہم لوگ کبھی شاہی پل چلے گئے جو بالعموم چار بجے شام کی تفریح تھی، دن میں جونپور شہر کے اطراف میں شاہی کھنڈرات میں گھومتے تھے، کبھی عیدگاہ پہونچ گئے اور غلیل سے چڑیوں کا شکار کر رہے ہیں، کبھی لال دروازے کی شاہی مسجد کے کھنڈر میں چکر لگا رہے ہیں، اس وقت جونپور پھولوں اور خوشبوؤں کا شہر تھا، شہر کے باہر زمین کے بڑے بڑے پلاٹوں میں چنبیلی اور بیلے حدنظر تک بہار دکھا رہے ہیں، کہیں رنگ برنگ گلاب کے پودے جھوم رہے ہیں، جب ان پودوں میں پھولوں کا موسم ہوتا تھا تو جی چاہتا تھا کہ بس ان کو دیکھتے رہیئے، ہر طرف چمن کھلا ہوا سرسبز پوشاک پہنے پودے بدمست شرابی کی طرح جھومتے رہتے تھے، کبھی

دریائے گومتی کے ساحل کی طرف نکل جاتے تو وہاں دیکھتے کہ ہر طرف سفید تل دھوئی جارہی ہے، سیکڑوں آدمی اس کام میں لگے ہوئے ہیں، چونکہ جونپور خوشبودار تیلوں کے لئے مشہور تھا اس لئے محلّہ کا محلّہ اس صنعت میں لگا ہوا تھا، دھلی ہوئی تلوں کو ایک چادر پر پھیلا دیا جاتا پھر اس پر بیلا، یا گلاب یا چنبیلی کے پھول پھیلا دیتے پھر اس کو ایک دوسری موٹی چادر سے ڈھانک دیتے جب تل میں ان پھولوں کی خوشبو جذب ہوجاتی تو تل کو گھریلو کولہو میں پیل لیا جاتا تھا، ایک بار بیلے کا تیل ہمیں ملا، جب شیشی سے تیل ہتھیلی پر انڈیلا تو معلوم ہوتا تھا کہ مٹھی بھر بیلے کے تازہ پھول ہاتھوں میں ہیں، مجھے بیلے کی خوشبو پسند تھی، شاہی پل کی نشیبی آبادیوں میں یا قلعہ کے نشیبی محلّہ میں زیادہ تر یہی خوشبودار تیلوں کا کام ہوتا تھا اور اصلی تیل ملتا تھا، بعد میں تو وہائٹ آئل کی بو اُڑا کر اس میں ایسنس ملا کر ہر طرح کے خوشبودار تیل بنائے جانے لگے جو درحقیقت کراسن آئل ہوتا تھا، اس کے استعمال سے بال جلد ہی سفید ہونے لگتے تھے۔

احاطہ مدرسہ کے شمال مغربی کونے پر مدرسہ کی مسجد تھی، ہم لوگ زیادہ تر یہیں رہتے تھے، اس کے کمروں میں طلبہ رہتے تھے، انھیں میں غازی پور کا ایک لڑکا نیاز رہتا تھا وہ بہت اچھا گاتا تھا، آسؔی غازی پوری کی غزلیں اس کو یاد تھیں، خوب لہرا کر پڑھتا تھا، اسی کی زبان سے میں نے حضرت آسؔی کی وہ مشہور غزل سنی تھی جس کے دو شعر اب بھی یاد ہیں۔

بدگمانی نہ کرو آج رہو میرے گھر
شب اندھیری بھی ہے بدلی بھی ہے گھر دور بھی ہے
فاتحہ مرقدِ آسؔی پہ ذرا پڑھتے چلو
رسمِ دنیا بھی ہے، موقعہ بھی ہے، دستور بھی ہے

حضرت آسی ایک سجادہ نشیں پیر تھے جن کا اصلی وطن سکندر پور ضلع بلیا تھا، لیکن وہ غازی پور میں اقامت گزیں ہوگئے تھے، ان کے مریدین غازی پور اور جونپور دونوں جگہ تھے، وہ اردو کے بہترین شاعر تھے، ان کا مجموعہ کلام شائع ہوگیا ہے لیکن میں نے نہیں دیکھا ہے، قوال ان کی اکثر غزلیں گاتے تھے۔

مسجد کے شمالی جانب ایک پتلی سڑک تھی، سڑک کے بعد ایک ٹیلہ نما جگہ تھی اس پر ایک مسلم محلّہ آباد تھا، اس محلّہ کا ایک لڑکا مشتاق احمد تھا جو ہم سے عمر میں ذرا بڑا تھا اس سے تعارف ہوا تو آنے جانے لگا اور بے تکلفی ہوگئی تو شہر کی معلومات ہوئیں، وہ غالی بدعتی تھا، لیکن ابھی ہماری عمریں ان اختلافات کی کوئی پرواہ کرنے کی نہیں تھیں، چند قدم کے فاصلہ پر اس کا مکان تھا، وہ جب آتا تو بتاتا کہ آج فلاں جگہ عرس ہے، فلاں جگہ قوالی کی محفل ہوگی، چونکہ ہمارے اساتذہ بھی اسی مسلک کے تھے اس لئے ہماری راہ میں کوئی رُکاوٹ نہیں تھی، پھر ان کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی طالب علم کہاں جارہا ہے، مشتاق کے ساتھ ہم لوگ تمام عرسوں میں جاتے، قوالیوں میں شریک ہوتے، نذرونیاز، فاتحہ، چادر گاگر کی محفلوں، جلسوں میں جایا کرتے تھے، ایک بار تو ہم لوگ کھیتا سرائے کے عرس میں شرکت کے لئے گئے تھے، ہمارے یہاں ایک حافظ صاحب بہت بوڑھے پڑھاتے تھے، وہ کھیتا سرائے کے تھے، انھوں نے لاری کا کرایہ دیا اور ہم لوگوں کو اپنے گھر پر ٹھہرایا اور عرس کے تمام مراسم میں شریک ہوئے، اور دوسرے دن واپس ہوئے۔

ایک دن مشتاق ہم لوگوں کو لے کر خانقاہ رشیدیہ گیا، اس روز وہاں بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جارہا تھا، ہم لوگ وہاں پہونچے تو خانقاہ کے احاطہ میں داخلہ کے لئے ایک بڑا پھاٹک نظر آیا، مشتاق احمد اسی گیٹ کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوگیا بالکل

ایسے ہی جیسے نماز میں سجدہ کرتے ہیں، ہم تینوں حیرت زدہ کھڑے رہے، ہم لوگوں نے کبھی قبروں کو اس طرح سجدہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، ہم نے اس سے کہا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟ یہ کوئی مسجد ہے، اس نے کہا کہ بزرگوں کے مزاروں پر سجدہ بزرگوں کی خدمت میں ہدیۂ سلام و نیاز پیش کرنا ہے، اولیاءاللہ کے ادب واحترام کا یہی طریقہ ہے جب ان کے مزارات پر جایا جائے تو پہلے ان کو سجدہ کر لینا چاہئے، یہ سجدہ تعظیمی ہے، ہمارے علماء یہ بتاتے ہیں، ہماری عمریں ابھی ان مسائل کو سمجھنے کی نہ تھیں لیکن دل تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کرتا رہتا تھا، یہ ہمارے گھریلو ماحول کا اثر تھا ہم نے نماز کے علاوہ کبھی کسی کو قبروں پر سجدہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لئے ہر جگہ ہم لوگ صرف تماشائی بن کر رہ جاتے تھے۔

جب خانقاہ کے اندر پہونچے تو عرس کی کارروائیاں شباب پر تھیں، عورتیں مردوں کی ایک بھیڑ تھی، مزار کو غسل دیا جارہا تھا، غسل کے پانی کو شیشوں اور بوتلوں میں عقیدت مند بھرتے جارہے تھے، غسل کے بعد نئی ریشمی چادر سے مزار کو ڈھانک دیا گیا، پھر قُل، نیاز فاتحہ اور نہ جانے کیا کیا ہوتا رہا، مشتاق تو اس میں شامل ہوگیا ہمارے حصہ میں صرف دور کا جلوہ تھا، انھیں ہنگامہ آرائیوں میں شام ہوگئی اور ہم لوگ اپنے مدرسہ واپس آگئے۔

قوالی کی محفل میں........................

ہمارے مدرسہ سے تھوڑی دوری پر ایک صاحب رہتے تھے جن کا نام نظام الدین صدیقی تھا جو نیشنلسٹ اور کانگریسی تھے، کھدر کا چوڑی موری، ناخنی گوٹ کا پاجامہ پہنتے تھے، جسم تھل تھل تھا، اس زمانہ میں وہ جونپور کے مقامی سیاسی ورکر تھے، بعد میں وہ مجلس احرارِ اسلام کے ممتاز لیڈروں میں شامل ہوگئے، بڑی پُر جوش تقریریں

کرتے تھے، وہ ایک دن سرراہے ملے اور ہم لوگوں کو اعظم گڈھ کا سمجھ کر ملے، ہم نے تعارف میں مئو کے اپنے اساتذہ کرام کے نام بتائے تو انھوں نے ہم لوگوں کو بھی اپنے سیاسی مسلک کا سمجھا اور ذہنی قربت محسوس کی، یہ پہلی ملاقات تھی، پھر راستہ میں کبھی کبھی دعا وسلام ہو جاتا تھا، اس زمانے میں نظریاتی اتحاد کو بڑی اہمیت حاصل تھی، چونکہ مسلمان کانگریسی ورکر بہت کم تھے، صدیقی بھی جونپور میں اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے اس لئے ہم لوگوں کو نیشلسٹ سمجھ کر بڑے خُلوص سے ملتے رہے، وہ مشہور شاعر شفیق جونپوری کے خاندان کے ایک فرد تھے، ایک ہی گھر میں رہتے تھے ان کے گھر ایک دن قوالی کا پروگرام تھا، انھوں نے عصر کے بعد ہم لوگوں سے کہا کہ شام کو ہمارے یہاں بڑے محدود پیمانے پر قوالی کی ایک محفل ہوگی، تم لوگ بھی آ جاؤ، ہماری تو عمر ہی کھیل کود اور تماشوں کی تھی، ایسے مواقع تو ہم تلاش ہی کرتے تھے، ہم لوگوں نے کہہ دیا کہ ضرور حاضر ہوں گے اور ۸/ بجے شب میں ان کے گھر پہونچ گئے، یہ مکان شفیق جونپوری کا تھا جو بعد میں ''فخر مشرق'' کہے جانے لگے، وہ اس وقت مشہور نہیں تھے ان کا نام مولوی ولی الدین تھا، شفیقؔ تخلص رکھتے تھے، وہ زیادہ تر نعت یا چار یاری نظمیں اور منقبتیں لکھتے تھے اور مذہبی جلسوں میں پڑھتے تھے، ان کے والد بھی شاعر تھے صرف نعت کہتے تھے اور میلاد خواں تھے، شفیق صاحب بھی اسی مسلک کے تھے بعد میں وہ بالکل بدل گئے تھے، قوالی انھیں کے گھر کے آنگن میں تھی، قوالی کی محفل میں چودہ پندرہ آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے، انھیں میں ہم لوگ بھی شامل تھے، ہم نے قوالی کبھی نہیں سنی تھی، نہ کبھی قوالی کی محفل میں شریک ہوئے تھے اور نہ قوالوں کو گاتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا اس لئے ہر چیز کو ہم لوگ حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نوجوان سولہ سترہ سال کا گورا چٹا لڑکا بے داڑھی مونچھ کا اصل قوال تھا، وہ گاتا بھی تھا اور تالی بھی بجاتا تھا، تالی کا ایک خاص انداز تھا جو بڑی پریکٹس کے بعد آتا ہے، ایک ہارمونیم

والا تھا اور ایک ڈھولک والا، یہ تین نفر کی پارٹی تھی۔قوالی شروع ہوئی کوئی نعت چل رہی تھی جب قوالوں نے پہلے مصرعہ کو درجنوں بار دہرا کر دوسرا مصرعہ اٹھایا تو تالیوں کی رفتار تیز ہوگئی، ڈھولک والا جھوم جھوم کر گردن جھٹک جھٹک کر ڈھولک پر تھاپ لگانے لگا، اس کے ہاتھ اتنی برق رفتاری سے چل رہے تھے کہ حیرت ہوتی تھی، ہارمانیم بجانے والے کی انگلیاں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہارمونیم کی پٹیوں پر دوڑنے لگیں، ایک سماں بندھ گیا، سامعین کیف وسرور میں ڈوب گئے، ہر شخص جھومنے لگا، محفل میں ایک طرف ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے جن کی عمر ۶۰، ۶۵ رسال کے قریب رہی ہوگی، وہ گردن جھکائے کچھ دیر ہلکے ہلکے جنبش کرتے رہے، پھر ہو، ہو کرتے کرتے کھڑے ہوگئے، محفل کے دوسرے کنارے پر ایک دوسرے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے جو انھیں کے ہم عمر تھے، وہ بھی ہو، ہو کرتے ہوئے اُٹھ گئے، پھر دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا اور کیف ومستی میں تھرکنے لگے اور ہو، ہو کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی، قوالی پارٹی نے جب یہ رنگ دیکھا تو اس مصرعہ کی تکرار بڑھادی، جب محفل کا کیف وسرور اور بڑھا تو تینوں قوال کھڑے ہوگئے، گانے والا نوجوان، ہارمونیم والا اور ڈھولک والا ہارمونیم اور ڈھولک لے کر سروقد کھڑے ہوگئے، اور مستی میں جھوم جھوم کر پوری دھوم دھام سے صرف ایک ہی مصرعہ کو جوش وخروش سے گاتے رہے، اب پوری محفل بھی کھڑی ہوگئی، بڑی دیر تک وجد وحال اور کیف ومستی کا یہ سماں رہا، جب دونوں بوڑھوں کی آواز دھیمی ہونے لگی اور پھر خاموشی سے جھومتے رہے اور پھر تھک کر بیٹھ گئے تو پوری مجلس بیٹھ گئی، اب بادل برس کر جا چکا تھا۔

شفیق جونپوری کو وجد آگیا........................

قوالوں نے اب دوسری نعت شروع کی جو غالباً خود شفیق صاحب ہی کی تھی،

کیونکہ مقطع میں ان کا تخلص موجود تھا، نعت چلتی رہی، نعت بھی کچھ والہانہ اور سرشارانہ انداز کی تھی، پھر قوالوں کی آواز ہارمونیم کی تان نے اس کو مئے دوآتشہ بنا دیا، جب قوالوں نے مقطع کا شعر پڑھا جس میں یہ مفہوم تھا کہ ''شفیق رُوسیہ کا منہ نہ دیکھیں گے'' یا اسی طرح کا تخیل تھا، اس مقطع کو جب قوال نے اُٹھایا اور لہرا کر گایا تو شفیق صاحب کو وجد آ گیا، حال آ گئی، بیٹھے بیٹھے پہلے جھومنے لگے پھر کبھی سر زمین پر رکھ دیتے، پھر اٹھتے، آنکھیں بند کئے ہوئے ''منہ نہ دیکھیں گے، منہ نہ دیکھیں گے'' کے جملے کی تکرار کرتے جیسے شفیق صاحب کے ہوش وحواس بجا نہ تھے، بیخودی کا عجیب عالم تھا، دیوانوں کی طرح بار بار بیٹھے بیٹھے گر پڑتے پھر اٹھتے پھر گرتے اور اٹھتے رہے، اور چہرے پر دوہتھڑ مار رہے تھے، عجیب منظر تھا، قوالوں نے کئی منٹ تک مسلسل اسی مصرعہ کو دہرایا تب کہیں جا کر فضا میں ٹھہراؤ پیدا ہوا، شفیق صاحب اپنے ہوش میں آئے۔

ہمارے لئے قوالی کی یہ محفل بڑی دلچسپ ثابت ہوئی، یہ پہلا تجربہ تھا جس سے سمجھ میں آیا کہ محفل سماع میں بزرگوں نے کیسے ایک مصرعہ پر جان دیدی ہے، اس کی اصل تو نہیں نقل ہم نے بھی دیکھ لی، وہ قوال لڑکا جس کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں تھی اور شاید کچھ پڑھا لکھا بھی زیادہ نہیں تھا کسی سے پتہ پوچھ کر ایک دن میرے پاس آیا، کچھ نقلیں اس کے پاس تھیں اس کو صاف اور خوشخط لکھوانا چاہتا تھا، میں نے اس کو خوشخط لکھ کر دے دیا۔

بس اسی طرح کے کھیل تماشے اور مشغلے شب و روز تھے، تعلیم کے نام پر کچھ نہیں کیا، کیا پڑھا کیا لکھا کچھ یاد نہیں، مدرسہ حنفیہ میں امتحان بھی نہیں ہوتا تھا اس لئے کتابوں کو درس کے علاوہ کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے، سچ مچ یہ مدرسہ نواب صاحب کا تھا، ہم لوگ بھی سال بھر نوابی کرتے رہے، نکما ہونا نوابی کا سب سے بڑا جوہر تھا، ہمارا

دامن بھی اس سے مالا مال ہو رہا تھا، ہمیں ساری کتابیں دوبارہ پڑھنی پڑھیں، پورا سال ہم نے ضائع کیا، البتہ دنیا خوب دیکھی، دنیا کے کئی رنگ دیکھے، شعبان آیا تو ہم نے رختِ سفر باندھ لیا، مولانا محمد قاسم فرنگی محلی نے بڑی شفقت ومحبت کے ساتھ ہم کو رُخصت کیا اور بہت سی دعائیں دیں۔

احیاءالعلوم مبارکپور میں.........................

دل میں چور تھا کہ گھر والوں کو مطلع کئے بغیر ہم لوگوں نے مفتاح العلوم سے فرار کیا تھا، ان کو کیا جواب دیں گے؟ ذہن میں تھا کہ خوب فضیحت ہوگی لیکن گھر والوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا، اصل بات یہ تھی کہ ہمارے گھر والوں کو ہمیں تعلیم دلانے کا بہت شوق تھا، اس کے لئے وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھے، ہمارے طالب علمانہ طور طریق کی وجہ سے ان کو ہمارے اوپر اعتماد تھا کہ یہ غلط راہ پر نہیں جائیں گے، ہمارا یہ فرار تعلیم سے نہیں تھا بلکہ تعلیم کی طرف تھا چاہے کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کو وقتی طور کچھ ٹھیس پہونچی ہو لیکن چونکہ ہماری نیتیں درست تھیں اس لئے فرار کا ذکر کبھی گھر میں نہیں آیا، ہنسی خوشی رمضان گذر گیا، اب ہم کو فکر لاحق ہوئی کہ کہاں جائیں، یہ فیصلہ ہمیں خود کرنا تھا، گھر والوں نے ہمارے اوپر چھوڑ دیا تھا، ان کی خود کوئی رائے نہیں تھی وہ سمجھتے تھے کہ جہاں مناسب سمجھیں گے چلے جائیں گے مگر ہمارے سامنے کئی مسئلے تھے، مدرسہ مفتاح العلوم سے خلافِ ضابطہ بھاگ کر گئے تھے اس لئے وہاں کس منہ سے جاتے؟ دارالعلوم مئو میں داخلہ ہمارے ذہن ومزاج اور اُفتادِ طبع کے خلاف تھا کیونکہ ابتداء ہی سے ہماری تعلیم وتربیت دارالعلوم دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نقطۂ نگاہ کے علماء مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی جیسے لوگوں کی زیرِ سرپرستی ہوئی تھی اس لئے بچپن کے سادہ دل ودماغ اور ذہن کے

ورق پر جو تصویر مرتسم ہوئی وہ اس سے بالکل مختلف تھی جو مولانا اشرف علی تھانوی اور ہمارے ضلع کے مشہور مصلح مولانا وصی اللہ فتحپوری کے حلقہ کے لوگوں کی تصویر تھی ،دارالعلوم مئو کے اساتذہ اور انتظامیہ پر اسی نقطۂ نگاہ کی چھاپ تھی جس کے لئے ہمارے دلوں میں کوئی گنجائش نہیں تھی ،اس لئے میں نے اور میرے ہمدم دیرینہ مولوی محمد قاسمی کا فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اس سال مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور جائیں گے ، گھر والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ ان کو خود ہمارے فیصلہ کا انتظار تھا۔

اس وقت مبارکپور میں اُدری کے مولوی اختر پڑھ رہے تھے جو مولوی محمد قاسمی کے عزیزوں میں تھے،ان کے ساتھ ہم لوگ مبارکپور چلے گئے ۔

مولانا شکر اللہ صاحب.......................

جن دنوں کا ذکر چل رہا ہے ان دنوں ہمارے ضلع میں ہمارے مسلک کے دو مرکز تھے ایک مئو جس کے سربراہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اور مولانا عبد اللطیف نعمانی تھے، دوسرا مرکز مبارکپور تھا جس کے قائد و رہنما مولانا شکر اللہ مبارکپوری تھے، اس وقت ان حضرات سے بڑا کوئی عالم نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ان حضرات سے زیادہ کسی کی بزرگی کا اعتقاد کسی دل میں تھا ،مولانا شکر اللہ صاحب مرحوم کا علم و فضل ، زُہد وتقویٰ ،عقیدت واحترام کا مرعوب کن جذبہ ہمارے دلوں میں تھا اور ہم غائبانہ ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے ،مولانا موصوف فاضل دیوبند، علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردوں اور مولانا حسین احمد مدنی کے جاں نثار عقیدت مندوں میں شامل تھے، دینی معاملات میں انتہائی پُر جوش ،ردِّ بدعت میں شمشیر برہنہ، انتہائی سرفروش اور جان ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے بدعات وخرافات ،مشرکانہ رسم ورواج کے گڑھ مبارکپور میں اصلاح کا کام کر رہے تھے اور اپنے گرد فداکاروں اور جاں نثاروں کا ایک ناقابلِ تسخیر

گروہ جمع کر رکھا تھا، اگر مولانا ان سے کہتے کہ گھوڑے سمندر میں ڈال دو، آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی میں چھلانگ لگادو تو اس گروہ کا ہر فرد سمندروں میں کودنے اور دہکتی ہوئی بھٹی میں چھلانگ لگانے کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا وہ روح پھونک دی تھی مولانا موصوف نے ان کے دلوں میں، انھوں نے مبارکپور میں بڑے حیرتناک کارنامے انجام دیئے تھے، انھیں کارناموں کی وجہ سے پورے ضلع میں وہ بڑے ادب واحترام اور انتہائی عقیدت کے ساتھ یاد کئے جاتے تھے، ہم انھیں کے مدرسہ میں داخلہ چاہتے تھے جس کا نام احیاء العلوم تھا، اور ہمارے میر کارواں مولوی اختر مدرسہ اشرفیہ میں پڑھتے تھے جو غالی بدعتیوں کا مرکز تھا، ہم دونوں بھی انھیں کے ساتھ مدرسہ اشرفیہ میں اُترے، بڑی خاطر مدارات ہوئی، ہمارا بڑا لحاظ وخیال رکھا جاتا تھا، صدر مدرسہ جناب محمد امین صاحب اور حافظ ملت عبدالعزیز صاحب سے زیارت و ملاقات کرائی گئی، مہمانوں کی طرح کھانے پینے کا بندوبست کیا جاتا رہا، مگر ہم دیکھتے تھے کہ مولوی اختر دوسروں سے کچھ چپکے چپکے کانا پھوسی بھی کرتے تھے، یہ بات ہم لوگوں کو کھٹکتی تھی، ہم لوگوں کی عمریں اس وقت ۱۴ رسال کے قریب تھیں، چہروں کو پڑھنا ہم سیکھ چکے تھے، ہم دونوں نے اس صورتحال پر تبادلۂ خیال کیا اور تیسرے دن صبح کو ہم دونوں مدرسہ سے نکل کر ٹہلتے ہوئے مدرسہ احیاء العلوم پہونچے۔

احیاء العلوم........................

ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا، اس کی تین سمتوں میں سلیقہ سے سفالہ پوش کمرے بنے ہوئے تھے، دیواریں پختہ اینٹوں کی تھیں ان پر پلاستر بھی تھا اور سفید قلعی بھی، البتہ مشرقی جانب صحن میں کنواں تھا اس کے بعد ایک چھوٹا سا سائبان اور کمرہ تھا، یہی مولانا شکر اللہ صاحب مرحوم کا دار الاہتمام تھا، جنوبی جانب ایک عالی شان دار الاہتمام

اور لائبریری کی تعمیر ہورہی تھی، صبح کے ۹ر بجے تھے جب ہم احیاء العلوم میں پہونچے تو کوئی چہل پہل نظر نہیں آئی، صحن ومدرسہ میں ایک بزرگ اینٹوں کے منتشر روڑے چن رہے تھے اور ان کو ایک جگہ جمع کررہے تھے، سفید گاڑھے کا لمبا کرتا، گاڑھے کی تنگ موری کا سفید پاجامہ، اسی کپڑے کی سفید دو پلی ٹوپی، نکلتا ہوا قد، رنگ قدرے سانولا، پانوں کی کثرت کی وجہ سے دانت کالے پڑ چکے تھے، آنکھیں ابھری ہوئی جیسے ابھی سوکر اُٹھے ہوں یا جیسے ساری رات تہجد پڑھنے کے بعد نیم بیداری نیم غنودگی کی کیفیت تھی، ان کے سامنے کھڑے ہوکر انتہائی مرعوبیت کا احساس ہوتا تھا، ہمیں بتایا گیا کہ یہی مولانا شکر اللہ صاحب ہیں، ہم دونوں قریب پہونچے، سلام کیا، گردن اُٹھائی، سلام کا جواب دیا، ہم دونوں پر ایک گہری نگاہ ڈالی، دیکھا کہ دونو عمر لڑکے سفید کرتا، سفید پاجامہ، سفید ٹوپی خالص طالب علمانہ لباس میں سامنے کھڑے ہیں، چونکہ اس زمانے میں ہم دونوں کا رنگ بہت صاف تھا، صحت بہت اچھی تھی، بظاہر اچھے گھرانے کے معلوم ہوتے تھے، انھوں نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ ہم نے مختصر لفظوں میں اپنی کہانی سنائی کہ ہم اسی مدرسہ میں آنا چاہتے تھے لیکن ایک بریلوی ساتھی کی وجہ سے مدرسہ اشرفیہ میں قید ہیں، ہم اب یہاں آنا چاہتے ہیں، انھوں نے مسکرا کر فرمایا: دو چار دن اور دعوتیں کھالو، پھر آجانا داخلہ ہوجائے گا، ابھی یہاں داخلہ شروع نہیں ہوا ہے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، دو تین دن بعد ایک دن سامان اٹھایا اور احیاء العلوم آ گئے۔

اساتذۂ احیاء العلوم.........................

احیاء العلوم میں دور دراز کے لڑکے بالکل نہیں تھے، زیادہ تر قرب وجوار کے طلبہ تھے، خیرآباد، ولید پور، بھیرہ، پورہ معروف، ابراہیم پور، جہانا گنج اور گھوسی وغیرہ اور دوسرے گاؤں اور دیہاتوں کے تھے، ضلع گورکھپور، دیوریا اور بستی کے ایک ایک

دو دو لڑکے تھے مگر مدرسہ میں بڑی ہما ہمی اور خوب چہل پہل تھی۔

اس وقت بڑے اساتذہ میں تین استاد نمایاں اور ممتاز تھے، صدر المدرسین مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مرحوم تھے جن کو بعد میں فتویٰ نویسی میں بڑا کمال حاصل ہوا اور خوب شہرت پائی، وہ ایک سیدھے سادے بہت ہی نیک بزرگ تھے، دنیاوی چھل کپٹ سے ناواقف، زمانہ سازی سے بہت دور، بھولے بھالے انسان تھے، جو چاہے ان کو بہکا دے، ذہن بھی کچھ زیادہ تیز نہیں تھا لیکن کتابوں کے مطالعہ میں محنت بہت کرتے تھے اور مکمل تیاری کے بعد مسند درس پر بیٹھتے تھے، درس کی تقریر کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتے، زبان میں سلاست اور روانی بھی نہیں تھی، رُک رُک کر اٹک اٹک کر بولتے تھے، مطالعہ کر کے جو کچھ آتے وہ ہو بہو پیش کر دینے کی کوشش کرتے تھے، کبھی کبھی شرارت سوجھتی تو درمیان تقریر کوئی مہمل سا سوال کر دیتا، ان کا سلسلۂ تقریر ٹوٹ جاتا، اب سلسلہ جوڑنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا وہ پریشان ہو جاتے، جلدی جلدی حاشیہ دیکھنے لگتے، اب وہ لاکھ سمجھاتے مگر بات بنتی نہ تھی، کیونکہ ان کو اپنے سمجھانے پر خود ہی اعتماد نہیں ہوتا اور سبق دوسرے دن کیلئے ملتوی ہو جاتا، اتنے سیدھے سادے اور بھولے بھالے تھے اگر وہ رات میں مدرسہ میں قیام کرتے اور اپنی چارپائی صحن میں بچھواتے تو لڑکے سوچتے کہ ہماری آزادی میں خلل پڑ رہا ہے پس کوئی لڑکا جاتا اور نہایت ادب سے عرض کرتا کہ حضرت بارش کا اندیشہ ہے آپ فرمائیں تو چارپائی کمرے میں بچھا دوں حضرت مفتی صاحب فوراً کہتے ہاں ہاں ابھی بچھا دو معلوم نہیں کب بارش آجائے جب کہ آسمان بالکل صاف، حدنگاہ تک ستارے جگمگا رہے ہیں ایک لکۂ ابر بھی آسمان پر نہیں نہ بارش کا موسم لیکن چارپائی اندر پہونچا دی جاتی اور پوری رات سڑی گرمی میں گذارتے اس زمانے میں بجلی کے پنکھے

نہیں تھے لڑکوں کو اطمینا ن ہو جاتا، شرارتیں، ہنگامے، اچھل کود، چھیڑ چھاڑ شروع ہو جاتی حضرت مفتی صاحب ہماری بہت سی کتابوں کے استاد تھے، دل میں ان کی بڑی عزت اور احترام تھا، ہلکا سانولا رنگ، سیدھا سادا کرتا پاجامہ، دو پلی ٹوپی پہنتے، ذرا سا بزرگانہ خم دے کر چلتے رہے، بالکل سادہ وضع کے بزرگ تھے، بہت ہی محتاط اور زاہدانہ زندگی گزارتے تھے۔

ہمارے دوسرے استاد حضرت مولانا محمد عمر صاحب مظاہری تھے، قصبہ کے صوفی پورہ میں ان کا مکان تھا، بہت تیز وطرار، جملہ چست کرنے والے، بڑے جوش وخروش سے درس دینے والے، ہلکا سانولا رنگ، نکلتا ہوا قد، چھریرا بدن، چشمہ آنکھوں پر، سیدھا سادا کرتا، پتلی موری کا پاجامہ، ٹوپی استعمال کرتے، اس وقت مبارکپور کے سب سے مشہور ومقبول مقرر وواعظ تھے، مظاہر علوم سہارنپور کے فاضل تھے، کچھ دنوں دار المبلغین لکھنؤ میں بھی گزارے تھے، ہم نے سبعہ معلقہ، دیوانِ حماسہ، مختصر المعانی وغیرہ انھیں سے پڑھی تھیں، سبق کے دوران وہ اشعار کو خوب لہرا کر جوش وخروش سے پڑھتے، ترجمہ کراتے، مطلب سمجھاتے اور خوب کھول کر بلکہ مبارکپوری بولی کے الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کر جاتے، تحقیق لغوی کے بکھیڑے میں زیادہ نہیں پڑتے تھے، وہ کام ہم طلبہ کے ذمہ تھا، بحمد اللہ حیات ہیں، خدا تادیر ان کو زندہ وسلامت اور بعافیت رکھے۔

ہمارے تیسرے استاد مولانا بشیر احمد صاحب مظاہری تھے، مظاہر علوم سہارنپور کے فاضل تھے، بہت سوجھ بوجھ کے بزرگ تھے، مدبر بھی تھے اور ذہین بھی، سیاست میں ان کا ذہن خوب چلتا تھا، جوڑ توڑ کے فن سے بھی واقف تھے اور جماعتی نظام پر کنٹرول کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے، قد ذرا دبتا ہوا، جسم گٹھا ہوا بہت صحتمند،

چشمہ لگاتے تھے، افہام وتفہیم کا بہت اچھا سلیقہ تھا، منطق وفلسفہ کی اکثر کتابیں وہی پڑھاتے تھے، ہم نے ہدیہ سعیدیہ اور میبذی انھیں سے پڑھی تھیں اور بعض دوسری کتابیں بھی۔

مدرسہ میں والی بال.........................

جب ہم لوگ طلبہ میں متعارف ہوئے اور ہمارا اعتماد بڑھنے لگا تو طلبہ میں ہم لوگوں کو ایک طرح کا امتیاز اور ایک طرح کی خصوصیت حاصل ہوگئی، اس کی کئی بنیادی وجہیں تھیں، ذہانت وفطانت کی بات میں تو خودستائی اور پندار کی جھلک آجاتی ہے اور ان دونوں باتوں سے مجھ کو ہمیشہ نفرت رہی، ظاہری وجوہ میں ایک وجہ یہ تھی کہ تمام طلبہ اور اساتذہ بالعموم تہبند باندھتے تھے، ہم دونوں ہمیشہ پاجامہ پہنتے تھے، کبھی اوقاتِ درس میں لنگی نہیں پہنی، اور نہ لنگی باندھ کر درسگاہ میں گئے، یہ میرا بچپن سے مزاج بن چکا تھا یہ ذہن ومزاج کبھی نہیں بدلا۔

دوسری ظاہری وجہ یہ تھی کہ تمام طلبہ مادری زبان بولتے تھے حتیٰ کہ اساتذہ سے بھی وہ اسی بولی میں بات کرتے تھے، اگر اُردو بولنے کی غلطی کرتے تو ان کی اُردو اور مضحکہ خیز ہوجاتی، ہم نے مادری زبان کبھی نہیں استعمال کی، نہ کمرے میں نہ درسگاہ میں نہ عام محفل میں، ہم لوگ صاف ستھری سادہ اردو استعمال کرتے اور وضعداری کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے۔

تیسری بات یہ تھی کہ اکثر لڑکے اَطراف کے دیہاتوں کے تھے، ان کی وضع قطع، نشست وبرخاست، آدابِ مجلس، رکھ رکھاؤ میں اس کی بوباس رہتی تھی، ہم نے اپنی وضعداری کو باقی رکھا اور اپنے آپ کو ایک حد تک لئے دیئے رہتے تھے اور اپنی سطح سے نیچے اترنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے، اس لئے تمام طلبہ اور اساتذہ میں وقعت

واعتبار حاصل تھا۔

ہم نے طلبہ کے سامنے تجویز رکھی کہ عصر کے بعد باہر گھومنے کے بجائے مدرسہ میں والی بال کھیلا جائے تاکہ وقت پر مغرب کی نماز مدرسہ کی مسجد میں ادا کی جاسکے، تمام طلبہ اس تجویز سے متفق ہوگئے، اب سوال یہ تھا کہ بال اور جال کہاں سے اور کیسے آئے، اس زمانہ میں لڑکوں کے پاس پیسے بالکل نہیں رہتے تھے، پھر گاؤں دیہات کے لڑکوں کے پاس تو رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، مشورہ ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب سے درخواست کی جائے، مگر درخواست کون کرے؟ طلبہ نے میرا نام تجویز کیا۔

قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند

حضرت مہتمم صاحب سے تمہید کے بعد میں نے درخواست کی کہ اگر نیٹ اور بال کا انتظام ہوجائے تو لڑکے بازاروں میں گھومنے پھرنے سے بچ جائیں گے، یہیں تفریح ہوجائے گی، ہم صحن مدرسہ میں والی بال کھیل لیں گے، مولانا موصوف پہلے تو مسکرائے کہ کھیل کود کی قانونی اجازت بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور مدرسہ سے ہی اخراجات بھی لینا چاہتا ہے، مگر بغیر جرح وقدح بڑی بشاشت اور خوشی کے ساتھ درخواست منظور فرمائی اور سارا بندوبست بھی فرمادیا، اعظم گڈھ شہر سے بال اور نیٹ آگیا، مدرسہ کے صحن میں بانس گاڑکر جال لگادیا گیا اور والی بال شروع ہوگیا، تمام بڑے طلبہ پوری دلچسپی سے اس کھیل میں حصہ لینے لگے، کبھی کبھی حضرت مولانا شکراللہ صاحب مرحوم بھی کھڑے ہوکر ہمارا کھیل دیکھتے، ہم پوائنٹ انگریزی میں گنتے تھے، ایک دن مولانا نے فرمایا کہ عربی پڑھتے ہو عربی میں شمار کرو، مگر ہم لوگوں سے بات بنی نہیں، عربی اعداد کے استعمال میں زحمت معلوم ہوئی وہی انگریزی کی گنتی چلتی رہی۔

شاعری........................

ایک سال کامیابی سے یہاں گذر گیا، دوسرے سال بھی ہم احیاء العلوم ہی میں رہے، شعر وشاعری تو کیا تک بندی تو میں بہت پہلے سے کرر ہا تھا، اس سال میں کچھ زیادہ کہنے لگا، اصغر گونڈوی کے دو دیوان چھوٹے سائز میں بہت ہی معیاری کتابت وطباعت کے ساتھ صاف ستھرے ''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' کے نام سے شائع ہوئے تھے اور مدرسہ کی لائبریری میں موجود تھے، میرے مطالعہ میں دونوں دیوان بہت دنوں تک رہے، ان کے بہت سے اشعار مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے، اسی سال جگر مراد آبادی کا مجموعۂ کلام ''شعلۂ طور'' کے نام سے چھپ کر ملک میں پھیلا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، ہماری لائبریری میں بھی آیا، میں نے مستقل اس کو مطالعہ میں رکھا اور اس کے اشعار گنگنا تا رہتا تھا، انھیں اسباب کی وجہ سے میری فطرت میں جو شاعر سو رہا تھا وہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا، غزلیں لکھنی شروع کیں، گھاس پھونس جو سمجھ میں آتا وہ لکھتا رہا، اصلاح کبھی کسی استاد سے نہیں لی، سارا رطب ویابس کلام جمع کرتا رہا یہاں تک کہ غزلوں کا اچھا خاصا مجموعہ تیار ہو گیا، قاضی اطہر مبارکپوری کی بھی شاعری ان دنوں زوروں پر تھی، کچھ دوسرے طلبہ کو بھی شوق ہوا، وہ بھی تک بندی کرنے لگے اور میں ان کی غزلوں کی اصلاح کرنے لگا، اسی سال میری پہلی نظم رسالہ'' قائد'' مراد آباد کے صدیق نمبر میں شائع ہوئی، جس کے مدیر استاذِ محترم مولانا سید محمد میاں دیوبندی تھے، ایک معیاری مذہبی اور سیاسی رسالہ تھا، جب صدیق نمبر میں میری پہلی نظم چھپ کر آئی تو وہ صفحہ کھول کھول کر سیکڑوں بار پڑھی ہوگی، میں جب رسالہ کے اس صفحہ کو پلٹتا تھا جس پر نظم تھی تو آنکھوں کے سامنے مسرت کی پریاں ناچنے لگتی تھیں اور

کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ مبارکباد کا نغمہ گا رہی ہیں، میرا دماغ آسمان پر اُڑنے لگا، غرور، پندار کی بجلیاں ذہن میں لہرانے لگیں جبکہ وہ نظم ایک معمولی سی نظم تھی، شاید نوجوان جوڑے کا پہلا بیٹا ہو یا کسی نوعمر شاعر کی پہلی نظم کسی معتبر جریدے میں شائع ہو جائے تو دونوں کی خوشی یکساں اور برابر ہوتی ہے، کیونکہ بہرحال دونوں کا تعلق عمل تخلیق سے ہے۔

مدرسہ میں مشاعرہ........................

احیاء العلوم میں میری تعلیم کا دوسرا سال تھا اور تعلیمی سال کا آخری مہینہ چل رہا تھا کہ میں نے مدرسہ میں مشاعرے کا پروگرام بنایا، یہ مشاعرہ طلبہ کا مخصوص مشاعرہ تھا، نہ سامعین باہر کے تھے اور نہ شعراء، اسوقت تک درجنوں طلبہ میری تحریک اور حوصلہ افزائی پر تک بندیاں کرنے لگے تھے، مصرع طرح آج بھی مجھے یاد ہے۔

نہ شاخِ آشیاں اپنی نہ صحنِ گلستاں اپنا

میں نے مشاعرہ کے لئے ایک غزل لکھی اور ایک ہزل، ہزل میں طنز کچھ گہرا ہو گیا جس نے بالآخر مجھے احیاء العلوم سے نکلوایا، جب سالانہ امتحان ختم ہوا تو میں گھر آ گیا، رمضان میں مولانا شکر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کارڈ آیا کہ آئندہ سال احیاء العلوم میں آنے کی زحمت نہ کریں، یہ بڑا شریفانہ اخراج تھا، وہ عمر امنگوں اور ترنگوں کی تھی، ۱۵؍سال کی عمر طوفان بدوش ہوتی ہے، ہر لمحہ دل و دماغ میں جذبات و ہیجانات کا تموج و تلاطم برپا رہتا ہے اور بدن کے ہر ہر عضو میں ایک برقی رو دوڑتی رہتی ہے، حوصلہ شکن حالات میں بھی بجلیوں کا یہ اضطراب کم نہیں ہوتا، کارڈ پڑھا ’’جائے خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست‘‘ زبان پر آیا اور کارڈ ایک طرف رکھ دیا البتہ گھر والوں کو اس کی خبر نہ ہونے دی، ویسے انھوں نے تعلیم کے معاملہ میں مجھے ایک دم

خودمختار کررکھا تھا، جو چاہوں کروں جہاں جی چاہے جاؤں اور پڑھوں، لیکن کارڈ دکھانے میں ایک پہلوخفت اور سُبکی کا بھی تھااس لئےعنفوان شباب کےمغرور دماغ کو اس سےٹھیس پہونچنے کا احتمال تھااس لئے احتیاط ضروری تھی۔

احیاءالعلوم کی لائبریری.........................

احیاءالعلوم مبارکپور کی اس دوسالہ زندگی نےعلمی اعتبار سے مجھے بہت زیادہ فائدہ پہونچایا، میرےعلم وشعور کی بلوغت یہیں ہوئی، ذہنی وفکری پختگی مجھے یہیں سے نصیب ہوئی، مطالعہ کا چسکا مجھے یہیں پڑا، لائبریریوں کی چھان بین، کتابوں کی جستجو، میٹر ومواد جمع کرنے کا سلیقہ میں نے یہیں سیکھا، غور وفکر کی ایک مستقل شاہراہ مجھے یہیں نظر آئی جس پر میں اپنی پوری زندگی چلتا رہا، میرے اوپر احیاءالعلوم کا ایک بڑا احسان ہے جس کا شکر یہ ادانہیں ہوسکتا، میری دلچسپی کی سب سے بڑی چیز احیاءالعلوم کی لائبریری تھی، یہ عام مدارس کے کتب خانوں کی طرح درسیات وشروح کے انبار والا کتب خانہ نہیں تھا غالباًاس لائبریری میں درسیات کی کتابیں بالکل نہیں تھیں، اس کا کتب خانہ علیٰحدہ تھا، اس لائبریری میں ہرعلم وفن کی کتابیں تھیں حتیٰ کہ سیکڑوں کی تعداد میں ناولیں، افسانوں کے مجموعے تمام مشہورشعراءقدیم وجدید کے دواوین، اس دور کےمشہور ومعیاری ادبی رسالوں کے خاص نمبراور سالنامےاورافسانہ نمبر یہاں موجود تھے، ادبی رسالوں سے چاروں طرف بنی ہوئی بریکٹ بھری ہوئی تھی، مجھے ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے دلچسپی تھی، یہ دلچسپی بھی اسی لائبریری کی وجہ پیدا ہوئی، سلطنت مغلیہ کا عہدزوال اور کمپنی کی حکومت میری فکر ونظر کا محور بن گئی، ہندوستان کی ڈیڑھ سوسالہ دور کی تاریخ پرکوئی کتاب مل گئی تو حرفاً حرفاًاس کو پڑھنا میرے لئےضروری تھا، مجھے پہلے پہل مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب ’’دی آورسائڈ آف دی ماڈل‘‘ یعنی غدر

۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ، مجھے اسی لائبریری میں ملی، اس کا ترجمہ شیخ حسام الدین امرتسری نے کیا تھا، اس کتاب کو درجنوں بار میں نے اول سے آخر تک پڑھا تھا اور بہت سے نوٹ لئے، طفیل احمد منگلوری کی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' اسی دور میں چھپی تھی، جس میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق اہم معلومات تھیں، یہ کتاب اس کی نظریاتی تاریخ تھی اسی لائبریری میں پڑھی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی کی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' پانچ جلدوں میں اسی زمانہ میں شائع ہوئی تھی، چار جلدیں میں نے وہیں پڑھیں، چوتھی جلد حکومت نے ضبط کرلی تھی اور مصنف کو جیل جانا پڑا تھا، وہ جلد مجھے بعد میں ملی اور پڑھی، ایک کتاب باری علیگ کی کمپنی کی حکومت، تازہ تازہ چھپ کر آئی تھی حرفاً حرفاً پڑھ ڈالا حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی سوانح حیات سلطنت خداداد میسور کی تاریخ جسے محمود بنگلوری نے لکھا تھا اور سیکڑوں انگریزی کتابوں کی مدد سے لکھا تھا یہ کتاب بھی پڑھ ڈالی جو آٹھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل تھا اتنی بار پڑھی کہ پوری تاریخ ذہن پر نقش ہوگئی اور بعد میں یہ کتاب لاہور سے منگا کر اپنی لائبریری میں رکھ لی۔ حکیم نجم الغنی رام پوری کی کتاب تاریخ اودھ جو بڑے سائز کی پانچ ضخیم جلدوں میں ہے، شائع ہوچکی تھی پانچوں جلدیں بار بار پڑھیں اور اسکی مدد سے کئی مضامین لکھے جو شائع ہوئے، پھر میں نے اپنی ذاتی کتاب منگائی جو آج بھی میرے پاس ہے غرضیکہ ہندوستان کی اس ڈیڑھ سو سالہ تاریخ پر کوئی کتاب دریافت ہوئی اور لائبریری میں رہی تو میں نے اس کو ضرور پڑھا ہوگا سرسید کی تحریک، ندوہ کی تحریک، کانگریس کی تاریخ، خانوادہ ولی اللٰہی کی علمی تحریک کا ذخیرہ معلومات مجھے احیاء العلوم اسی لائبریری سے ملا، دوسرے سال جب میں نے ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں کو پڑھنا شروع کیا تو ہر کتاب کے مجموعی صفحات نوٹ کرتا جارہا تھا، سال

کے آخر میں ان کو جوڑا تو نوے ہزار صفحات سے زائد تھا، میں نے ایک سال میں اتنے صفحات پڑھے تھے اور ایک سبق کا بھی ناغہ نہیں کیا تھا، رسالوں کے خاص نمبروں اور افسانہ نمبروں کا مطالعہ اس کے علاوہ تھا، خاص طور پر لاہور کا ادبی رسالہ ''عالمگیر'' بڑا شاندار اور معیاری تھا، بڑے سائز میں نکلتا تھا، اس کے بہت سے خاص نمبر لائبریری میں تھے اور میں نے پڑھے، غدر ۱۸۵۷ء کے حادثہ پر خواجہ حسن نظامی کی دہلی کی ٹکسالی زبان میں اور دوسرے مصنفین کی درجنوں کتابیں لائبریری میں موجود تھیں، یہ ساری کتابیں میں نے از اول تا آخر پڑھی ہیں، اکابر کی تربیت اور میرے سیاسی رُجحان نے میرے مطالعہ کی ایک خاص سمت متعین کردی تھی، میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کتابوں کا مطالعہ کرتا جن میں کمپنی کی حکومت کے ابتدائی دور سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے رنگون جلاوطن کرنے اور واجد علی شاہ والیٔ اودھ کے مٹیا برج کلکتہ نظر بند کئے جانے تک کے حالات تھے، وہیں مجھے ایک اور دلچسپ کتاب ''تحفۃ الھند'' کے نام سے ملی، اس کے مصنف مولانا عبید اللہ سندھی پائلی ہیں، وہ ہندو سے مسلمان ہوئے تھے، ایک مولانا عبید اللہ سندھی اور تھے جو شیخ الہند کے شاگرد تھے اور ریشمی رومال تحریک کے ہیرو تھے، انھوں نے سکھ مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا۔

اس کتاب میں ہندو مذہبیات کی ایسی ایسی حیرتناک کہانیاں اور روایات ملیں کہ پھر وہ تفصیلات کبھی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملیں، کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں اس کتاب کی اشاعت پر پابندی تھی، صحیح صورتحال مجھے معلوم نہیں۔ اس زمانہ میں دہلی کی ٹکسالی زبان لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، اشرف صبوحی، خواجہ شفیع مرزا فرحت اللہ بیگ، میاں بشیر احمد، ناصر نذیر فراق وغیرہ کی ادبی تحریروں سے خاص دلچسپی تھی، بعد کے دور میں سب سے زیادہ اثر مجھ پر مقالات شبلی نے ڈالا۔

دارالعلوم مئو میں.........................

عید کے بعد جب مدرسے کھلنے لگے، تو میں نے گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ اس سال میں دارالعلوم مئو میں داخلہ لوں گا، والد صاحب کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا، انھوں نے کہا جہاں چاہے پڑھو، وہ میرا تعلیمی ذوق وشوق دیکھ رہے تھے اس لئے مطمئن تھے، کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی، گھر کے ہر کام سے مجھے آزاد کر رکھا تھا، انھوں نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک پڑھ کر فارغ نہیں ہوگا تب تک اس پر کوئی گھریلو ذمہ داری نہیں ڈالی جائے گی ۔ شوال میں داخلہ کے لئے دارالعلوم مئو گیا، حضرت قاری ریاست علی صاحب صدر المدرسین نے داخلہ کا امتحان لیا، سب سے پہلے انھوں نے ادب کی کتابوں کا امتحان لیا، میں نے سبعہ معلقہ اور دیوان حماسہ کا نام بتایا تھا، انھوں نے امرؤالقیس کا قصیدہ نکالا، مجھے پورا قصیدہ زبانی یاد تھا، بستر پر لیٹ کر پورا قصیدہ گنگناتا رہتا تھا، عمر کا یہ دور بھی ہیجانی تھا اور قصیدہ کے اشعار اس ہیجان کو اور کئی گنا بڑھا دینے والے تھے، امرؤالقیس نے پردے کی بات کو بے پردہ کیا تھا جو عمر کے اس دور کے تقاضوں کے عین مطابق تھا، اس لئے اس کے اشعار نوکِ زبان تھے، اس کا یہ شعر کیسے کوئی بھول سکتا ہے

إلىٰ مثلها يرنو الحليم صبابة
إذا ما اسبكرت بين درع وتجول

میری طالب علمی کے زمانے میں ایک شاعر نے اس کا ترجمہ اردو میں کردیا تھا جو مدینہ بجنور کے خاص نمبر میں ''جوانی'' کے عنوان سے چھپا تھا۔

حلقہ سے مشائخ کے نکل آتی ہیں آنکھیں
جس راہ پہ بن ٹھن کے نکلتی ہے جوانی

حضرت قاری صاحب نے ایک جگہ انگلی رکھ کر فرمایا کہ پڑھئے، میں نے شعر پڑھا بامحاورہ ترجمہ کیا، مطلب بیان کیا اور پھر تشریحِ لُغوی کی اور پڑھتا چلا گیا، نہ کہیں کاما، نہ ڈیس، نہ فل اسٹاپ، حضرت قاری صاحب میرا منہ دیکھتے رہے، کہیں کوئی سوال کی میں نے گنجائش نہیں چھوڑی تھی، کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہمارے مدرسوں میں شعر کا پرانی اُردو میں لفظی ترجمہ کرانے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور کچھ نہیں، میں نے اس سے کہیں زیادہ باتیں بتادی تھیں۔

پھر انھوں نے دیوان حماسہ نکالا، یہ درس وتدریس میں بڑی مشکل کتاب سمجھی جاتی تھی، انھوں نے چھوٹی بحر والی وہ نظم نکالی جو اتفاق سے زبانی یاد تھی، وَدَفَّاهُمْ كَمَا دَانوا والی، بالکل اسی طرح سنائی جیسے سبعہ معلقہ سنا چکا تھا، بقیہ کتابوں کا امتحان ختم، پوچھنے لگے کہاں پڑھا ہے؟ کس استاد سے پڑھا ہے؟ مرعوبیت تو کبھی جانی ہی نہیں، اس طرح باتیں کرتا رہا جیسے عام دوستوں میں ہوتی رہتی ہیں، بہت متاثر ہوئے ،فرمایا جایئے آپ کا داخلہ مطلوبہ جماعت میں ہوگیا، مجھے بعد میں بتانے والوں نے بتایا کہ حضرت قاری صاحب نے دارالاہتمام میں جانے کے بعد فرمایا کہ ایک لڑکا ایسا یا ہے جو مدرس ہونے کے لائق ہے، اپنے بارے میں کبھی کبھی ایسی باتیں سنتا رہتا تھا مگر میرے ذہن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، تعلّی، غرور، خودنمائی، میری فطرت، میرے مزاج بلکہ افتادِطبع کے خلاف ہمیشہ سے ہے، میں نے اپنی شرافت کے دامن کو ان نجاستوں سے کبھی آلودہ ہونے نہیں دیا، میں ان معاملات میں انتہائی لاپرواہ، بے نیاز رہا، کھلنڈرا پن ذہن ومزاج پر ایسا حاوی تھا کہ فخر وغرور کی کبھی ہوا نہیں لگنے پائی، کبھی کبھی کوئی ایک دوسرے سے اتفاقاً اتنا متاثر ہوجاتا ہے کہ اس کی تعریف میں رَطب اللسان ہوجاتا ہے، حالانکہ وہ جن باتوں سے متاثر ہوا ہے وہ متاثر کرنے والی

شخصیت کا بنیادی عنصر نہ ہو، یہی وہ سال ہے جب ہمیشہ کے رفیق وہم درس مولانا محمد قاسمی مجھ سے جدا ہوئے ، انھوں نے مفتاح العلوم میں داخلہ لیا، اور میں دار العلوم میں آ گیا۔

تقسیمِ اسباق........................

ہماری مشکوٰۃ شریف کے استاد مولانا عبد الرشید الحسینی تھے ، مئو کے رہنے والے تھے، رنگ بہت صاف، گورے چٹے ، گھنی کھچڑی داڑھی ، پچپن چھپن کی عمر رہی ہوگی ، چشمہ لگاتے تھے، بہت ہی ہنس مکھ، بہت پُر مزاح اور ظریف ، کبھی کبھی تو ایسے الفاظ استعمال کر جاتے جو ان کے وقار اور منصب کے شایانِ شان نہ ہوتا ، یہ ان کی ظرافت کی انتہا تھی ، بہت لسّان ، حاضر جواب ، درس کی تقریر اتنے جوش وخروش اور بلند آواز سے کرتے تھے کہ چہرہ سرخ ہو جاتا تھا، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی شرح مشکوٰۃ ''**التعلیق الصبیح**''نئی نئی چھپ کر آئی تھی اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ، اس لئے ہر حدیث پر بہت مفصل اور مبسوط کلام کرتے اور مدلل کرتے تھے، اس لئے ان کے درس میں دلچسپی آخر تک باقی رہتی تھی ۔

جلالین شریف کے استاد حضرت قاری ریاست علی صاحب بحری آبادی تھے، اب انھوں نے مئو کو وطن ثانی بنالیا تھا ، دار العلوم مئو میں ابتداء سے انتہاء تک تعلیم حاصل کی ، اور فراغت کے بعد دار العلوم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، آخر عمر میں کینسر ہو گیا تھا، گھنی لمبی داڑھی ڈاکٹروں نے منڈوادی تھی ، پہچان میں نہیں آتے تھے، بستر مرض پر اس صدمے سے روتے رہتے تھے، بالآخر جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، آپ کی طبیعت میں ظرافت تھی ،تقریر کرتے کرتے ایک دو لفظ مئو کی بولی کے کہہ جاتے اور اس انداز سے کہتے کہ پورا حلقہ درس قہقہہ زار ہو جاتا تھا، طلبہ

میں شہرت تھی کہ جلالین شریف بہت عمدہ پڑھاتے ہیں، اتفاق سے میری ایک کتاب صدرا بھی انھیں کے پاس گئی، کوئی مدرس اس کتاب کو پڑھانے کے لئے تیار نہیں تھا، اس کتاب میں میرے علاوہ دو ساتھی اور تھے، بس تین نفر کی جماعت تھی، ابھی چند ہی دن سبق ہوئے تھے کہ ایک دن فرمانے لگے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کتاب نہیں سمجھا پا رہا ہوں، اس لئے یہ کتاب بند کر دی جائے تو کیا حرج ہے؟ میں نے عرض کیا کہ کوئی حرج نہیں، یہ کتاب آئندہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں کھڑا کرے گی، صدرا بند ہوگئی، بقیہ کتابوں کے اَسباق حسب معمول چلتے رہے اور ششماہی امتحان آ گیا، اس منزل سے چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ ایک طوفان میری راہ میں منتظر کھڑا ہوا تھا۔

طوفان انتظار میں تھا.........................

ہماری مشکوٰۃ شریف کے استاد مولانا عبدالرشید الحسینی بہت خوشحال اور مالدار آدمی تھے، ان کا اپنا بہت اچھا کاروبار تھا، ان کو ملازمت کی ضرورت نہیں تھی محض علمی سلسلہ کو جاری رکھنے کے خیال سے دارالعلوم میں مدرسی قبول کر لی تھی، ان کی تنخواہ ان کی حیثیت سے بہت کم تھی، مولانا موصوف نے انتظامیہ سے کہا کہ میری تنخواہ میں اتنا اضافہ کر دیجئے اور رجسٹر میں اسی اضافہ کے ساتھ میری تنخواہ لکھی جائے اور ادائیگی کے وقت اضافہ والی رقم میری طرف سے مدرسہ میں جمع کر لی جائے، میں کبھی اس اضافہ کا طالب نہیں ہوں گا، مجھے لوگوں کو اپنی تنخواہ بتاتے ہوئے حجاب آتا ہے، مدرسہ کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے مگر انتظامیہ نے اس کو منظور نہیں کیا، ان کے دل کو ٹھیس پہونچی کہ اتنی بے اعتنائی کے ساتھ میری بات ٹھکرا دی گئی، بادل ناخواستہ استعفاء دیدیا، ستم یہ ہوا کہ انتظامیہ نے فوراً استعفاء منظور بھی کر لیا جیسے وہ اس استعفاء کے منتظر ہی تھے، اصل راز یہ تھا کہ دارالعلوم پر حضرت تھانوی کے سلسلے اور حضرت فتح پوری کے مریدین

ومتوسلین کا قبضہ تھا، مولانا عبدالرشید صاحب اپنے کو حسینی کہتے تھے، اور مولانا حسین احمد مدنی سے عقیدت وارادت رکھتے تھے، اس لئے وہ انتظامیہ کے لئے قابل قبول نہ تھے مگر ان کی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے رکھ لیا گیا تھا اس لئے انھوں نے جب استعفاء دیا تو پہلی فرصت میں اس کو منظور کرلیا گیا اور اپنے حلقہ میں مدرس کی تلاش شروع کردی اور جلد ہی مل بھی گئے۔

کئی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ایک بہت لائق استاد مل گئے ہیں جنھوں نے الہ آباد بورڈ کے امتحان میں ٹاپ کیا ہے، وہی مولانا عبدالرشید صاحب حسینی کی جگہ پر رکھے جائیں گے، یہ افواہ نہیں حقیقت تھی، جلد ہی ایک تاریخ مقرر ہوگئی کہ فلاں تاریخ کو حضرت مولانا نظام الدین صاحب مشکوٰۃ شریف کے درس کا آغاز فرمائیں گے، جس صبح کو ان کا درس ہونا طے تھا اس سے پہلی رات کو عشا کے وقت مولانا عبدالرشید صاحب مرحوم میرے کمرے پر یک بیک آ گئے، استعفاء کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ انھوں نے احاطہ دارالعلوم میں قدم رکھا تھا، میں نے کھڑے ہوکر استقبال کیا اور سلام ومصافحہ کیا اور کہا تشریف رکھئے، انھوں نے بیٹھتے ہی فرمایا کہ کل نئے مدرس کے یہاں تم لوگوں کی مشکوٰۃ کا سبق ہوگا، میں نے عرض کیا سنا تو ایسا ہی گیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ ایسا کرو کہ وہ درس دینے میں کامیاب نہ ہوسکیں، میں شاگرد وہ استاد اور وہ بھی شفیق استاد، بات سن لی کوئی جواب نہیں دیا، اتنا کہہ کر وہ اُٹھے اور فوراً چلے گئے، یہ طوفان کی آمد کا اعلان تھا۔

طوفان آ گیا........................

وقت مقررہ پر نئے استاد تشریف لائے، خوب گورے چٹے، وجیہ وشکیل اور باوقار، صاف شفاف سفید لباس، باریک ململ کا کرتا، چھالٹی کا مولویانہ پاجامہ، ہشت

پہل سفید کپڑے کی ٹوپی، آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا، یہ وجاہت طلبہ کو مرعوب ومتاثر کرنے کے لئے کافی تھی، وہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید باختصاص تھے، اس لئے ان کا ادب واحترام سارے اساتذہ اور خود حضرت ناظم صاحب کرتے تھے، غربی سمت کا آخری کمرہ ان کی درسگاہ تجویز ہوئی، درسگاہ کی صفائی کی گئی، پورے کمرے میں دودھ کی طرح سفید دھلی ہوئی چاندنی بچھائی گئی اور بڑا اہتمام کیا گیا، مولانا نظام الدین صاحب مسند درس پر متمکن ہوئے، آج ان کے درس کا افتتاح تھا اس لئے بڑے اہتمام سے یہ تقریب منائی جارہی تھی، حضرت ناظم صاحب، صدر مدرس صاحب، مولانا قمر الزماں صاحب اکابر اساتذہ دارالعلوم پہلے درس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے، پھر ہم لوگوں کو مطلع کیا گیا کہ مشکوٰۃ لے کر آجائیں، اس سال مشکوٰۃ شریف میں پندرہ سولہ طلبہ تھے، جب ہم لوگ درسگاہ میں پہونچے تو بڑا مرعوب کن منظر دیکھا اور شاید بالقصد ایسا ماحول بنایا گیا تھا کہ طلبہ کی زبان نہ کھل سکے، جب اطمینان سے پوری جماعت بیٹھ گئی تو حکم ہوا پڑھئے، اس دن بالقصد میں نے عبارت خوانی کی، پہلی حدیث پڑھی:

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، قال خط لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطاً، ثم قال: ھٰذا سبیل اللہ، ثم خط خطوطاً عن یمینہٖ وعن شمالہٖ وقال: ھٰذہ سُبُلٌ، علیٰ کل سبیل منھا شیطان یدعو إلیہ م قرأ: وَأَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْماً فَاتَّبِعُوْہُ (الآیۃ)

حدیث صاف اور سادہ تھی، کسی مختلف فیہ مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، نہ فنی حیثیت سے روایت پر کوئی کلام تھا، مولانا نظام الدین صاحب نے تقریر فرمائی،

زبان میں لکنت تھی، تسلسل کے ساتھ روانی سے نہیں بول سکتے تھے، اس لئے اٹک اٹک کر تقریر فرمائی، جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکے تو میں نے عرض کیا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے علاوہ بھی خدا تک پہونچنے کے اور بھی راستے ہیں اور دوسرے مذاہب کو بھی ایک حد تک تک حق کہا جاسکتا ہے، وہی وحدت اَدْیان والے نظریہ کی میں نے وکالت کی، انھوں نے فرمایا وہ کیسے؟ میں کہا صراطِ مستقیم کے لفظ سے خود معلوم ہوتا ہے، ان کو اورا چنبھا ہوا کہ یہ تو قرآن کا لفظ ہے، فرمایا اعتراض کی وضاحت کیجئے، میں نے عرض کیا جب تک متعدد راستے نہ ہوں جیسا کہ حضور ﷺ نے متعدد خطوط کھینچ کر بتایا تب تک یہ کہنا کہ یہ سیدھا راستہ ہے، صحیح نہیں ہوسکتا، روزمرہ کے لحاظ سے بھی اور زبان وبیان اور فصاحت وبلاغت کے اصول سے بھی اس کا استعمال درست نہیں ہوسکتا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب پر بھی عمل کر کے خدا تک پہونچا جاسکتا ہے، اب ان کو پسینہ آنے لگا، کچھ گھبراہٹ اور آنکھوں سے بےبسی وبیکسی کے سائے نظر آنے لگے، دوسرے اساتذہ نے آنکھوں کے اشارے سے منع کیا، لیکن طالب علمانہ کٹ حجتی مشہور ہے، میں اعتراض در اعتراض اور جواب در جواب میں گھیرے رہا، دوسرے اساتذہ کی طرف سے صرفِ نظر کرلیا۔ میرا اعتراض صاف اور واضح لفظوں میں ہوتا تھا، اور ہر ایک کی سمجھ میں آتا تھا، استاد محترم کا جواب قطعی غیر تسلی بخش اور ناقابل فہم ثابت ہوتا رہا، آخر عاجز آگئے اور خاموش ہوگئے، ناظم صاحب نے ایک حدیث پر سبق بند کرادیا اور ہم لوگ چپ چاپ اٹھ کر چلے آئے، اساتذہ حضرات دیر تک درسگاہ میں بیٹھے رہے، آپس میں کیا باتیں ہوئیں؟ کیا مشورے ہوئے؟ کچھ معلوم نہیں، البتہ مشکوٰۃ کا سبق ان سے لے لیا گیا، تیسرے دن کا واقعہ ہے، میں لائبریری میں جارہا تھا جو دوسری منزل پر تھی، اس کا زینہ مولانا

موصوف کی درسگاہ سے ملا ہوا تھا، میں جوں ہی وہاں پہونچا تو کمرے سے آواز آئی، سنئے! میں رُک گیا اور درسگاہ کے دروازے پر کھڑا ہوگیا، ان کے سامنے دس بارہ چھوٹے بچوں کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی اور کوئی اُردو کی کتاب ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی، انھوں نے فرمایا کہ ایک شعر میں یہ مصرعہ ع

اگر اکسیر کو اکسیر گر مارا تو کیا مارا

اس میں لفظ ''اگر'' دو جگہ کیوں ہے؟ میں نے کہا دوسرا ''اکسیر گر'' ہے یعنی اکسیر بنانے والا، فوراً گردن جھکالی، میں لائبریری میں چلا گیا۔

اے روشنئ طبع تو بر من بلا شدی......................

مشکوٰۃ شریف کے سبق میں جو گستاخیاں کر چکا تھا تو اس کی سزا تو بھگتنی ہی تھی، میرا نام انتظامیہ کی بلیک لسٹ میں لکھ لیا گیا تھا لیکن انتظامیہ کے پاس کوئی بہانہ نہیں تھا کہ وہ مجھے سزا دے، اتفاق سے اس کو موقعہ ہاتھ آ گیا۔

گرمیوں کے دن تھے، میرے کمرے کے سامنے مسجد کا حوض اور وضو خانہ تھا، طلبہ حوض کے کنارے بیٹھے غسل کر رہے تھے، لوٹے ان کے ہاتھوں میں تھے، ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے اور جب پانی سر پر لوٹے سے ڈالتے تو اس کا آدھا پانی پھر حوض ہی میں چلا جاتا تھا، ہنسی اور قہقہوں کا طوفان برپا تھا، اسی طوفانِ بدتمیزی میں حضرت ناظم صاحب آ گئے، انھوں نے یہ منظر دیکھا تو الف ہوگئے، انھوں نے بڑے گرم اور ترش لب ولہجہ میں فرمایا ''حرام کا کھاتے ہیں اور بدمعاشیاں کرتے ہیں'' میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سن رہا تھا، تمام لڑکے فوراً وہاں سے ہٹ گئے، ناظم صاحب کے غصہ کا پارہ اوپر چڑھتا چلا گیا انتہائی دل آزار بلکہ دلخراش سوقیانہ جملے مسلسل استعمال کرتے رہے، خوب صلواتیں سنائیں، جب سنا کر تھک گئے تو واپس تشریف لے گئے۔

اسٹرائک.........................

ناظم صاحب کے اس سوقیانہ اور بازاری جملوں نے میرے کانوں میں گرم سیسہ پلا دیا، میرے کمرے ہی میں چھپرا ضلع کے ایک بہت بڑے زمیندار گھرانے کا ایک لڑکا رہتا تھا، خوب صحتمند، ہٹا کٹا نوجوان تھا، مجھ سے ایک درجہ نیچے تھا، اس لئے میری بڑی عزت کرتا تھا، بڑا خوشحال اور بہت ہی خوددار تھا، مزاج میں زمیندارانہ بو باس تھی، میں نے کہا عبدالعلیم! تم نے سنا؟ ہم سب حرام خور ہیں، ناظم کے باپ کی کمائی کھاتے ہیں، میرا یہ جملہ فلیتہ میں آگ لگانے والا تھا، عبدالعلیم گرم ہوگیا، میرا یہی مقصد تھا، اس نے لڑکوں میں ہوا بنائی اور اشتعال دلایا، لڑکے متفق ہوگئے، طے یہ ہوا کہ کل سے اسٹرائک، اسباق بند، کوئی طالب علم درسگاہ نہ جائے، اگر جائے گا تو خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہے، علیم بڑا دبنگ قسم کا لڑکا تھا، دانت پیس کر بات کرتا تھا، متفقہ طور پر اسٹرائک کا فیصلہ ہوگیا، دوسرے دن اساتذہ اپنی اپنی درسگاہوں میں آئے، لڑکے حسب معمول کتابیں لے کر نہیں آئے، یہاں تک کہ کوئی طالب علم اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلا، انتظامیہ کے دو چار چمچے ہر مدرسہ میں رہتے ہیں، دارالعلوم میں بھی کئی بڑے چمچے تھے، ان کو بلا کر اساتذہ اور انتظامیہ نے صورتحال معلوم کی تو اساتذہ نے کمرے کمرے جا کر طلبہ کو جمع کرنے کی کوشش کی اور ان سے کہا کہ جو کچھ کہنا ہے چل کر کہو، جو شکایت ہے بیان کرو، شکایت دور کی جائے گی، دھیرے دھیرے لڑکے یکے بعد دیگرے دارالاہتمام میں آئے اور خاموشی سے بیٹھ گئے، خاموشی طول پکڑتی جارہی تھی، کون کہے کہ کل ناظم صاحب نے تمام طلبہ کو گالیاں دی ہیں اور ہم کو حرام خور کہا ہے، جب بار بار کے اصرار پر بھی کوئی نہیں بولا تو میں نے ساری رام کہانی سنا دی، عبدالعلیم نے اس کی تائید کردی، اس کے بعد میں نے کہا کہ جب تک تمام طلبہ سے

معافی نہیں مانگی جائے گی، اپنے الفاظ واپس لینے کا اعلان نہیں کیا جائے گا اسباق نہیں ہوں گے، اسٹرائک جاری رہے گی، عبدالعلیم نے اس کی بھی تائید کردی، اس کے ساتھ تین چار اور لڑکوں نے بھی تائید کی، مجلس ختم ہوگئی۔

اخراج........................

تین چار دنوں بعد ایک معذرت نامہ آویزاں کیا گیا تب اسٹرائک واپس ہوگئی اور اسباق شروع ہوگئے، انتظامیہ مطمئن ہوگئی کہ اب کوئی بڑا ہنگامہ نہیں ہوگا، اس نے اس دوران ایک بلیک لسٹ تیار کرلی تھی، دو ہفتوں کے بعد سات لڑکوں کا مدرسہ سے اخراج کردیا گیا جس میں پہلا نام میرا تھا اور دوسرا عبدالعلیم کا، وہ تو علی گڈھ طب پڑھنے چلا گیا اور میں گھر آگیا، والد صاحب کو ممکن ہے میرے اخراج کی اطلاع ملی ہو مگر مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، میں نے والدہ سے کہہ دیا تھا کہ میں دیوبند جاؤں گا اور گھر پر تیاری کروں گا، والدہ سیدھی سادی تھیں وہ میری وکیل بن گئیں، میں ان کی شفقتوں کے سایے میں چار مہینے آوارہ گردی کرتا رہا، تیاری کیا خاک کرتا، میرے پاس ایک کتاب بھی نہیں تھی، ساری کتابیں مدرسہ کی تھیں، میں خالی ہاتھ گھر آیا تھا، ادری میں اس وقت مشکوٰۃ، جلالین کا ملنا بھی دشوار تھا، گاؤں کی دلچسپیوں میں ہواؤں کے دوش پر چار مہینے اُڑ گئے، رمضان آیا اور چلا گیا عید آئی، وہ بھی رُخصت ہوگئی، تو ۷؍شوال کو مولوی محمد قاسمی اپنے ہمدم دیرینہ کے ساتھ دیوبند روانہ ہوگیا۔

دارالعلوم دیوبند میں چند دن........................

دیوبند کے سفر میں مولانا محمد قاسمی ہمسفر تھے، میری عمر کا سترہواں سال تھا، دارالعلوم میں نہ کسی سے تعارف، نہ کسی کے نام سفارش، نہ سفر سے کچھ زیادہ واقف، نہ دارالعلوم دیکھا، نہ اتنا لمبا سفر کیا، دارالعلوم دیوبند کے بارے میں صرف یہ تصور تھا وہ

ہمارا سب سے بڑا مدرسہ ہے، ٹرین دیوبند پہونچی، پلیٹ فارم سے باہر آئے، تانگہ لیا اور دارالعلوم پہونچ گئے، ہمارے وطن کے مولانا عبدالمجید مرحوم دارِ جدید کے کسی کمرے میں رہتے تھے، یہ نام ذہن میں تھا، دارِجدید میں پہونچ گئے، اتفاق سے ایک قدیم طالب علم نثار احمد غازیپوری مل گئے، پہلے سے کوئی تعارف نہیں تھا لیکن دونوں پورب کے رہنے والے بہت جلد تعارف اور بے تکلفی ہوگئی، انھوں نے پیشکش کی کہ سامان میرے کمرے میں رکھ دیں اور یہیں داخلہ تک قیام کریں، پھر دارالعلوم میں داخلے کی کارروائیاں چلتی رہیں، اس سال ہمارے ضلع اعظم گڈھ کے لڑکے خلافِ معمول کہیں زیادہ پہونچے تھے، ان میں سے اکثر متعارف تھے، ان میں سے کئی ایک پر میرا اثر بھی تھا وہ مجھ سے جھک کر ملتے تھے، آٹھ دس لڑکے پہلے ہی سے بے تکلف دوست تھے، جس کمرے میں ہمارا قیام تھا غالباً دارِجدید کا ۷۱ نمبر کمرہ تھا، کچھ صحیح یاد نہیں، ہماری وجہ سے تمام اعظم گڈھ اور غازی پور کے لڑکے اسی میں جمگھٹا لگائے رہتے تھے، ہنسی، قہقہے، مذاق، شعروشاعری، سگریٹ اور بیڑیوں کا شغل، ہر ذہن ومزاج کے لڑکے تھے، ایک بار رات میں شعروشاعری کی محفل گرم ہوگئی، واہ وا، سبحان اللہ کا شور برپا تھا کہ یک بیک خبر ملی کی شیخ الادب صاحب آگئے، یہ مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی تھے جو دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات تھے، اپنی تندمزاجی، سخت گیری، طبیعت کی سختی کے لئے پورے احاطہ دارالعلوم میں مشہور تھے، وہ دارالعلوم کے قدیم اساتذہ میں سے تھے، کچھ بہت زیادہ ذہین نہیں تھے، البتہ مطالعہ بہت کرتے تھے، دوہرا بدن، رنگ صاف، داڑھی سفید، ڈھیلا ڈھالا کرتا، مولویانہ پاجامہ، سر پر کھجور کی پتیوں کی پرانی ٹوپی، خاصے ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے، چہرے پر خشونت چھائی رہتی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سورج نے ان کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا، ممکن

ہے رات کے ستاروں نے ان کے تبسم کی بہاریں لوٹی ہوں، شاعری بھی کرتے تھے، اردو میں بھی اور عربی میں، عاشقی معشوقی والی شاعری، غزل مولویانہ ہوتی تھی، عربی میں لمبے لمبے قصیدے کہتے تھے، کئی کتابوں پر حواشی لکھے تھے جو درحقیقت ان کتابوں کی شروح کے اقتباسات ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دیوانوں میں شمار کئے جاتے تھے، یہی نسبت ان کی طاقت، ان کے رُعب داب، ان کی اُصول پرستی کا راز تھی، وہ ناظم تعلیمات بھی تھے اور ناظم امتحان بھی، طلبہ کے داخلے انھیں کی مرضی سے ہوتے تھے اور انھیں کی صوابدید سے تقسیم اسباق بھی، غرضیکہ وہ دارالعلوم دیوبند کے سردار پٹیل یعنی وزیر داخلہ تھے۔

خطرے کا سائرن بج گیا، ہم پر تو کوئی وحشت طاری نہیں ہوئی لیکن قدیم طلبہ کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا، کواڑ کی کنڈی کھول دی گئی، ذرا سی گردن کمرے میں ڈالی تو سگریٹوں اور بیڑیوں کی دھویں سے کمرہ بھرا ہوا تھا، جونہی ایک بھبکا ان کے چہرے پر لگا وہ بھنا اٹھے لاحول ولاقوۃ، لاحول ولاقوۃ کی تکرار کرتے ہوئے فوراً باہر نکال لیا، مولی صاحب مولی صاحب اس کمرے میں کہاں کے لڑکے ہیں، کسی بیوقوف لڑکے نے کہہ دیا کہ اعظم گڈھ کے لڑکے ہیں، وہ فوراً واپس ہوگئے اور پھر کچھ نہیں فرمایا، محاذِ جنگ پر کوئی احمق فوجی اپنا مورچہ دشمن کو بتادے تو دشمن کی بمباری سے بچ نہیں سکتا، اس مورچہ کا تہس نہس ہوجانا لازمی اور ضروری ہے، میں نے خطرے کی بوسونگھ لی، رفیق محترم مولانا محمد قاسمی سے کہا کہ دارالعلوم دیوبند میں پڑھنا ہمارے مقدر میں نہیں، کاتب تقدیر نے اس پر قلم کھینچ دیا، وہ بہت حوصلے کا دوست تھا، کسی موقعہ پر اس نے ہمت ہارنا جانا نہیں، اس نے کہا ''جائے خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست''، ہم نے داخلہ فارم کی خانہ پُری کر کے داخل کر دیا تھا، صرف امتحانِ داخلہ

کا انتظار تھا، امتحان تقریری ہوتا تھا۔ دوسرے دن جب داخلے شروع ہوئے تو ہم دونوں بھی پہونچے، وہ ایک چھوٹا سا احاطہ تھا، اس کے ایک کونے میں زینہ تھا جو دوسری منزل پر جاتا تھا، اوپر والے کمرے میں داخلہ کی کارروائی چل رہی تھی، نیچے طلبہ احاطہ میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے، دوسری منزل کے دروازے پر ایک چپراسی کھڑا تھا، وہ ممتحن کے حکم کے مطابق امیدوار کا نام لے کر پکارتا تھا، بڑی کریہہ آواز تھی، طلبہ اوپر جاتے رہے، چند منٹوں میں واپس آتے رہے، میں اپنی باری کا منتظر تھا، یہ کمرے ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ اعظم گڈھ کے تمام لڑکوں کا فارم شیخ الادب نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

چپراسی نے اپنی کرخت آواز میں پکارا ''نظام الدین اعظم گڑھی'' میں زینہ سے اوپر گیا، دیکھا، شیخ الادب سامنے پورے جاہ وجلال اور شانِ تیموری کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، دائیں بائیں ہر طرف کتابیں بکھری ہوئی ہیں، میں سلام کر کے سامنے بیٹھ گیا، پہلا سوال آپ اعظم گڈھ کے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جواب اثبات میں تھا، بھویں تن گئیں، چہرے کی خشونت کچھ اور بڑھ گئی، جیسے اندر کوئی لاوا پک رہا ہے اس کی آنچ چہرے پر آنے لگی، کتب خانہ کا کلرک وہیں کھڑا تھا، حکم ہوا فلاں کتاب نکالو، فلاں کتاب نکالو، وہ کتاب نکالتا رہا، ہاتھ سے پیٹ کر گرد جھاڑتا رہا اور سامنے رکھ دیتا، وہ بیچ کتاب کے بعد کا کوئی صفحہ کھولتے اور فرماتے پڑھئے، اس طرح انھوں نے تقریباً ایک درجن کتابیں نکلوائیں، ان میں منطق، فلسفہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی وبلاغت ہر فن کی کتابیں تھیں، یہ ساری کتابیں بوسیدہ وخستہ بادامی کاغذ کی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کی چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، کئی عربی کتابوں کا رسم الخط فارسی تھا، کتاب سامنے رکھی جاتی تو آپ یقین کر لیں کہ مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کس فن کی کتاب

ہے اور کون سی کتاب ہے؟ اس میں کیا بحث ہے؟ پتہ نہیں میں نے پڑھی بھی ہے یا نہیں، کبھی دیکھی بھی ہے یا نہیں؟ لیکن جوں ہی صفحہ کھول کر فرمایا پڑھئے فوراً آدھا صفحہ روانی کے ساتھ پڑھ دیا، پھر ترجمہ کر دیا، پھر فرمایا مطلب! ترجمہ کو ذرا کھینچ تان کر اور الٹ پھیر کر کے مطلب بھی بتا دیتا جبکہ میں خود ایک حرف نہیں سمجھ رہا تھا، لیکن میرا بے باکی سے پڑھنا، غلط صحیح روانی سے ترجمہ کر دینا نفسیاتی طور پر کچھ نہ کچھ اثر رکھتا تھا، اس لئے وہ بار بار کتابیں بدلتے رہے، میں نے سمجھ لیا کہ بزرگ آدمی ہیں بے انصافی کر نہیں سکتے، حق تلفی کر نہیں سکتے، فیل کریں تو کیسے کریں؟ کتابوں کی بار بار تبدیلی سے فیل کرنے کیلئے وجہِ جواز تلاش کر رہے تھے، کسی نہ کسی کتاب میں ان کو مل گئی ہوگی اور سنا دیا کہ داخلہ نہیں ہوگا۔

اس کے بعد تین چار لڑکے اعظم گڈھ کے اور آئے، سب کا داخلہ نامنظور، فارم رد کر دیئے گئے، مولوی محمد قاسمی کا بھی اسی دن فیصلہ تھا، جو اندیشہ تھا وہ یقین میں بدل گیا، طلبہ میں یہ بات گشت کر گئی کہ اعظم گڈھ کے سارے لڑکوں کو فیل کر دیا گیا، ان میں سے کئی ایک کا حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی سے رابطہ تھا، ان کے نام خط بھی لائے تھے، بات علامہ تک پہونچا دی، انھوں نے ان لڑکوں سے فرمایا کہ ناکام ہونے والے لڑکوں کو مغرب بعد میرے پاس لاؤ، ہم چاروں پہونچے تو فرمایا کوئی لڑکا دارالعلوم سے نہ جائے، دوبارہ امتحان ہوگا، دوسرے دن علامہ ابراہیم صاحب نے اعظم گڈھ کے دوسرے بقیہ لڑکوں کے فارم اپنے پاس منگوا لئے، بعد میں معلوم ہوا کہ بلا استثناء ہر لڑکے کا داخلہ ہو گیا، ہماری ناکامی نے دوسروں کی کامیابی کے راستے کھول دئے۔

خوشنوائی نے کہا ہم کو اسیرِ صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقہ میں اترنے والے

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے کوئی مولانا محمد ادریس صاحب تھے جو علامہ انور شاہ کشمیری کے مکان پر مقیم تھے، انھوں نے اپنی قیام گاہ پر بلا کر فرمایا کہ ڈابھیل چلو سارے اخراجات ہمارے ذمہ ہوں گے، لیکن میں اتنے لمبے سفر کے لئے تیار نہ تھا، دوسرے دن طلبہ سے مشورہ کیا کہ حدیث کہاں اچھی پڑھائی جاتی ہے، تمام رایوں کا خلاصہ یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں ترمذی شریف، مولانا حسین احمد مدنی کی مشہور ہے جو اس وقت مرادآباد کی جیل میں ہیں، اس سال کوئی دوسرا پڑھائے گا، مظاہر علوم سہارن پور میں ابوداؤد شریف بہت عمدہ پڑھائی جاتی ہے، اور بخاری شریف شاہی مرادآباد میں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ کی پورے ہندوستان میں مشہور ہے، فیصلہ ہمیں کرنا تھا کہ کہاں جائیں، دارالعلوم دیوبند جو اپنی عقیدت وارادت کا حرم تھا وہاں سے نکال دیئے گئے، سہارن پور کے مدرسہ سے ذہنی طور پر بہت دوری تھی کیونکہ ہم ابتداء ہی سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدتمندوں میں تھے اور مظاہر علوم پر حضرت تھانوی کے گروپ کا فولادی پنجہ تھا، اس لئے سہارن پور جانے کا تصور بھی دل میں نہیں آیا، یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہاں قانون اور اصول بہت ہیں مگر اندر غلاظت بھی کم نہیں ہے، اب تیسری جگہ مرادآباد تھی جہاں دل کھنچتا تھا، ہم نے فیصلہ کرلیا کہ حدیث مرادآباد میں پڑھیں گے۔

بہت بے آبرو ہوکر.......................

تیسرے دن اسی کمرہ نمبر ۱ے میں حضرت شیخ الادب کی شان میں ایک نظم لکھی اور سنائی جس میں اللہ میاں سے بھی شکوہ تھا، بس وہی ایک شعر یاد بھی ہے۔

آزر کے گھر پہ آگ کو گلشن بنادیا
اور اک آگ دی تو میرے گلستاں کے واسطے

دس بارہ شعروں کی نظم تھی، اس کو لکھ کر نوٹس بورڈ پر لگا دیا، سر شام کوئی ٹرین مراد آباد کیلئے چلتی تھی، اس کے لئے تانگہ کیا، پچیس تیس لڑکے رُخصت کرنے کے لئے آئے کہ

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

بہت سے لڑکے اسٹیشن تک آئے، راستہ بھر ہنسی مذاق، دل لگی چلتی رہی، ٹرین آئی اور جب سیٹ پر بیٹھ گئے تو میں نے کہا دوستو! اچھا اب رخصت، آخری شعر سن لو مرزا غالب کا مشہور شعر سنا کر خدا حافظ کہا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

شاہی مراد آباد میں........................

ہم لوگ مراد آباد پہونچ گئے، وہاں مئو کے دولڑکے مولوی محمد ہارون اور مولوی محمد شمیم پہلے سے موجود تھے، انھیں کے پاس اترے، دوسرے دن جامعہ قاسمیہ شاہی میں پہونچے، دورہ کے طلبہ کا داخلہ حضرت شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ خود کرتے تھے، ہم دونوں پہونچے تو آپ دار الحدیث میں تشریف فرما تھے ، ہم نے دیکھا کہ ایک بزرگ نورانی چہرہ، خوبصورت، وجیہ و شکیل، سر اور داڑھی کے سارے بال سفید، پیشانی سے تقدس اور بزرگی کا نور پھوٹتا تھا، سفید صاف شفاف لباس، سر پر پٹہ بال اس پر لکھنوی پلے والی دو پلی ٹوپی، سرخ و سپید چہرہ جیسے حضرت دحیہ کی صورت میں حضرت جبریل بیٹھے ہوئے ہیں، آپ کے سراپا پر نظر پڑتے ہی دل نے کہا کہ اس آستانے پر عقیدت کا سر خم کر دو، نگاہوں سے ان کے آستانہ جاہ وجلال کو بوسہ دو، آگے بڑھو اور قدموں کو چوم لو اور اس کے دامن تقدس پر عقیدت و محبت کے

سارے پھول نچھاور کردو۔

کچھ ایسی ہی پُرکشش آپ کی شخصیت تھی، مسکرا کر فرمایا'' کہئے'' عرض کیا، دورۂ حدیث میں داخلہ کے لئے اعظم گڈھ سے آئے ہیں، فرمایا بیٹھ جایئے، بیٹھ گئے، مشکوٰۃ نکالی اور کھول کر ایک جگہ پر انگلی رکھی اور فرمایا یہاں سے یہاں تک خوب غور سے دیکھ ڈالو، جلالین نکالی، ایک صفحہ کھول کر فرمایا یہاں سے یہاں تک دیکھ لو، دونوں کتابیں لے کر اُدھر بیٹھ جایئے، ہم نے حکم کی تعمیل کی، کتابیں لے کر ایک طرف بیٹھ گئے اور خوب غور سے مطالعہ کرتے رہے، ۱۵/منٹ بعد پاس بلایا اور فرمایا، پڑھئے، عبارت پڑھ دی، ترجمہ کردیا جو مطلب سمجھ میں آیا تھا بیان کردیا، مولوی محمد صاحب مرحوم نے بھی یہی کیا، درمیان میں ایک حرف بھی آپ نے نہیں فرمایا، خاموشی سے سنتے رہے، پھر کتاب بند کردی اور فرمایا کتابیں کتب خانہ سے نکلوا لیجئے، داخلہ ہو گیا، قیام وطعام کا بندوبست مہتمم صاحب کریں گے۔

جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد........................

ہمارا داخلہ دورۂ حدیث میں ہو گیا، مدرسہ شاہی کا دارالطلبہ محلّہ اصالت پورہ میں تھا، یہ ایک کرایہ کا مکان تھا، اس میں چند کمرے تھے، ایک وسیع آنگن تھا، پندرہ بیس طلبہ رہتے تھے، جب ہم دارالطلبہ پہونچے تو ہمارے ہم وطن مولوی محمد ہارون اور مولوی محمد شمیم کے علاوہ اُڑیسہ کا ایک جاوی طالب علم تھا بقیہ سب بہار کے طلبہ تھے، ہم دونوں نے بھی یہیں قیام کیا، ہم چاروں اعظمی لڑکے ایک بڑے کمرے میں رہتے تھے جس میں تین چار لڑکوں کی اور بھی گنجائش تھی، لیکن آخر سال تک ہم صرف چار ہی رہے، مدرسہ شاہی میں مطبخ نہیں تھا، تمام طلبہ اپنے طور پر یا مدرسہ کے تعاون سے لوگوں کے گھروں پر کھانا لینے جاتے تھے، ہم سے پوچھا گیا تو ہم دونوں کو بڑی شرم آئی

کہ برتن لے کر کسی کے گھر کھانا لینے جائیں مگر دوسری کوئی شکل نہیں تھی، دل پر جبر کرکے، غیرت وانا کا گلا گھونٹ کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم شب میں ایک وقت تو کھانا لینے جائیں گے لیکن دن میں نہیں، مدرسہ کی طرف سے کھانے کا وظیفہ تین روپئے ماہوار تھا، میں نے ایک وقت یعنی دن میں کھانا لینے سے انکار کردیا تھا اس لئے مجھے ایک وقت کا وظیفہ پورے مہینے کا ڈیڑھ روپیہ دیا گیا، بالکل یہی صورتحال مولوی محمد صاحب قاسمی کے ساتھ تھی، اس طرح ہم دونوں کو ملاکر تین روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا جس میں ہم دونوں کو ایک مہینہ گزارنا تھا، ہر ماہ کے ابتدائی دنوں میں جب وظیفہ کی رقم ملتی تھی تو پندرہ دنوں تک روکھا سوکھا دونوں وقت کھانا مل جاتا تھا اور بقیہ پندرہ دن تک صرف شام کو کھانا کھاتے تھے، دن میں دو تین پیسے کی کوئی چیز لے کر کھالیتے تھے اور پانی پی لیتے تھے، ناشتہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، پورے سال ناشتہ کی نوبت نہیں آئی، اس طرح ۲۴ رگھنٹوں میں صرف ایک بار پورا کھانا کھاتے تھے، یہی معمول سال بھر رہا، لیکن عمر کا یہ ایسا طوفانی دور تھا کہ کبھی اپنی مجبوریوں کا احساس نہیں ہوا اور نہ کبھی کسی سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا کیونکہ اس کے اظہار سے اپنی انانیت مجروح ہوتی تھی جو اس وقت بھی بہت عزیز تھی، دارالطلبہ میں کوئی نگراں نہیں تھا، اس لئے طلبہ ہمہ وقت آزاد رہتے تھے جہاں چاہیں جائیں یا پڑھیں یا گپ بازی کریں، درسگاہیں سب شاہی مسجد میں تھیں جس کا فاصلہ یہاں سے زیادہ تھا۔

اساتذہ اور درسگاہیں......................

جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد کا صحن بہت لمبا چوڑا تھا، جنوبی سمت میں مسجد کا صدر دروازہ تھا جو ایک رواں دواں سڑک پر کھلتا تھا، گیٹ سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک کمرہ ہے، یہ ہمارے استاد حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلیؒ کی درسگاہ

تھی، یہ ہماری کتاب مسلم شریف کے استاد تھے، کچھ دبتا ہوا قد، بھرا بھرا بدن، رنگ گندمی، دانت چھوٹے چھوٹے خوب ہموار، موتیوں کی طرح جڑے ہوئے، جاڑوں میں عمدہ سلی ہوئی گرم شیروانی، ہرے رنگ کا عمامہ پھر اس پر خوبصورت چشمہ، بہترین مقرر، باکمال مناظر، بہت ہی حاضر جواب، بہت روانی سے بولنے والے، سرگرم سیاست میں حصہ لیتے تھے، ایک بار اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے، مسلم شریف کے سبق میں ان کی طلاقت لسانی کا جوہر خوب کھلتا تھا۔

جب اس درسگاہ سے آگے بڑھئے تو آپ مسجد کے صحن میں پہونچ جائیں گے، اس صحن کے ایک دم شمالی جانب ایک سائبان نما درسگاہ ہے، یہاں مشہور اہل قلم اور مصنف حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی درس دیتے تھے، لمبا قد، دبلا پتلا جسم، رنگ خوب صاف بلکہ سرخی مائل، رُخسارے دھنسے ہوئے، آنکھوں پر بہت زیادہ پاور کا چشمہ، بال زیادہ سفید، داڑھی کھچڑی، سیدھا سادا کرتا اور پاجامہ، دیوبند کے بزرگوں کی طرح دوپلی ٹوپی، بہت کم سخن، رک رک کر بولتے تھے جیسے ہر دم کسی گہری سوچ میں رہتے ہیں، یہ ہمارے ترمذی شریف کے استاد تھے۔

مسجد کے کھلے ہوئے فرش کے جنوبی کونے سے ایک زینہ اوپر کی منزل پر جاتا ہے، جہاں جا کر یہ زینہ ختم ہوجاتا ہے وہ دارالحدیث کا دروازہ ہے، یہاں ہمارے جلیل القدر عظیم المرتبت استاد، مشہور محدث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ درس دیا کرتے ہیں، حضرت شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری کے علوم کے امین تھے، وہ کئی نسلوں کو احادیث کا درس دے چکے تھے، ہندوستان کے محدثین میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، اگرچہ ملک میں اور بھی حضرات درس حدیث میں امتیاز رکھتے تھے، کوئی ترمذی شریف، کوئی ابوداؤد شریف اور کوئی مسلم شریف کے درس کیلئے

مشہور تھے، لیکن **اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری** کے درس کا حق ادا کرنے والے ہندوستان و پاکستان میں صرف استاد محترم کی تنہا ذاتِ گرامی تھی، یہ اس دور کی ایک مسلمہ حقیقت اور تسلیم شدہ صداقت تھی، اس سے کسی کو مجال انکار نہیں تھا۔

بخاری شریف اور ابوداؤد شریف ہماری دونوں کتابوں کا درس آپ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا، تین گھنٹے روزانہ مسلسل درس دیتے تھے، دورۂ حدیث میں اس وقت یہی چار کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اس سال دورۂ حدیث میں ۵۴/طلبہ شریک تھے، جن میں ہم دو اعظم گڈھ کے، دو مرادآباد کے، تین بہار کے، سات آٹھ پنجابی اور پشاوری، اور بخاری اور بقیہ مغربی یوپی کے تھے۔

جمعیۃ الطلبہ ....

مدرسہ شاہی میں اس زمانہ میں طلبہ کی ایک انجمن تھی جس کا نام ''اصلاح البیان'' تھا، اس کی جانب سے ایک قلمی رسالہ ''البیان'' کے نام سے نکالا جاتا تھا، میں اس کا مدیر بنا دیا گیا، اس وقت مجھے لکھتے ہوئے کچھ دن گذر چکے تھے، عام طور سے میرے مضامین شائع نہیں ہوتے تھے لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے مضامین طالب علمانہ خامیوں سے پاک ہوتے تھے، اس لئے میں نے اس رسالہ میں بہت لکھا اور لمبے لمبے مضامین لکھے ہیں، یہی وہ زمانہ ہے جب شاعری کا جنون مجھ پر کچھ زیادہ سوار رہا، لمبی لمبی نظمیں لکھتا تھا، خدا جانے کس معیار کی ہوتی تھیں، اگر ان میں کچھ محفوظ رہ گئی ہوتیں تو اندازہ کرتا کہ کچھ شاعرانہ اُپج تھی یا صرف تک بندی تھی، خوش قسمتی سے میرا وہ سارا سرمایہ مرورِ ایام کی آندھیوں میں اُڑ گیا اور میری شاعرانہ رُسوائیوں سے محفوظ کر گیا۔

ایک طویل نظم ''بانگ سروش'' کے نام سے لکھی تھی، مسدس کے فارم میں تھی،

شکوہ جواب شکوہ کے انداز پر، جس میں سلطنت مغلیہ کے زوال سے لے کر اپنے عہد تک کی سیاسی تاریخ تھی، ۶۰ یا ۷۰ بند کی نظم تھی، اس کو ایک کتابچہ کی شکل میں خوشخط لکھ کر رفیق محترم مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اور رفیق مکرم مولانا عبدالمجید قاسمی سے پیش لفظ وغیرہ لکھوایا تھا، پھر پتہ نہیں وہ مسودہ کہاں گم ہوگیا، شاید مرادآباد ہی میں کسی اہل علم کے پاس ہو۔

طالب علمی کا آخری دور..............................

شاہی مرادآباد میں ہماری طالب علمی کا آخری دور تھا، میری عمر ۱۷ سال کی ہو چکی تھی، عمر کا یہ دور بڑا طوفانی ہوتا ہے، زندگی کے چمن میں بہارِ شباب کی آمد آمد کا ایک شور برپا تھا، جذبات کی بادِ صبا بتدریج بادِ صرصر میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی، دل اور دماغ امنگوں اور ترنگوں کی دھما چوکڑی، تمناؤں، آرزوؤں اور فطری تقاضوں کے جوش وخروش کی آماجگاہ بنتے جا رہے تھے، عجیب عجیب جذبات، حیرتناک خیالات کا ایک سمندر اندر ہی اندر لہریں لینے لگا تھا، کچھ انجان خواہشات، کچھ نئے نئے جذبات، آرزوؤں اور تمناؤں کی حسین اور شوخ پریوں کا رقص نگاہوں کے سامنے شروع ہو چکا تھا، وہ سجی سجائی دلہنوں کی طرح قطار در قطار نگاہوں کے سامنے آنے لگیں تھیں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر طرف رنگ ونور کی جھما جھم بارش ہو رہی ہے، راتوں کو خواب میں پریاں دل کے صحن میں اتر جاتیں اور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ایسی دنیا میں اُڑا لے جاتیں جن کو میں نے ابھی اس مادی دنیا میں نہیں دیکھا تھا، ایک نشہ، ایک سرور بلکہ جنوں میں میرا وجود ڈوبتا جا رہا تھا، خطرناک سے خطرناک اقدام کے لئے باغی اور سرکش دل مجبور کرتا تھا لیکن غنیمت یہ تھی کہ دل کی لگام ابھی عقل کی مضبوط گرفت میں تھی، اچھی صورتیں نگاہوں کو دعوتِ نظارہ ہی نہیں دیتی تھیں بلکہ آنکھوں کے راستے دل کو اپنا نشیمن

بنا لیتیں، شعر و شباب کا کوئی پیکر سامنے آیا تو دل اتنا تیز دھڑ کنے لگتا تھا جیسے تالاب کے ساکن پانی میں کوئی بڑا سا پتھر پھینک دیا جائے اور ہر طرف لہریں بنتی چلی جاتی ہیں، یہ سب کچھ بالکل غیر ارادی طور پر ہوتا تھا، ذہن، دل اور دماغ علم ومطالعہ اور تاریخ وسیاست کے دلدادہ تھے اور شب وروز اس جذبہ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، مگر جذبات کی کوئی تیز رَو آندھی آتی تھی اور اس کا رُخ پھیر دیتی تھی، جسم میں جو خاموش تبدیلیاں ہو رہی تھیں وہ اپنا اثر ڈال رہی تھیں، یہ تاثر بھی غیر اختیاری تھا، اس طرح میرے دل ودماغ دوانجانی طاقتوں کی باہمی آویزش کی رزم گاہ بن چکے تھے، کبھی عقل غالب آجاتی تھی اور کبھی دل اپنی فتح کا پرچم لہرانے لگتا تھا، میں خود تماشائی تھا یا خود تماشا بن گیا تھا، زندگی کے اس طوفانی دور میں چھوٹی بڑی غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں میں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا، بالکل ایسے ہی جیسے بہت تیز رفتار کار کسی درخت سے ٹکرا جاتی ہے جبکہ اسٹیرنگ پر ہاتھ ہوتا ہے مگر تیز رفتاری حادثہ کرادیتی ہے۔

قیام گاہ کی تبدیلی........................

مدرسہ شاہی کا دار الطلبہ محلّہ اصالت پورہ میں تھا، وہ قریشیوں کا محلّہ تھا، ہمارے کمرے کا دروازہ بالمقابل گھر کے محاذات میں تھا، بیچ میں دس فٹ کی گلی تھی، محلّہ کے دائرے میں باشندوں کی جو سرگرمیاں ہر جگہ رہتی ہیں یہاں بھی تھیں، البتہ کچھ زیادہ احتیاط نہیں برتی جاتی تھی، اس لئے نگاہوں کا تصادم، تبسم کی پھلجڑیاں کبھی کبھی اپنا اُجالا بکھیر دیتی تھیں، یہ لمحاتی اُجالا بھی ایک طالب علم کی زندگی میں خطرے کا الارم بن جاتا ہے، ہوش وحواس، تدبر وفراست کی ساری پیش بندیاں درہم برہم ہو جاتی ہیں اور اس کا خمیازہ بھگتنا ناگزیر ہو جاتا ہے، ہم چار اعظمی لڑکے اس کمرے میں رہتے تھے، اس سے متصل کمرے میں بہار کے طلبہ رہتے تھے جو ہم لوگوں کی

عمروں سے کہیں بڑے تھے، ان کی فطرت اور ذہن میں بہار کی آب و ہوا کا پورا پورا اثر تھا، نگاہیں اخلاق شکن، ان کے ارادے مجرمانہ اور طبیعت میں شر و فساد تھا، ایک موہوم رقابت کا زہر ان کے وجود میں سرایت کر گیا، انھیں میں سے کسی نے حضرت مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ سے ہماری شکایت کر دی، حضرت مہتمم صاحب عربی ذہن و مزاج کے صاف ذہن، صاف دل، صاف دماغ بزرگ تھے، معلوم نہیں کیسی زہر آلود شکایت کی گئی کہ بلا ثبوت و شہادت اور بغیر بیان صفائی لئے ان کی باتوں پر یقین کر لیا کہ ہمارے نام فرمانِ شاہی آ گیا کہ چاروں اعظمی لڑکوں کا اخراج کر دیا گیا، جب یہ حکمنامہ ہم لوگوں تک پہونچا تو مدرسہ شاہی آئے اور حضرت شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین احمد صاحب سے اپنی رودادِ غم بیان کی، حضرۃ الاستاذ کی ہم لوگوں پر شفقتیں اور عنایتیں بے پناہ تھیں اور ہم لوگ اس کو محسوس کرتے تھے اور اس کا کبھی کبھی مظاہرہ بھی ہوتا تھا، اس لئے یقین تھا کہ مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا، ساری تفصیل سننے کے بعد آپ نے فرمایا تم لوگ میرے طالب علم ہو، میرے لڑکے ہو، مدنی صاحب کون ہوتے ہیں نکالنے والے، تم لوگ میانوانی مسجد کے کمروں میں آ جاؤ، فرمانِ شاہی ہوا میں معلق رہ گیا اور ہم لوگ اصالت پورہ کے دار الطلبہ سے اُٹھ کر مدرسہ شاہی سے قریب میانوالی مسجد کے ایک کمرے میں آ گئے، یہاں غالبًا تین کمرے تھے، دو میں پنجابی و پشاوری لڑکے رہتے تھے، وہ ہم سے ایک دو درجے نیچے کے طالب علم تھے، ایک خالی کمرے میں ہم لوگوں نے ڈیرہ ڈال دیا، یہ سال کا آخری حصہ چل رہا تھا دو ماہ سے کچھ ہی زیادہ سالانہ امتحان کو رہ گیا تھا، ہم لوگوں پر اس تبدیلیٔ مقام کا کوئی اثر نہیں ہوا، ہم لوگ یہاں مطمئن ہی نہیں بلکہ خوش ہوئے کیونکہ حدیث کی چار ضخیم کتابوں کو لے کر علی الصباح اصالت پورہ سے شاہی مسجد آنا بڑا صبر آزما مرحلہ

ہوتا تھا، سردیوں کے زمانہ میں تو یہ مصیبت پہاڑ بن گئی تھی، ہماری نئی قیام گاہ سے مدرسہ تھوڑی دوری پر تھا اس لئے یہ مصیبت دور ہوگئی، اور دل ونگاہ میں تمناؤں اور آرزوؤں، امنگوں اور ترنگوں کا جو چمن لہلہا رہا تھا وہ تو ہم اپنے ساتھ ہی لائے تھے اس لئے اُداسی کا سوال ہی کہاں تھا؟

تحریک ۱۹۴۲ء

اپنی نئی قیام گاہ پر آئے ہوئے چند ہی ہفتے گذرے تھے کہ ایک دن صبح صبح قیامت بن کر آگئی، ہم لوگ حسب معمول بعد نماز فجر شمائل ترمذی کے درس میں شرکت کے لئے مدرسہ شاہی مولانا سید محمد میاں دیوبندی کی درسگاہ میں پہونچے، حضرۃ الاستاذ پہلے سے موجود تھے، چہرے پر فکرمندی کے آثار بہت گہرے تھے، وہ یوں ہی کم سخن، تبسم ناآشنا، خاموشی پسند بزرگ تھے، لیکن ۹ راگست ۱۹۴۲ء کی صبح ان کی فکرمندی میں تشویش کا رنگ کچھ زیادہ ہی گہرا تھا، انھوں نے بلاتمہید فرمایا کہ رات بمبئی میں ہمارے تمام لیڈران گرفتار کر لئے گئے، پولیس ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ ہماری تلاش میں ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ کب کون برطانوی جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے، اس لئے آپ لوگوں پر قوم ووطن کی ایک بڑی ذمہ داری آگئی ہے، اس کا آغاز آج سے ہونا چاہئے، برطانوی نظامِ حکومت کے ایک ایک کل پُرزے کو توڑ دو، پھونک دو، آگ لگادو، ٹیلیفون کے تار کاٹ دو، ریلوے لائن کی پٹریوں کو اکھیڑ دو، بجلی کے کھمبوں کو زمیں بوس کر دو، برطانوی پولیس سامنے آئے تو اس کا مقابلہ کرو، بس یہی عرض کرنے میں انگاروں پر چل کر آیا ہوں، اچھا خدا حافظ! اگر زندہ رہے تو پھر ملیں گے، خدا ہماری تمہاری حفاظت کرے اور ملک وملت کو سرخرو کرے۔ **فی امان اللّٰہ**

یہ گرم گرم باتیں فرمائیں اور درسگاہ سے اٹھے اور پھر ایک غیر معین مدت کے لئے ہم وہ نورانی چہرہ دیکھنے سے محروم ہوگئے، جس کو دیکھ کر دل میں طاقت آتی تھی اور ذہن ودماغ میں روشنی، پھر وہ سب کچھ ہوا حرف بحرف پورا ہوا جس کا حکم حضرۃ الاستاذ نے دیا تھا، ہم کچی عمروں کے طلبہ نہ اخبار دیکھتے تھے نہ ریڈیو سنتے تھے، مجھے تو یاد نہیں کہ سال بھر میں کبھی اخبار دیکھنے کی نوبت آئی تھی یا نہیں، ریڈیو تو اس زمانہ میں بہت کمیاب تھا، شاید کچھ رئیس گھرانوں میں رہا ہو، ہمارے سننے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، ہم بے خبر ہونقوں کی طرح یہ باتیں سنتے رہے، اپنے لیڈروں سے واقفیت ضروری تھی، کانگریس اور جمعیۃ علماء کی سیاسی، قومی اور ملی سرگرمیوں سے بھی تھوری بہت واقفیت رہتی تھی، کیونکہ کم عمری ہی سے کانگریس رہنماؤں کی دل میں قدر و قیمت تھی، عربی کی ابتدائی کتابیں جب پڑھتا تھا تو ہمارے استاد مولانا عبداللطیف نعمانی مشہور کانگریسی رہنما تھے، کھدر کا کرتا پاجامہ، کھدر کی شیروانی پہنتے تھے، سب سے پہلے انھیں سے متاثر ہوا اور جب متوسطات پڑھ رہا تھا تو مبارک پور میں مولانا شکراللہ صاحب مرحوم کی سرپرستی ملی، وہ پکے کانگریسی تھے، مرادآباد آئے تو معلوم ہوا کہ حضرت مدنی یہیں جیل میں ہیں، ان سے عقیدت جسم کے ریشے ریشے میں سمائی ہوئی تھی، اس تاثیر وتاثر کے اسباب کی وجہ سے مرادآباد میں آکر میں خود کھدر پوش ہوگیا جو اس زمانے میں کانگریس ورکروں کا یونیفارم تھا، سال کے آخر میں کھدر کی جواہر کٹ صدری نے اس یونیفارم کی تکمیل کردی تھی، میرے رفقاء درس میں اکثر اسی نظریہ کے تھے، سوائے پنجابی وپشاوری طلبہ کے، ان کو منطق وفلسفہ کی کتابوں کے حواشی چاٹنے اور یاد کرنے کے سوا دوسرے کسی کام سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی اس لئے جب ہم لوگوں نے شہر میں جلوس نکالا تو ان کا کہیں دور دور بھی پتہ نہیں تھا۔

مرادآباد میں ہلچل

مولانا سید محمد میاں صاحب تو ہم لوگوں کو نصیحت کر کے رُخصت ہو گئے ، اندازہ ہو گیا کہ اب اسباق کے دن پورے ہو گئے ، اب ہم آزاد ہیں جو چاہیں کریں ، اور جیسے چاہیں رہیں ، دل میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کی چنگاریوں کی پھونک مار کر حضرۃ الاستاد نے لو دینے والے شعلوں میں تبدیل کر دیا تھا ، اس لئے چین سے کون بیٹھتا ہے ، جب تمام طلبہ حسب معمول مدرسہ میں آ گئے تو مشورہ ہوا ، اور جلوس کا پروگرام بن گیا ، اعظم گڈھ کے ہم چاروں لڑکے اور بہار کے بہت سے طلبہ اور مغربی اضلاع کے ساتھیوں نے جلوس کی تیاری کر لی ، مدرسہ شاہی کا گیٹ بازار میں ایک رواں دواں سڑک پر کھلتا ہے ، جوں ہی گیٹ کے باہر تمام طلبہ ایک ساتھ آ گئے اور ''انقلاب زندہ باد'' ''انگریز بھارت چھوڑو'' ''جو ہم سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا'' کے گرما گرم نعرے فضا میں بلند ہوئے تو پوری فضا گونج گئی ، عوام اور تماشائیوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی ، شاہراہ بند ہو گئی ، نعرے اور پُر شور ہونے لگے ، طلبہ اور عوام کی یہ بھیڑ بتدریج ایک جلوس کی شکل اختیار کرتی گئی ، اس جلوس کا رُخ پان دریبہ کی طرف تھا ، جلوس مارچ کرتا ہوا ، فلک شگاف نعرے لگاتا ہوا شہر کی مشرقی جانب ایک کالج تھا اس کے گیٹ میں داخل ہو گیا ، جلوس والوں میں سے کسی نے گھنٹہ بجا دیا ، کالج کے تمام لڑکے کلاسوں سے نکل آئے اور جلوس میں شامل ہو گئے ، اب جلوس کالج کے صدر گیٹ سے باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ گھوڑ سوار پولیس کا دستہ آ گیا اور راستہ روک لیا ، اس سے جلوس الجھ گیا ، ابھی گولی چلانے کا حکم تھا نہ لاٹھی چارج کرنے کا ، اس لئے جلوس گیٹ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اسی روڈ سے واپس ہونے لگا جس سے ابھی وہ گذرا تھا ، جب واپسی میں پان دریبہ پہونچا تو دیکھا کہ پولیس کے

اعلیٰ افسران جیپوں میں سوار جلوس کا رستہ روکنے کے لئے تیار ہیں، ایک انگریز پولیس افسر جو ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، اس پر نظر پڑتے ہی جلوس کے کسی نوجوان نے اینٹ کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھایا اور کھینچ کر اتنی زور سے مارا کہ شیشہ توڑ کر اس انگریز کے چہرے پر لگا، پتھر کا لگنا تھا کہ اعلانِ جنگ ہو گیا، اس نے ریوالور نکالا اور گولی چلادی، ایک نوجوان دھڑام سے گولی کھا کر گر گیا، مجمع میں بھگدڑ مچ گئی، مگر پھر بھی بہت سے جیالے پولیس پر پتھر برسانے میں مصروف رہے، جواب میں پولیس گولیاں چلاتی رہی جلوس اس کا جواب اینٹوں اور پتھروں سے دے رہا تھا، ان گنت آدمی پولیس کی گولیوں سے مرے اور زخمی ہوئے، ہم لوگ صدر راہ چھوڑ کر گلیوں سے ہوتے ہوئے اپنی قیام گاہ پر آ گئے، پھر تو پورے شہر میں آگ کی طرح یہ تحریک بڑھی اور دوسرے دن اتنا بڑا جلوس نکلا کہ اس کی ابتداء اور انتہاء کا ہم اندازہ نہ کر سکے، آج جلوس کا رُخ کمپنی باغ کی طرف تھا، پولیس کی بہت بڑی جمعیت، بہت سے اعلیٰ افسران جلوس کے دائیں بائیں، آگے اور پیچھے چلتے رہے، پہلے دن کے جلوس پر فائرنگ کے بعد آج کے جلوس میں اتنی زبردست بھیڑ نے پولیس حکام کو یہ سمجھا دیا کہ پولیس کے تشدد نے فضا کو اور زیادہ خراب کر دیا ہے جس کی وجہ سے اتنا بڑا جلوس آج چل رہا ہے اس لئے فیصلہ کر لیا تھا کہ جلوس پر گولیاں ہرگز نہ چلائی جائیں اور نہ جلوس کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جائے، دوسرے دن کا جلوس اب خود تشدد پر آمادہ تھا اور غصہ میں بھرا ہوا تھا، تمام بجلی کے کھمبے ڈھا دیئے، تار کاٹ ڈالے، ڈاک خانہ لوٹ لیا، ریلوے اسٹیشن پہونچ کر توڑ پھوڑ مچائی، کمپنی باغ میں انگریز افسران کے بنگلے تھے ان کے بنگلوں کے دروازے اور کھڑکیوں کے شیشے چور چور کر ڈالے، پولیس نے نہ کہیں گولی چلائی اور نہ اس کو من مانی کرنے سے روکا، جلوس فتح کا پرچم لہراتا ہوا پورے شہر

میں گھومتا رہا، سارا نظم ونسق تباہ و برباد ہو چکا تھا مگر جلوس اور پولیس میں کہیں تصادم نہیں ہوا، اب پولیس کی توجہ شہر سیاسی کارکنوں کی گرفتاری پر تھی جس کی لسٹ پہلے ہی سے مرتب ہو چکی تھی اور کوتوالی میں موجود تھی، روزانہ دو چار لیڈر یا ورکر گرفتار ہوتے، جلوس کی رہنمائی کرنے والوں کو چن چن کر گرفتار کیا گیا اور سب کو سیدھے جیل بھیج دیا گیا، یہ ایک ہفتہ تک مسلسل چلتا رہا، ہزاروں آدمی گرفتار ہوئے، پھر پورے شہر پر سناٹا چھا گیا، مدرسہ کے کئی اساتذہ گرفتار ہو چکے تھے اور بعض ابھی تک روپوش تھے، بعض طلبہ بھی پولیس کی زَدْ میں آ گئے اور جیل چلے گئے، مدرسہ شاہی گہرے سناٹے میں ڈوب گیا۔

مدرسہ شاہی کے آخری ایام.........................

ہمارے اساتذہ میں صرف حضرت شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ پولیس کی گرفت سے محفوظ تھے، سارے ستارے ایک ایک کر کے روپوش ہو چکے تھے صرف آپ کی ذاتِ گرامی شب چہاردہم کے چاند کی طرح ہمارے درمیان موجود تھی، بقیہ اساتذہ یا تو جیلوں میں تھے یا دور افتادہ قصبوں اور دیہاتوں میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کے لئے صحرانوردی کر رہے تھے، شعبان آ چکا تھا، عربی مدارس میں یہ مہینہ بڑی ہماہمی اور بڑی مصروفیتوں کا ہوتا ہے، سالانہ امتحان اسی مہینہ میں ہوتا ہے پھر ایک لمبی تعطیل کا اعلان ہو جاتا ہے، دیش دیش کے طائرانِ خوش نوا اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ جاتے ہیں، مدارس کی فضا ایک گہرے سناٹے میں ڈوب جاتی ہے، مدرسہ شاہی پر تو قبل از وقت سناٹا چھا گیا تھا، نہ اساتذہ موجود ہیں نہ طلبہ، سالانہ امتحان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نہ امتحان لینے والے موجود نہ امتحان دینے والے، مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ عام طلبہ کا سالانہ امتحان نہیں ہوا، البتہ دورۂ حدیث کے طلبہ کا معاملہ دوسرا

تھا، ابھی ختم بخاری کی تقریب باقی ہے، ان کا امتحان بھی ضروری تھا کہ سند واجازت دی جاسکے ورنہ یہ پورا سال رائیگاں چلا جائے گا پھران ۵۴ رطلبہ میں دوبارہ پڑھنے کی کس کو توفیق ملے گی اور کس کو نہیں، یہ بڑا اہم اور نازک مسئلہ تھا، اس لئے بہر حال یہ دونوں تقریبات ہونی تھیں اور ہوئیں، مگر کیسے ہوئیں؟ عبرتناک کہانی ہے۔

آج عربی مدارس میں ختم بخاری کی تقریب ایک جشن کی شکل اختیار کرچکی ہے اس کے لئے بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، باقاعدہ اس کی تاریخ کا اعلان کیا جاتا ہے، عوام وخواص کی بھیڑ جمع ہوتی ہے، ہر طرف چہل پہل، جوش خروش، آرائش وزیبائش، دعوت وکام ودہن کی ہنگامہ آرائیاں، مہمانوں کی کثرت، ہر کمرے میں دسترخوان بچھے ہوئے، دارالحدیث کی سجاوٹ، لاؤڈ اسپیکر پر آخری حدیث کا درس، پھر ایک لمبی چوڑی تقریر، کچھ نصیحتیں، کچھ فضیحتیں، دعا کا خصوصی اہتمام، پھر برتنوں کی کھنک، شیشہ وساغر کی جھنکار، چائے اور کافی کی بہار، نمکین، بالوشاہی اور بہترین مٹھائیوں کے قاب پر قاب، ہر طرف خوش گپیاں، تفریح وخوش طبعی کا پُر مسرت ماحول، جشن مسرت کا کیف آور سماں، ختم بخاری کرنے والے طلبہ دولھا بنے ہوئے میز بانی میں مصروف، شاید ان کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن یہی ہوتا ہے۔

مگر ہماری ختم بخاری کی تقریب بڑی عبرتناک تقریب تھی، لیمپ اور لالٹینوں کی مدھم روشنی کی وجہ سے نیم تاریک دارالحدیث میں ۵۴ رطلبہ سایوں کی طرح نظر آرہے تھے، جیسے جنوں کی کوئی بارات صحرا میں بیٹھی ہوئی ہو، نہ صاف چہرے نظر آتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانا جاسکتا ہے، مسند درس پر حضرۃ الاستاد سفید براق لباس میں ایک فرشتہ کی طرح رونق افروز ہیں، نہ کوئی بھیڑ نہ کوئی مجمع، نہ دوست نہ عزیز واقارب، کوئی خوش ہونے والا چہرہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہ تھا،

جیسے کسی سنسان میدان میں لٹا ہوا کوئی اداس قافلہ خیمہ زن ہے، سوائے دو چار سرکاری مخبروں اور سی آئی ڈی پولیس کے دو تین افراد کے اور کوئی وہاں طلبہ کے سوا ہماری اس عبرتناک تقریب میں شرکت کیلئے موجود نہیں تھا، حضرۃ الاستاد نے مختصر سی تقریر فرمائی اور آخری نصیحت جو وصیت بن گئی، حالات اور ماحول کے پیش نظر وقتی اور فوری ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا، جہادِ آزادی کا جو جذبہ سینہ میں موج زن تھا اس کیلئے کھلے لفظوں میں بغاوت کا سبق پڑھایا گیا، اور انگریزی حکومت کے استیصال کے لئے پورے غم وغصہ اور درد کے ساتھ تمام طلبہ کو حوصلہ دلایا گیا لیکن یہ ساری ہدایات عربی زبان میں تھیں اس لئے مخبر اور سرکاری جاسوس ہونقوں کی طرح بیٹھے سنتے رہے مگر ان کی خفیہ ڈائری کے لئے ایک لفظ بھی نہ مل سکا اور ختم بخاری کی تقریب ختم ہوگئی۔

دوسرے دن بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد شریف چاروں کتابیں لے کر ہم لوگ حضرۃ الاستاد کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہر کتاب سے ایک ایک دو دو سوالات کئے گئے اور جوابات دیئے گئے، یہی ہمارا سالانہ امتحان تھا، یہ امتحان درحقیقت طالب علمانہ زندگی کی کتاب کا آخری باب ہوتا ہے اور ایک بہار آفریں زندگی کی آخری سرحد تھی، پھر اس کے بعد تو عملی زندگی کا لق ودق صحرا تھا نہ جس کی راہیں معلوم، نہ منزل کا پتہ، اب ہم زندگی کے لق ودق صحرا کی جانب جانے کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے۔

مرادآباد سے واپسی ....

ہمارے سالانہ امتحان کے بعد مدرسہ میں ازخود تعطیل ہوگئی، لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ واپسی کیسے ہو؟ ریلوے اسٹیشن سے معلوم ہوا کہ تمام ٹرینیں بند ہیں، جگہ جگہ سے لائنیں اکھڑی ہوئی ہیں، ان کی مرمت میں دس پندرہ دنوں کی دیر ہے، ڈاک خانے تباہ ہو چکے تھے، گھر سے آخری سال میں جو زادِ راہ چلا تھا وہ راستہ بھول گیا اور

ہم تک نہ پہونچ سکا، ہاتھ خالی، جیب خالی، ہرطرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اتفاق سے انھیں دنوں مبارک پور کے کچھ تاجر مرادآباد میں پھنسے ہوئے تھے، ان کو بھی وطن واپسی کی فکر تھی، ہمارا ان کا تعارف تھا، ہم نے ان سے قرض لئے اس کے بدلے ہم نے ان کے کنشیسن اپنے کنشیسنوں کے ساتھ بنوالئے، دس بارہ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ لکھنؤ تک ریلوے لائن درست ہوچکی ہے، ٹرینوں کی آمدورفت کل سے شروع ہوجائے گی، ہم آٹھ دس نفر کا قافلہ اسٹیشن پہونچ گیا، وہاں جاکر معلوم ہوا کہ ابھی ایک ٹرین لکھنؤ کے لئے روانہ ہونے والی ہے، تھوڑی دیر کے بعد ٹرین پلیٹ فارم پر آکر لگی اور ہم اس میں سوار ہو گئے، یہ سوچ کر کہ آدھی راہ تو کم از کم طے ہوجائے پھر آگے دیکھا جائے گا، خدا خدا کر کے انجن جوڑا گیا، ڈرائیور اور گارڈ نے اپنی ڈیوٹی سنبھالی، یہ پہلی ٹرین تھی جو اس لائن پر چل رہی تھی، اس لئے تشویش کے ساتھ روانہ کی جارہی تھی، گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی، انجن نے سیٹی دی، ٹرین میں حرکت پیدا ہوئی، ہم نے ایک نگاہِ حسرت مرادآباد شہر پر ڈالی، سال بھر ہم نے نیم فاقہ کے زندگی کے باوجود بڑی بہار آفریں زندگی گذاری تھی، دل مرادآباد سے رخصت ہوتے ہوئے امڈا آرہا تھا، زبان سے جوں ہی نکلا ''اے شہر بہاراں الوداع'' تو آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

قافلہ چل پڑا......................

آخر ہمارا قافلہ لکھنؤ پہونچ گیا، کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، خاص طور پر رات میں اندیشہ تھا کہ ہوسکتا ہے کہ کہیں فش پلیٹ عجلت کی مرمت میں کھلی نہ رہ گئی ہو، کہیں لائن ٹھیک طور پر مرمت نہ ہوئی ہو یا مرمت کے بعد کسی مجاہد آزادی نے پھر فش پلیٹ کھول دی ہو اور ٹرین حادثہ کا شکار ہوجائے مگر ایسا کہیں نہیں ہوا، دوسرے روز دن ڈوبتے ڈوبتے ہم لوگ لکھنؤ چار باغ اسٹیشن پہونچ چکے تھے، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا

کہ آگے کا راستہ بند ہے، سرِ شام ہم لکھنؤ پہونچے تھے، ہم دونوں احباب کو پلیٹ فارم پر بیٹھا کر شہر چلے گئے، رفیق مکرم مولانا محمد قاسمی کے بڑے بھائی حکیم محمد الیاس مرحوم ان دنوں لکھنؤ میں موجود تھے اور تکمیل الطب کالج جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، ہم کالج پہونچ گئے، ان سے ملاقات ہوئی، اس وقت وطن کے ایک فرد سے ملاقات کر کے وہ خوشی محسوس ہوئی جو امن وامان کے دنوں میں وطن پہونچ کر سارے عزیز واقارب سے مل کر بھی وہ خوشی نہیں نصیب ہوتی، پھر شب ہی میں ہم اسٹیشن واپس آگئے اور رات پلیٹ فارم پر گزاری، صبح کو جب اٹھے اور اِدھر اُدھر لوگوں سے مل کر پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ آج گورکھپور کی طرف پہلی ٹرین روانہ ہوگی، دل کو ڈھارس ہوئی، کبھی کبھی تو جھوٹی تسلی بھی بڑا کام کر جاتی ہے، کچھ دیر اس کے سہارے بھی گذر جاتے ہیں، مگر یہ افواہ دن کے دو بجے حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگئی، ایک خالی ٹرین پلیٹ فارم پر آکر رکی، لوگوں نے بتایا کہ یہی ٹرین گورکھپور جائے گی، ہم نے اسی ٹرین میں بعجلت جگہ لے لی، شام ہوتے ہی ٹرین چل پڑی، چونکہ عارضی طور پر پٹریاں بچھا کر لائن بچھائی گئی تھیں اس لئے ٹرین انتہائی سست رفتار تھی، جیسے نواب واجد علی شاہ چہل قدمی کرنے نکلے ہوں کہ ہر قدم پر گلابوں کے تختے بچھائے جا رہے ہیں، سنبھل سنبھل کر پھولوں کی پنکھڑیوں پر اس طرح قدم رکھ رہے ہیں کہ پھولوں کی تازگی وشادابی مجروح نہ ہو۔

رات بھر سفر کے بعد صبح کو ٹرین بھٹنی جنکشن پر پہونچی، اسٹیشن ایک دم ویران، کوئی کہیں نظر نہیں آرہا تھا، چند ریلوے ملازمین ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے، اس ٹرین کا سفر یہاں پہونچ کر ختم ہوگیا، پوری ٹرین خالی ہوگئی، ہم بھی پلیٹ فارم پر آگئے، وہاں اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ آگے راستہ اتنا خراب ہے کہ بعض بعض جگہ لائنیں

میلوں تک اکھاڑ کر پھینک دی گئی ہیں اس لئے ابتک کوئی ٹرین نہیں جاسکی ہے، مجبوراً وہیں اتر کر پلیٹ فارم پرڈیرا ڈال دیا۔

تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ کوئی انگریز افسر پلیٹ فارم پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے، انتہائی بدمزاج، تند خو ہے، کھدر کا لباس دیکھ کر تو وہ پاگل ہو جاتا ہے، جیل بھیج دیتا ہے، اس کے یہاں کوئی رورعایت نہیں ہے، وہ ہفتوں سے پورے علاقے میں گشت کررہا ہے، اسکے ساتھ مسلح پولیس کا ایک دستہ رہتا ہے، کئی آبادیوں میں آگ لگا کر پھونک چکا ہے، دن بھر دیہاتوں اور گاؤں میں جا کر باغیوں کا پتہ چلاتا ہے، ان کو گرفتار کرتا ہے اور رات اسی پلیٹ فارم پر اپنے خیمہ میں قیام کرتا ہے، میں سر سے پیر تک کھدر میں ڈوبا ہوا تھا، ساتھیوں نے کہا، بدل ڈالو، میں کیا کیا بدلتا، پھر میرے پاس دوسرے کپڑے بھی نہیں تھے، میں نے کہا کہ جب ہمارا پورا سفر ابتلاء وآزمائش میں ہورہا ہے تو نہ گاندھی کیپ (ٹوپی) بدلے گی نہ کھدر کا کپڑا، جو مصیبت آنی ہے آجائے۔

کہتے ہیں مصیبت آئے گی آئے گی تو دیکھا جائے گا

پوری رات اور پورا دن اسی اُجاڑ، سنسان اسٹیشن پر ہمارے قافلہ کو بسر کرنا پڑا، کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ ؎

ہم نے سن رکھا غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

جب دوسرا دن ہوا تو پتہ چلا کہ آج کسی وقت ایک ٹرین چلائی جائے گی، دن کے ۱۲ر بجے ایک ٹرین پلیٹ فارم پر آئی، جان میں جان آئی، رخت سفر اٹھایا گیا اور ایک ڈبے میں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے کیونکہ پوری ٹرین خالی تھی، دو چار آدمی کسی کسی

ڈبے میں تھے، یہ بی، ان، ڈبلو، آر کی شاہی گاڑی تھی جو ہمارے دیار میں چلتی تھی، ایک ظریف آدمی نے بی، ان، ڈبلو، آر کا مطلب بتایا: بے ہودہ، نالائق، واہیات ریلوے، وہ ایسی ہی تھی جیسے شکر ملوں میں گنا پہونچانے والی یا کوئلہ کانوں میں کوئلہ ڈھونے والی گاڑیاں، لیکن اس ٹرین پر بیٹھ کر ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں، ایک سال کی تباہیوں اور بربادیوں کی خارزاروادی سے نکل کر آنے کے بعد ہمیں یہ ٹرین ہمارے وطن کی سرسبز وادیوں میں لئے جارہی تھی، عالیشان بلڈنگوں، چمکتی چمچماتی سڑکوں، برقی قمقموں سے جگمگ کرتے ہوئے بازاروں اور سرسبز وشاداب خوبصورت پارکوں میں بھی رہ کر ہمیں اپنے سفالہ پوش اور کھپریل مکانوں والی آبادی نہیں بھولی تھی، تنگ تنگ اوبڑ کھابڑ گلیاں، گلیوں میں بہنے والی گندی نالیاں، بل کھاتی ہوئی کھیتوں کی پگڈنڈیاں ہمیں ابتک یاد تھیں، ان کے فراق میں ہم نے آنسو بہائے تھے، چھپ چھپ کر روئے تھے، بات وہی تھی،

اسطرح شوخ گذرتی ہے صبح وشام اپنی آئی جو ان کی یادتو چپکے سے رولئے

طائرفکر حسین پارکوں اور شہر کے چمن زاروں سے نکل کر گاؤں کے باغوں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں پرواز کرنے کے لئے ہمیشہ بےچین رہا، پر پھڑ پھڑاتا رہا، یہ ٹرین ہمیں اسی عشق ومحبت کی سرزمین کی طرف لئے جارہی تھی، ٹرین سبک رفتاری اور نازک خرامی کے ساتھ چل رہی تھی، کچھ جانے پہچانے اسٹیشن، کچھ جانی پہچانی آبادیاں نظر آنے لگیں، ہم انتہائی مسرت کے جذبے سے مغلوب ہوکر ایک دوسرے کو بتانے لگے کہ ہم فلاں جگہ آ گئے، اب فلاں اسٹیشن آنے والا ہے، اپنے دیار کے جانے پہچانے نظارے میں دل مصروف تھا کہ دن کے چار بج گئے، ٹرین کی رفتار کچھ اور کم ہونے لگی، دور دیکھا کہ ہمارے اسٹیشن کا سگنل نظر آرہا ہے، ٹرین رینگتی ہوئی

سرکنے لگی، ہمارا کھپریل کا اسٹیشن نگاہوں کے سامنے آگیا، ہم کھڑکیوں سے گردن نکالے چہار جانب دیکھ رہے ہیں، پرانی یادوں میں نیا رنگ بھر رہے ہیں کہ ٹرین ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی، یہ تھا ہمارا اسٹیشن ''اندارا جنکشن'' پلیٹ فارم خالی تھا، گاؤں کے دو چار منچلے لڑکے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے، پہلی ٹرین دیکھ کر حیرت زدہ کھڑے تھے کہ ان کی نگاہیں ہم لوگوں پر پڑیں، دوڑ کر آئے اور سلام ومصافحہ کرنے لگے، کسی نے دوڑ کر گھر والوں کو اطلاع کردی، اپنے عزیز واقارب بھاگ کر آئے، گلے ملتے ہی آنکھیں بھر آئیں لیکن یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے، ہم لوگ خلافِ امید آگئے تھے اس لئے خوشی کئی گنا بڑھ گئی تھی، ہمارے وطن میں یہ افواہ عام تھی کہ میں اور رفیق مکرم مولانا محمد قاسمی دونوں مرادآباد میں گرفتار کرلئے گئے ہیں اور جیل میں ہیں، یہ افواہ پھیلانے والے گاؤں کے کچھ معتبر لوگ تھے جو ہمارے سیاسی رُجحانات اور نقطۂ نگاہ سے واقف تھے اس لئے قیاس کی بنیاد پر یہ افواہ پھیلادی تھی مگر ہم لوگ اتنے خوش قسمت کہاں تھے کہ سرکاری مہمان بنتے، حقیقت یہ تھی کہ مرادآباد میں ہم خود گمنام اور ایک گمنام گلی میں رہتے تھے، ہم لوگوں کی حیثیت شبخون مارنے والوں کی تھی، اس لئے ہماری گرفتاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، بدقسمتی سے ہمارا ایک ساتھی موقعہ ہی پر پولیس کے ہاتھ آگیا تھا اور ساڑھے تین سال جیل میں رہ کر رہائی پاسکا۔

اپنے وطن میں......................

میں اپنے وطن میں آگیا ۱۹۴۲ء کا آخر تھا، اس وقت میرا خاندان ادری سے منتقل ہوکر اپنی نوآبادی کریم آباد میں سکونت پذیر ہوچکا تھا، چھوٹی سی آبادی جو چند گھروں پر مشتمل تھی، یہاں میرے علاوہ ایک صاحب اور تھے جو مدرسہ امدادیہ مرادآباد کے فاضل تھے وہ بھی بہار میں کسی مقام پر مدرس ہوکر چلے گئے تھے، دوسرا

کوئی تعلیم یافتہ نہیں تھا، میرا چھوٹا بھائی مولوی بشیر احمد قاسمی اس وقت زیر تعلیم تھا، اس لئے طبیعت بجھی بجھی سی رہتی تھی، اسی وجہ سے میرا روز کا معمول بن چکا تھا کہ عصر کی نماز کے بعد ادری آجاتا تھا یہاں فضلاء دار العلوم دیوبند ومراد آباد کے ہمارے کئی احباب تھے، ہم سب جمع ہوجاتے تھے اور دس گیارہ بجے رات تک بات چیت، پلاننگ، منصوبہ بندی، مقامی حالات ومسائل پر گفتگو کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا تھا، اسی دوران ایک قلمی رسالہ ''زندگی'' کے نام سے ماہوار نکالا گیا، ایک انجمن بنائی گئی، پھر کچھ دنوں بعد ایک لائبریری کا قیام ہوا، اس لئے میری دلچسپیاں یہاں زیادہ تھیں اور میں روزانہ دس بجے رات میں کریم آباد واپس ہوتا تھا۔

دوسری شادی........................

میری پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب میں چار پانچ برس کا تھا اور میری ہونے والی بیوی اپنے پالنے میں لیٹی انگوٹھا چوس رہی تھی، میں بتا چکا ہوں کہ والد صاحب اپنے بزرگوں کی قومی وملی اور دینی سرگرمیوں سے واقف رہتے تھے بلکہ ان سرگرمیوں میں عملی طور پر حصہ بھی لیتے تھے، ۱۹۲۹ء میں مرکزی اسمبلی میں ساردا ایکٹ پیش ہوکر منظور ہوا اور پورے ملک میں نافذ کردیا گیا، اس میں شادی کے وقت لڑکے کی عمر غالباً ۲۴ر سال اور لڑکی کی عمر ۱۸ر سال ضروری قرار دی گئی تھی اور کمسنی کی شادی کو قانوناً جرم قرار دیا گیا تھا، جمعیۃ علماء ہند اور خلافت کمیٹی نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور قانون شکنی کا پروگرام بنایا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ اپنے بچوں کی کم عمری میں ہر جگہ شادیاں شروع کردیں، چنانچہ اجتماعی طور پر یہ شادیاں ہونے لگیں، گویا حکومت کو چیلنج تھا کہ آئے اور ہم کو گرفتار کرے، ہمارے گاؤں ادری میں بھی ان گنت شادیاں ہوئیں جن میں لڑکی اور لڑکے کی طرف سے باپ نے ایجاب وقبول کیا،

اسی سیلاب کے دھارے میں ہماری کشتی ڈال دی گئی یعنی انگریزی حکومت کی مخالفت کو مجھے گھٹی میں پلا دیا گیا تھا اور شاید اسی کا اثر تھا کہ جب میں سن شعور کو پہونچا تو سیاست میرا اوڑھنا بچھونا ہو گئی۔

مرادآباد جانے سے کچھ پہلے میری بارات گئی جو صرف رسمی تھی کیونکہ نکاح تو کمسنی ہی میں ہو چکا تھا صرف دولہن رُخصت ہو کر آ گئی تھی، جب میں مرادآباد سے واپس آیا تو وہ علیل تھی اور اپنے میکہ میں رہتی تھی، یہی بیماری مرض الموت ثابت ہوئی، دوسری شادی ۱۹۴۳ء میں ہوئی، یہ شادی انتہائی سادگی کے ساتھ ہوئی کیونکہ اس وقت معاشی حالات عام طور پر اچھے نہیں تھے، حتیٰ کہ اچھے کپڑے تک دستیاب نہیں تھے، راشن کارڈ پر سرکاری دوکانوں سے کچھ کپڑے مل جاتے تھے، عالمی جنگ شباب پر تھی، ملک میں ہر چیز کی قلت تھی، موٹا اناج عام طور سے لوگ استعمال کرتے تھے۔

اب گھر کے مسائل سامنے تھے، مولانا محمد قاسمی کے ساتھ کاروبار شروع کیا، پھر کچھ دنوں بعد ایک دوست کے ساتھ میں ایک چھوٹا سا کاروبار کیا، اسی دوران ۱۹۴۳ء (جولائی) میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سفر آخرت اختیار کیا، چند دنوں بعد عید آ گئی، احباب کا مشورہ ہوا کہ عیدگاہ میں حضرت تھانوی کے حادثۂ وفات پر ایک تعزیتی تقریر ہونی چاہئے اور اس تقریر میں حضرت تھانوی کے علوم کو ظاہر کرنے کے لئے ایک دارالمطالعہ کے قیام کی تجویز بھی آنی چاہئے، اور اس دارالمطالعہ کو حضرت تھانوی کے نام سے موسوم کیا جائے، میں نے عیدگاہ میں تقریر کی، اور اس کا اثر یہ ہوا کہ حاضرین نے ہر طرح کی پیشکش کا اعلان کیا اور عید ہی کے دن ایک بڑا سا بورڈ تیار ہوا جس پر جلی حروف میں ''حکیم الامۃ میموریل لائبریری'' لکھ کر ہم لوگوں نے اپنی نشست گاہ کے باہری دروازے پر لکھ کر لگا دیا، حضرت تھانوی

کی تصانیف جن لوگوں کے پاس تھیں انھوں نے دارالمطالعہ کو پیش کیا، اور چندہ بھی آتا رہا، پھر بہت سی کتابیں باہر سے منگائی گئیں، کئی سالوں تک یہ دارالمطالعہ بہت شاندار چلا، کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہوگیا، لیکن بعد میں ہماری کاروباری مصروفیتوں نے اس کی عمر بہت مختصر کردی، ۱۹۴۵ء میں میرے شریک کار مولانا عبدالمجید قاسمی کا انتقال ہوگیا، کمر ہمت ٹوٹ گئی، سارا کاروبار ضلع چھپرہ سے ختم کرکے وطن چلا آیا، اب دل کاروبار سے ٹوٹ چکا تھا، اس لئے کچھ ہی دنوں بعد صحافت کو ذریعۂ معاش بنانے کا سودا سر میں سمایا اور اس کی ایک راہ بھی نکل آئی، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ان دنوں لاہور میں بسلسلۂ ملازمت رہتے تھے، وہ گھر آئے ہوئے تھے، لاہور جانے سے قبل وہ ادری بھی آئے تو میں نے ان سے اپنے دل کی بات کہی، انھوں نے کہا کہ پھر تیار ہوکر فلاں تاریخ کو آجاؤ ساتھ چلیں گے، اس طرح ۱۹۴۷ء کے آغاز میں لاہور چلا گیا۔

اس وقت ہمارے ملک کے سیاسی حالات انتہائی پُرشور اور ہنگامہ خیز تھے، آزادی کی جنگ آخری مرحلوں میں تھی، ہندو مسلم کشیدگی بڑھتی جارہی تھی، مسلم لیگ کی طاقت روز افزوں تھی، برطانوی حکومت پر کانگریس کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ اب وہ چنگیز و ہلاکو کے لب ولہجہ میں بات کرنے کے بجائے دوستانہ گفتگو کرتی تھی، شملہ میں کانفرنس ہورہی ہے، لندن سے وزراء کے قافلے پر قافلے آرہے ہیں کہ ہندوستان کے انقلاب پسندوں کو کسی طرح رام کیا جاسکے، کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کب کیا ہوجائے، سیاسی فضا انتہائی گرم تھی، جلسے جلوسوں کا طوفان برپا تھا، مسلمانوں کے متعدد اخبار نکلتے تھے، نیشنلسٹ اخباروں کی تعداد ایک تو کم تھی دوسرے سب سے مشہور نیشنلسٹ اخبار ''الجمعیۃ دہلی'' بند ہوچکا تھا، جو جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان تھا، اخبار پر حکومت کی طرف سے تین مقدمات چل رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کی

ضمانت ضبط ہوگئی اور اخبار قانوناً بند کر دیا گیا، صرف ایک اخبار ''زمزم'' تھا جو لاہور سے شائع ہوتا تھا، وہی نیشنلسٹوں کا ترجمان تھا، ہمارے دوست مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اسی اخبار سے وابستہ تھے، اخبار سے ان کا تعلق تو برائے نام تھا، اصل کام ان کا یہ تھا کہ زمزم کا ادارہ ایک کتاب ''منتخب التفاسیر'' کے نام سے مرتب کرا رہا تھا جس میں سات تفسیروں کی تلخیص کی جا رہی تھی، قاضی صاحب یہی تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کا معاوضہ فی پارہ ۳۰۰؍سو روپیہ تھا، ایک ماہ میں ایک پارہ ہو جاتا تھا، کبھی بہت محنت کی تو اس سے کچھ زائد بھی ہو جاتا تھا، وہ اس پر مطمئن تھے، اس وقت ان پر شاعری کا غلبہ تھا، ان کی نظمیں زمزم میں برابر شائع ہوتی رہتی تھیں، اور شاید کبھی کبھی کوئی مضمون بھی، اخبار کے دفتر میں ان کیلئے ایک کمرہ خاص تھا، میں بھی ان کے ہمراہ دفتر جانے لگا، ابھی مجھے کوئی کام نہیں ملا تھا۔

چند مہینے لاہور میں........................

لاہور میں ہمارا قیام اندرون بھاٹی گیٹ نور منزل میں تھا یہ دو منزلہ عمارت تھی، گراؤنڈ فلور پر ایک بڑا کمرہ تھا جس میں ایک بخاری صاحب مقیم تھے جو ایک ادارہ ''تنظیم اہل سنت'' کے نام سے چلا رہے تھے، دوسری منزل کے دو تین کمرے اخبار زمزم کے ایڈیٹر مولانا عثمان فارقلیط کے لئے تھے جس میں وہ مع اہل وعیال رہتے تھے، اسی دوسری منزل کے باہری حصہ کی طرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں قاضی صاحب رہتے تھے، انھیں کے ساتھ میں مقیم ہوگیا، لاہور میں سب سے پہلے جن سے میرا تعارف ہوا وہ اردو کے مقبول ومشہور شاعر حضرت احسان دانش تھے جو شاعر مزدور کے لقب سے مشہور تھے، ان کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی، انسانی ہمدردی، بے نفسی وبے لوثی، سلوک ومروت، مہمان نوازی وخوش اخلاقی، سادگی

واستغناء، لب ولہجہ کی نرمی کا ایک خوبصورت اور دلنواز پیکر تھے، وہ اس وقت مزدور نہیں رہ گئے تھے بلکہ بہتوں کے وہ مخدوم بن چکے تھے اور کافی خوشحال تھے، دومنزلہ مکان رہائش کے لئے تھا اس کے ٹھیک سامنے دو بڑے کمروں پر مشتمل ان کا دفتر اور کتب خانہ تھا جو ان کے ایک ہندو شاگرد بھیم سین ادیب کی شرکت میں چلتا تھا، ان کا ایک لڑکا ذیشان تھا جو جامعہ ملیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا، جہاں اس وقت رئیسوں کے لڑکے ہی پڑھ سکتے تھے کیونکہ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے، مشاعروں سے معقول آمدنی ہو جاتی تھی، ان کا بکڈپو بھی اچھی بزنس کرتا تھا، اس لئے بہت مطمئن زندگی گزارتے تھے اور بے فکری کے ساتھ رہتے تھے، ان کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی، ان کا رنگ ہلکا سانولا، بدن کسرتی مضبوط کسا ہوا، قد متوسط، علی گڈھ پاجامہ شیروانی اور بالوں والی جناح کیپ ان پر خوب بجتی تھی، قاضی صاحب کا زیادہ دنوں سے معمول تھا کہ ہفتہ میں اکثر چار بجے کے بعد مزنگ احسان صاحب کے یہاں چلے جاتے تھے، جب میں لاہور گیا تو میں بھی ان کے ساتھ جانے لگا، اور دو چار مجلسوں میں شریک ہونے کے بعد بے تکلف ہو گیا، جب پہلے دن ان سے ملاقات کے لئے ہم لوگ حاضر ہوئے تو حکم ہوا کہ آج آپ لوگ میرے ساتھ کھانا کھائیں۔

ہفتہ میں تین چار بار ہمارا مزنگ جانا ضروری سا ہو گیا تھا، ایک دن عشاء کی نماز کے بعد ہم لوگ دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے، میں سات شعروں کی اپنی غزل پیش کی کہ استاد اس کی اصلاح کر دیں، انھوں نے بلاتکلف کہا سنائیے، میں پوری غزل سنادی، وہ خاموشی سے سنتے رہے جب غزل تمام ہو گئی تو انھوں نے چند منٹوں کی خاموشی کے بعد کہا لکھئے، میں کاغذ قلم لے کر تیار ہو گیا، انھوں نے ایک شعر کہا، میں نے لکھ لیا، پھر دوسرا شعر لکھوایا، پھر تیسرا شعر لکھوایا، اس طرح آٹھ نو اشعار میری غزل

کی بحر اور قافیہ ردیف میں لکھوا دیئے، مگر میرے اشعار میں ایک حرف کی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں کی، نہ کوئی مصرعہ بدلا نہ کوئی لفظ، کہا کہ آپ کی غزل میں اصلاح کی ضرورت نہیں لیکن بحر اتنی رواں دواں اور سبک تھی کہ میرے اندر کا شاعر جاگ گیا اور جو قوافی آپ نے چھوڑ دیئے تھے اور استعمال نہیں کئے تھے میں نے ان پر اشعار کہہ دیئے، یہ اشعار آپ کے لئے میرا تحفہ ہے، میں نے بصد شکریہ قبول کرلیا، اب میری غزل ۱۸؍شعروں کی ہوگئی، پھر میں نے اس کے بعد کوئی غزل نہیں دکھائی اور نہ سنائی، دو تین ہفتوں کے بعد حسب معمول جب ہم لوگ حاضر ہوئے تو اس دن بھی انھوں نے ہم دونوں کو کھانے پر روک لیا، عشاء کے بعد ان کے دفتر میں مجلس جمی، احسان نماز کے بہت پابند تھے، یوں تو کلین شیو داڑھی مونچھ سب صاف تھی لیکن ان کا دل بڑا کٹر مسلمان تھا، دفتر میں بیٹھنے کے بعد ادھر ادھر کی گفتگو چل رہی تھی دورانِ گفتگو احسان صاحب نے اپنی ایک رُباعی کسی موقعہ سے سنائی تو قاضی صاحب نے تحسین کی، میں نے رباعی کا پس منظر، اس کی معنویت، فکری وسعت اور تمثیل کی ندرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھرپور داد دی، انھوں نے دوسری رباعی سنائی تو قاضی صاحب نے اس کی بھرپور تحسین کی اور رباعی کی معنویت کی وضاحت کرتے ہوئے داد دی، پھر اس کے بعد تو یہ حال ہوا کہ احسان صاحب اپنی فطرت اور اپنی افتادِ طبع کے خلاف رباعی پر رباعی سناتے چلے گئے، جب رات کا ایک بج گیا تب جا کر احسان صاحب نے رہوارِ فکر کی لگام کھینچی اور کہا کہ آج میں نے دل کھول کر آپ لوگوں کو سنایا ہے، میں کبھی بے تکلف دوستوں کی محفل میں اپنا کلام سنا کر رنگ محفل نہیں بدلتا، اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی شعر کہتا ہے تو اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے، وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اسے دیکھتا ہے، وہ اپنے شعر میں اسی منظر کی عکاسی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ شعر کا جو

پس منظر ہے وہ سامع کی نگاہوں کے سامنے آجائے، اگر سامع نے اس منظر کو اپنے تخیل کی نگاہ سے دیکھ لیا جو شاعر کے پیش نظر تھا اور اس کا اظہار کر دیا تو شاعر کی سب سے بڑی داد، سب سے بڑی تحسین یہی ہے، شاعری کرنے والے تو بہت ہیں لیکن سخن فہم یا سخن شناس کمیاب اور بہت کمیاب ہیں۔

اس وقت تک احسان دانش کے کئی دیوان شائع ہو چکے تھے، ''نوائے کارگر'' ''نفیر فطرت''، ''آتش خاموش''، ''چراغاں'' وغیرہ۔ احسان صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، ان کی مجلس میں بیٹھ کر ہم اپنی غریب الوطنی بھول جاتے تھے، کیونکہ ان کے اخلاقِ کریمانہ کی چھاؤں بڑی گھنی تھی، ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

ایک بار ہم لوگوں کے ساتھ انارکلی آئے، انھیں اپنے دفتر کے لئے ناریل کا ٹاٹ لینا تھا، راستہ میں کئی بلڈنگوں کو دکھا کر بتایا کہ میں نے یہاں مزدوری کی ہے، میں نے یہاں راج مستری کا کام کیا ہے، پھر کئی ایک اپنی مزدوری کے واقعات ہنس ہنس کر سناتے رہے، ہماری آنکھیں ان عبرتناک دنوں کی داستان سن کر ڈبڈبا آئیں۔

احسان صاحب کا وطن کاندھلہ ضلع مظفر نگر تھا، وہ بتاتے ہیں کہ بانی تبلیغی جماعت مولانا محمد الیاس کاندھلوی ہمارے دور کے چچا ہوتے ہیں، ایک بار ہم دونوں دن میں ان کے پاس دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ڈاکیہ آیا، اس نے ڈاک حوالہ کی، اس میں سے ایک کارڈ اٹھا کر مجھے دیا کہ ذرا اس کو پڑھئے، خط اردو میں صاف لکھا ہوا تھا اور ان کے وطن کاندھلہ ضلع مظفر نگر سے آیا تھا، خط میں لکھا تھا کہ میری ایک لاکھ کی جائداد خطرے میں پڑی ہے، عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے، مقدمہ ہار جانے کا

امکان زیادہ ہے، مجسٹریٹ نے کہا ہے کہ اپنے شہر کے کسی معزز ومشہور آدمی کی گواہی پیش کردیں تو مقدمہ کا آپ کے حق میں فیصلہ ہوسکتا ہے، مکتوب نگار نے درخواست کی تھی اگر آپ تشریف لاکر گواہی میرے حق میں دیدیتے تو میری یہ جائداد بچ سکتی ہے، میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا، میں نے خط پڑھ کر احسان صاحب کو سنادیا تب انھوں نے اپنے بچپن کی ایک ایسی داستان سنائی کہ دل تھرا گیا اور ہماری آنکھیں بھرآئیں، انھوں نے کہا کہ مکتوب نگار ہمارے قصبہ کاندھلہ کے بہت بڑے رئیس ہیں اور بڑی جائداد کے مالک ہیں، ان کا شمار وہاں کے رؤسا میں ہوتا ہے، ان کی ایک بہت بڑی حویلی ہے، میں جب کاندھلہ میں تھا اور میری عمر دس گیارہ سال کی تھی تو ان کی حویلی میں پنکھا کھینچنے پر ملازم ہوا، پہلے بجلی کے پنکھے نہیں تھے، رئیسون کے یہاں چھت میں کڑے لگا کر لمبے تختے پر خوبصورت کپڑے کی جھالر لگا کر پنکھا بنتا تھا، تختے کے بیچ میں ایک کڑا ہوتا تھا اس میں رسی باندھ کر اسے کمرے سے باہر تک دیوار کے سوراخ سے نکال دیا جاتا تھا اور باہر بیٹھ کر نوکر پنکھا کھینچتا رہتا تھا، اس زمانے میں اسی طرح کے پنکھے کا رواج تھا، گرمیوں ے دن تھے، دوپہر کا وقت، میں پنکھا کھینچ رہا تھا، پنکھا کھینچتے کھینچتے میں اونگھنے لگا اور پھر اتنا غافل ہوگیا کہ رسی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پنکھے کا چلنا رک گیا، معلوم نہیں میں کب تک سوتا رہا، یہ رئیس صاحب جن کا خط ہے اندر کمرے میں گرمی سے پریشان اور پسینہ پسینہ ہوگئے، غصہ میں بھنائے ہوئے کمرے سے باہر نکلے، دیکھا کہ میں بےخبر زمین پر پڑا ہوا ہوں اور سورہا ہوں تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی، پاؤں سے زور کی ٹھوکر ماری، میں جب اٹھ کر بیٹھ گیا تو انھوں نے میرے گالوں پر اتنا زناٹے دار اور بھرپور تھپڑ مارا کہ میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں ناچنے لگیں، میری غربت وافلاس نے میری آنکھوں کے پانی سے

میرے رُخساروں پر اپنی المناک داستان لکھنی شروع کردی، مجھے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے، یہ خط انھیں رئیس صاحب کا ہے،کل کا مزدور لڑکا آج اسی رئیس کی نگاہ میں قصبہ کا معزز فرد کیسے بن گیا؟ احسان صاحب کی اس دل خراش داستان کو سن کر تو ہم لوگوں پر سکتہ طاری ہوگیا اور احسان صاحب کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی ہماری آنکھیں بھیگ گئیں، پھر جب بچپن کی بات نکل پڑی تو انھوں نے اپنی غربت وافلاس کے دنوں کے کئی دلدوز واقعات سنائے۔

انھوں نے بتایا کہ ہم یوپی کے رہنے والے مزدوروں کا ایک گروہ تھا، دن میں کسی زیرِتعمیر عمارت میں گارے مٹی کا کام کرتے اور شام کو جب چھٹی ہوتی تھی تو وہیں سے ٹوٹی پھوٹی دیودار کی لکڑیوں کے تختے اور پٹریاں اٹھالاتے، لاہور کی سردی مشہور ہے، ہم لوگوں کے پاس لحاف وغیرہ نہیں تھا، انھیں دیودار کی تختیوں کو جلا کر تاپتے تھےاور اسی الاؤ کے قریب سو جاتے تھے،انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک پنسل خرید لی تھی، ادھر ادھر سے ردی کاغذ کے ٹکڑے اٹھالیتا، جب آگ کا الاؤ روشن ہوتا تو اس کی روشنی میں اشعار لکھا کرتا تھا، میرے مزدور ساتھی مجھے لکھتے ہوئے دیکھ کر کہتے کہ ’’سالا ساعری کرتا ہے‘‘ انھوں نے بتایا کہ اسی مزدوری کے زمانہ میں میں نے اپنی سب سے پہلی نظم لائل پور (حال فیصل آباد) کے ایک مشاعرے میں سنائی تھی، میری نظم اور میرے پڑھنے کے انداز نے لوگوں کو متحیر کردیا کہ یہ مزدور صفت لڑکا آج مشاعرے پر چھا گیا، بہتوں کی زبان پر تھا، کہتے کہ پھر اس کے بعد میری ہمت کھل گئی اور مشاعروں میں جانے لگا۔

احسان صاحب بہت حساس، بڑے خوددار اور غیرت وحمیت کے پیکر تھے، کہیں بھی اپنی غیرت وخودداری کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ لاہور کے

بہت سے شاگرد بعد میں بڑے عہدوں پر پہونچ گئے اور آج وہ اونچی کرسیوں پر ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ میں کبھی کبھی ان سے ملوں، وہ میرے ساتھ کچھ سلوک کرنا چاہتے ہیں اور تعاون دینا چاہتے ہیں، مالی امداد دینا چاہتے ہیں، وہ خوشامدیں کرتے ہیں مگر ان کے پاس جانے کو میری غیرت نے کبھی قبول نہیں کیا، اس لئے میں آج تک اپنے کسی شاگرد کے پاس نہیں گیا، اگر اس طرح کے شاگرد مجھے دعوت بھی دیتے ہیں تو ہمیشہ ٹال جاتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے ساتھ کوئی احسان کریں اور میری گردن جھک جائے۔ **الانسان عبد الاحسان**، خدا نے مجھے جو عزت دی ہے وہی میرے لئے بہت ہے، وہ یا تو تخت پر سوتے ہیں یا زمین پر، ایک دن میں نے پوچھا تو بتایا کہ مزدوری کے زمانہ سے یہ عادت پڑی ہوئی ہے، مجھے اسی پر آرام ملتا ہے، گھر میں پلنگ اور مسہریاں پڑی ہوئی ہیں مگر میں کبھی ان پر نہیں سوتا، اور شاید کبھی سو جاؤں تو ممکن ہے رات بھر نیند ہی نہ آئے، اس لئے میں تخت یا زمین پر سوتا ہوں، سادگی ان کی طبیعت اور فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے، احسان صاحب نے ہم لوگوں کو بہت متاثر کیا اور ہمارا لاہور حضرت احسان کی شخصیت میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔

لارنس گارڈن........................

لاہور میں مجھے چند ہی مہینے رہنے کی نوبت آئی، پھر بھی لاہور کے کئی رُخ دیکھے، لاہور کا کشمیری بازار کتابوں کا شہر معلوم ہوتا ہے، ادبی رسالوں کا مرکز لاہور ہے، اتنے شاندار اردو کے ادبی رسالے اور اتنی بڑی تعداد میں اور کہیں سے نہیں نکلتے تھے، لاہور شہر کے بہت سے مقامات قابل دید تھے، لاہور کے خوبصورت مقامات میں ایک لارنس گارڈن بھی تھا جس کو بعد میں جناح پارک کا نام دیدیا گیا، وہ بہت ہی وسیع وعریض اور بڑا حسین وجمیل پارک ہے، اس وقت میں نے اتنا خوبصورت پارک نہیں

دیکھا تھا، ہر طرف پھولوں کا انبار نظر آتا تھا جیسے وہاں رنگ ونور کی بارش ہو رہی ہے، مصنوعی پہاڑیاں پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہیں، پہاڑیوں پر جانے کے لئے جو زینہ بنایا گیا ہے، وہ دورُ ویہ خوبصورت پھولوں کے پودے لگا کر زینوں پر سایہ کر دیا گیا ہے، جب زینوں پر چڑھئے رنگ برنگ کے پھول آپ کا منہ چومنے کی کوشش کرتے ہوئے ملیں گے، آپ ان کو ہاتھوں سے روکتے ہوئے آگے بڑھیں گے تو چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آئیں گے کہ آپ ان رنگوں کو لفظوں میں ادا کرنا چاہیں تو آپ کے الفاظ کا سرمایہ ختم ہو جائے گا، پودوں میں تازگی وشادابی کچھ ایسی محسوس ہوتی تھی جیسے ابھی ابھی ان کو کوثر وتسنیم کے پانی سے بڑے اہتمام سے غسل دیا گیا ہے، جب مصنوعی پہاڑیوں کے اوپر مسطح زمین پر جائیں گے تو زمین پر خوب ہری دوب کا دبیز قالین بچھا ہوا ملے گا، پہاڑیوں سے اتر کر جب ہم پارک کی روشوں پر دور تک گئے تو دیکھا کہ تھوڑی تھوڑی دوری پر بنچیں پڑی ہوئی ہیں، قد آدم پودے اپنی ہری ہری پتیوں اور رنگ رنگ کے پھولوں سے سایہ کئے ہوئے ہیں اور چاروں طرف خوبصورت باڑھ اور خوشبودار پھولوں کے پودے لہلہا رہے ہیں اور اس طرح جھوم رہے ہیں جیسے کوئی زہرہ جمال رقاصہ بل کھا رہی ہے، پارک میں جو روشیں نکالی گئی ہیں ان پر دورُ ویہ خوشبودار پھولوں کی قطاریں ہیں جو بڑی فیاضی کے ساتھ اپنی خوشبو لٹا رہے ہیں جیسے کسی ماہ جبیں کی زلف معنبر کھل گئی ہے، تھوڑی تھوڑی دوری پر .... پودوں کے ایسے کنج بنائے گئے ہیں کہ پھولوں سے لدی جھومتی ہوئی ڈالیوں کے سائے مین دو آدمی لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر آرام سے عشق ومحبت کا جلترنگ چھیڑ سکتے ہیں، کئی کنجوں میں ہم نے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ احتیاط کی چادر اتار کر بیٹھے ہوئے دیکھا، شاید شب میں انھوں نے سنہرا خواب دیکھا تھا اس کی

تعبیر ڈھونڈ رہے تھے۔

مقبرہ جہانگیر........................

لاہور میں دیکھنے کے لائق ایک مقام شاید وہ بھی ہے جہاں شہنشاہ جہانگیر کا نہایت خوبصورت مقبرہ ہے جو دریائے راوی کے ساحل پر واقع ہے، مقبرہ کی عمارت بہت ہی بلند و بالا، دودھ کی طرح سفید سنگ مرمر کی حسین و جمیل عمارت ہے، یہ اتنا پُر فضا مقام ہے کہ یہاں آ کر شہر خموشاں یا قبرستان کا تصور ختم ہو جاتا ہے، اتنا صاف شفاف اور پاکیزہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر نے ابھی ابھی اس کی تعمیر سے فارغ ہو کر قلعی کی ہے، آئینہ کی طرح اس کی دیواریں چمک رہی ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ اگر ان پر ہاتھ رکھ دیا جائے تو اُس پر دھبہ پڑ جائے گا، کچھ ایسی صاف شفاف عمارت ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر بلند و بالا گنبد ہیں اور اتنی نفاست سے بنائے گئے ہیں کہ جیسے معلوم ہوتا ہے کہ سنگ مرمر کا کوئی خوبصورت مجسمہ کسی ماہر کاریگر نے تراش کر کھڑا کر دیا ہے، قبر کا تعویذ سفید چکنے سنگ مرمر کا ہے اور اس میں سنگ موسیٰ کو تراش کر آیاتِ قرآنی اتنی خوبصورتی سے لکھی گئی ہیں جیسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی ماہر کاتب نے خوب کالی روشنائی میں قلم ڈبو کر لکھ دیا ہے، حروف کے نوک پلک اتنے سجل اور درست ہیں کہ پتھر تراشنے والوں کی صناعیوں اور کاریگری پر حیرت ہوتی ہے، عمارت کی چھت پر بھی ہم لوگ چڑھے، کہا جاتا ہے کہ اس چھت سے شہر کی جامع مسجد کے میناروں کو دیکھئے تو چار کے بجائے صرف تین ہی مینار نظر آئیں گے اور چوتھا مینار نظر نہیں آئے گا چاہے چھت کے کسی حصہ سے دیکھئے، ہم نے بھی اس کا تجربہ کیا، اس مقبرہ سے چند قدم کے فاصلے پر ملکہ نور جہاں کے بھائی آصف کا بھی مقبرہ ہے یہ کافی خوبصورت ہے صفائی اور پاکیزگی میں اس سے کمتر نہیں ہے مگر جہانگیر کے مقبرے کے مقابلے

میں چھوٹا ہے۔

نور جہاں کی قبر.......................

میں نے دل میں سوچا کہ جہانگیر کے مقبرہ کے ساتھ یہیں کہیں نور جہاں کا بھی مقبرہ ہونا چاہیئے، میں نے علامہ شبلی کی نظم عدل جہانگیری پڑھی تھی، ع

ایک دن بام پہ تھی نور جہاں جلوہ فگن

جہانگیر اور نور جہاں ہندوستان کے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، وامق وعذریٰ تھے، نور جہاں ایران کی ایک معمولی عورت تھی جو ایک فوجی افسر کی بیوی تھی جس کا نام شیر افگن تھا اور ایک بچی کی ماں تھی یعنی نور جہاں کو کلی سے پھول بن کر اپنی خوشبو لٹاتے ہوئے دیر ہو چکی تھی اب اس کی پنکھڑیوں کی تازگی وشادابی اُداس ہونے لگی تھی مگر دل کے آنے کے انداز نرالے ہوتے ہیں، نور جہاں شاہی محل میں عام عورتوں کی طرح رہتی تھی جہانگیر نے کبھی اس کی جانب محبت کی نظر سے نہیں دیکھا تھا، لیکن اس میں کوئی نہ کوئی جوہر ضرور تھا جس نے جہانگیر کے دل کو مٹھی میں لے لیا، جہانگیر کی نگاہیں اس پر بار بار پڑتی تھیں مگر مقناطیسیت کا کبھی کوئی احساس نہیں ہوتا تھا، ربابِ دل مضراب سے ناآشنا ہی رہا کہ ایک واقعہ ہو گیا۔

جہانگیر کو ایامِ شاہزادگی میں کبوتروں کا بڑا شوق تھا، بہت سے کبوتر پال رکھے تھے، ان کو دوڑ دوڑ کر پکڑتا اور اُڑاتا رہتا تھا، ایک دن اس نے دو کبوتر پکڑے، اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی ملے تو اس کو یہ کبوتر دے کر دوسرے کبوتروں کو پکڑے، وہیں کہیں نور جہاں کھڑی تھی، جہانگیر نے دونوں کبوتروں کو اسے دیا کہ ان کو پکڑے رہو میں دوسرے کبوتروں کو پکڑنے جا رہا ہوں، پھر وہاں سے چلا گیا، جب پلٹ کر آیا تو دیکھا کہ نور جہاں کے ہاتھ میں ایک ہی کبوتر ہے، اس نے خشمگیں انداز میں پوچھا

کہ دوسرا کبوتر کیا ہوا؟ اس نے کہا وہ تو اُڑ گیا، جہانگیر نے ترش روئی سے پوچھا کیسے اُڑ گیا؟ نور جہاں نے دوسرے ہاتھ کو سامنے کر کے کہا کہ اس طرح اُڑ گیا اور مٹھی کھول دی، جہانگیر نور جہاں کی اسی ادا، معصومانہ سادگی پر مر مٹا، اور نور جہاں کا دیوانہ ہو گیا، اس نے نور جہاں کے چہرے پر ایک محبت پاش نظر ڈالی اور مسکرا رہ گیا، محبت کے دیوتا کیوپڈ نے اپنے ترکش کا ایک تیر نکالا اور جہانگیر کے دل میں پیوست کر دیا، اور ایک معمولی عورت نے ایک شہنشاہ کو شکار کر لیا۔

پھر ایک شادی شدہ عورت نور جہاں کیسے ملکہ بن گئی اور پورے نظامِ حکومت پر حاوی ہو گئی؟ یہ داستان تو آپ کو مؤرخ سنائے گا، مجھے اس سے سروکار نہیں البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ نور جہاں جہانگیر کی بیوی ہی نہیں تھی بلکہ جہانگیر کے پردے میں ہندوستان پر حکمرانی کر رہی تھی، اس کا ہر لفظ قانون اور اس کا ہر فرمان واجب الاذعان تھا اور اس کی ہر نگاہ فیصلہ کن تھی، اس کا ہر مشورہ مشورہ نہیں حکم تھا، جہانگیر مئے ارغوانی میں غرق تھا، صہبا و ساغر سے اسے فرصت نہ تھی مگر شراب کے نشہ سے زیادہ اس کے دل و دماغ پر نور جہاں کی محبت اور عشق کا نشہ طاری تھا، جہانگیر کے دل میں نور جہاں کو کتنا بلند مقام حاصل تھا، علامہ شبلی نے یہ داستان سنائی ہے، اس داستان کے صرف ایک مصرعہ پر پوری یوسف زلیخا قربان کی جا سکتی ہے، شبلی نے بتایا کہ نور جہاں ایک غیر قانونی قتل کی ملزم بن گئی، جرم ثابت ہو چکا تھا بلکہ خود نور جہاں اقبالی مجرم تھی، قاضی نے قصاص میں نور جہاں کے قتل کا حکم دیدیا اور جلاد کو حکم دیدیا کہ سر قلم کر دیا جائے، چالاک نور جہاں نے مقتول کے ورثہ کو ایک بڑی رقم دے کر دعویٰ سے دست برداری پر آمادہ کر لیا اور خون بہا دے کر نور جہاں کی جان بچ گئی، جہانگیر نے انصاف کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے دل پر پتھر کی سل رکھ لی اور نور جہاں کے قتل کا فیصلہ سنا دیا تھا

لیکن خون بہا ادا کرنے کے بعد قانونی طور پر اس کی جان بچ گئی تو جہانگیر دربار سے اُٹھ کر محل کے اندر گیا اور نور جہاں کے قدموں پر سر رکھ کر کہا:

تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ کردم من؟

نور جہاں اور جہانگیر کے عشق و محبت کی یہ دل گداز اور خوبصورت داستان میرے ذہن میں تھی اس لئے خیال تھا کہ نور جہاں کا مقبرہ جہانگیر کے مقبرہ سے بھی شاندار نہیں تو کم از کم اس کے مقبرے جیسا ضرور ہوگا، سیاحوں اور سیر کرنے والوں سے پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ ریلوے لائن کے اس پار نور جہاں کی قبر ہے، ہم لوگ وہاں پہونچے تو دیکھا کہ ایک اُجاڑ سی جگہ ہے جہاں ویرانی اور وحشت برستی ہے، وہیں ایک چھوٹا سا محدب بھدا سا چونے گچ کا بنا ہوا گھروندہ ہے، اس میں داخلہ کے لئے چار فٹ کا چھوٹا سا دروازہ ہے، اس میں نہ کواڑ ہے نہ دروازہ، اندر کچی مٹی کی زمین ہے جو دھول سے اٹی ہوئی ہے اور کتے لوٹ رہے ہیں، اسی گھروندے میں چونے گچ کی ایک قبر ہے، ایک پتھر پر نور جہاں کا نام کندہ کرا کے کسی نے لگا دیا ہے، وہ بھی سیکڑوں سال بعد، اس عبرتناک منظر کو دیکھ کر دل بیٹھنے لگا کہ کہاں وہ ملکہ نور جہاں کہ

اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

آج اس عبرت کدہ اور وحشتناک مقام پر اس طرح سو رہی ہے کہ کوئی اس پر نگاہ غلط انداز بھی ڈالنے والا نہیں ہے، اس کی قبر پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا نہیں، دل اس کی قبر کی ویرانی کو دیکھ کر بجھ گیا، ہم اُداس اداس بوجھل قدموں سے واپس لوٹے ساری تفریح کرکری ہو کر رہ گئی۔

بعض دوسرے مقامات کی سیر

ایک دن ہم لوگ لاہور کی عظیم الشان شاہی مسجد دیکھنے نکلے، یہ مسجد دہلی کی

جامع مسجد ہی کی طرح ہے، لیکن اس کا فرش اس کے مقابلہ میں بہت بڑا ہے۔اسی کے بالمقابل لاہور کے قلعہ کا بڑا گیٹ ہے، بیچ میں ڈاکٹر اقبال کی قبر ہے، جس پر چھتری بنی ہوئی ہے، جامع مسجد کی شمالی دیوار سے متصل راجہ رنجیت سنگھ مشہور سکھ حکمراں کا بنایا ہوا گرودوارہ ہے، یہ وہی راجہ رنجیت سنگھ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں جامع مسجد کے صحن میں گھوڑے اور گدھے بندھوائے تھے اور مسجد کو ناپاک کیا تھا، مسجد سے نکل کر ہم گرودوارہ میں گئے، یہ ایک بہت ہی سادہ وضع کا بنا ہوا چھوٹا سا گرودوارہ ہے، اندر بیچ کی محراب بہت خوبصورت سنگ مرمر کی ہے اس محراب میں سنگ مرمر کا ایک تخت بنا ہوا ہے، اس تخت پر رحل پر ایک ضخیم اور بڑے سائز کی ایک کتاب رحل پر رکھے ہوئے ایک سکھ پڑھ رہا ہے اور پندرہ بیس سکھ نیچے بیٹھے ہوئے عقیدت کے ساتھ خاموشی سے سن رہے تھے، گرودوارہ کے بعد سکھوں کا قبرستان ہے جہاں رنجیت سنگھ، بابا کھڑک سنگھ وغیرہ کی قبریں ہیں۔

شخصیات........................

لاہور میں جن شخصیتوں سے مجھے شرف ملاقات حاصل ہوا ان میں حضرت احسان دانش کے بعد مولانا عثمان فارقلیط کی خاموش اور کم سخن شخصیت تھی ۔ وہ اس بلڈنگ میں رہتے تھے جہاں ہم لوگوں کا قیام تھا، لیکن ان سے ملاقات کم ہی ہوتی تھی، ان سے میرے تعارف کی تقریب یہ ہوئی کہ میں لاہور پہونچ کر ابھی بیکار ہی تھا کہ اسی بیکاری کے ایام میں لاہور کی عظیم لائبریری جانے لگا جو ''پنجاب لائبریری'' کہی جاتی تھی۔ یہ ایک عظیم الشان لائبریری تھی، یہ لائبریری دو منزلہ ایک وسیع وعریض عمارت میں تھی۔فہرست کتب کے ان گنت رجسٹر میزوں پر ہال میں پڑے رہتے تھے، اتنی بڑی لائبریری ابھی میں نے کہیں نہ دیکھی تھی ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی میں نے

دنیا ہی کہاں دیکھی تھی۔ پھر بھی میں بہت متاثر ہوا اور مرعوب بھی، چونکہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے مجھے دلچسپی تھی اور اب تک میرے مطالعہ کا موضوع بھی یہی تھا۔ اس ملک کی آزادی میں ابھی کچھ دنوں کی دیر تھی، اس لئے میں نے ایک کتاب ''غداران وطن'' کے نام سے لکھنا شروع کر دی، اسی کتاب کے سلسلہ میں مجھے اکثر پنجاب لائبریری جانا پڑتا تھا، کتابیں نکلوا کر وہیں ایک میز پر میں نوٹ کرتا تھا۔ شب و روز محنت کے بعد دو ہفتہ کے اندر ہی کتاب تقریباً ڈھائی سو صفحات کی مرتب ہوگئی۔ کتاب کے مقدمہ میں میں نے بڑا زور قلم صرف کیا تھا، جب کتاب کا مسودہ میرے دوست مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے مولانا عثمان فارقلیط کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے مقدمہ پڑھ کر کہا کہ یہ تو کوئی کہنہ مشق اہل قلم کی تحریر ہے۔ قلم میں بڑا زور ہے۔ الفاظ پر تو اس کی حکمرانی معلوم ہوتی ہے۔ اپنی تعریف سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ قدرتی طور پر مجھے اس سے خوشی ہوئی اور حوصلہ ملا کیوں کہ یہ تعریفی جملے میری عدم موجودگی میں کہے گئے تھے اس مجلس میں موجود نہیں تھا۔

فارقلیط صاحب گداز بدن اور دوہرا جسم ہونے کی وجہ سے ذرا سا پستہ قد معلوم ہوتے تھے، رنگ صاف تھا سادہ لباس اور بالدار ٹوپی پہنتے تھے اور گردن جھکا کر چلتے تھے۔ بیڑی بہت پیتے تھے۔ جب لکھنے کیلئے بیٹھتے تھے تو بیڑی اور ماچس ان کی میز پر ہمیشہ رکھی رہتی تھی۔ قلم میں بڑا زور تھا، ان کی تحریر میں ان کے دلی جذبات بولتے تھے۔ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل پر لکھتے تھے۔ تو درد اور سوز و گداز کے زیر اثر لکھتے تھے، اس لئے ان کی تحریروں کو پڑھ کر کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی تحریر دلوں کو چھو لینے والی ہوتی تھی۔ میں لاہور میں جن دنوں بیمار تھا تو میرے لئے پرہیزی کھانا انہیں کے گھر سے آتا تھا۔ لاہور میں

یوں تو کھانا میں پیسہ اسٹریٹ میں کھاتا تھا جہاں ایک معمولی سا ہوٹل تھا۔ ''غداران وطن'' کا مسودہ لاہور سے واپسی میں ساتھ لایا تھا لیکن بعد میں نہ جانے کہاں گم ہوگیا۔

دوسری شخصیت ابوسعید بزمی کی تھی۔ وہ بھوپال کے رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں مشہور سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' بجنور کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی تحریر سلیس اور بڑی رواں دواں ہوتی تھی۔ اس دور میں سیاسی چپقلش اپنے عروج پر پہونچ چکی تھی تو بزمی صاحب نے ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم سیاست دانوں سے مسلمان کیا کریں کے عنوان پر لکھنے کی اپیل کی تھی۔ پھر ان سارے مضامین کو ایک ضخیم جلد میں شائع کیا تھا، اس پر اداریہ بہت ہی مفصل لکھا تھا جس سے ان کی سیاسی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا تھا اور ان کا زورِ قلم بھی ظاہر ہوتا تھا اسلئے میں ان سے متاثر تھا، وہ ایک دن اخبار زمزم کے دفتر میں قاضی صاحب سے ملنے آئے، میں وہیں موجود تھا۔ کشیدہ قامت، رنگ صاف مگر چہرہ چیچک کے گہرے داغوں سے داغدار تھا۔ بہت جامہ زیب علی گڑھ پاجامہ اور شیروانی، سر کھلا ہوا، بالوں کا ایک گچھا ان کی پیشانی پر لہرا رہا تھا، بس ان سے یہی ایک ملاقات ہوئی۔

ایک اور شخصیت لاہور میں علامہ تاجور نجیب آبادی کی تھی۔ غالبًا وہ کسی سرکاری رسالہ کے ایڈیٹر تھے اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے لاہور میں بڑے اعزاز واحترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ قاضی صاحب ایک بار ان سے ملاقات کیلئے لے گئے، دوہرے بدن کے بے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ بھاری بھرکم وجود کے مالک تھے، اس زمانہ میں شاید ایک ادبی رسالہ ''شاہکار'' نکالتے تھے۔ بس ان سے دید وشنید ہی رہی اور ان کے ساتھ ایک چائے پی، پھر دوبارہ ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔

ایک صاحب اور تھے جن کا نام بھول رہا ہوں، انہوں نے ایک ویکلی اخبار

پنجاب فلم کا ڈکلریشن خرید لیا تھا، وہ ملتے رہتے تھے۔ بعد میں انہوں نے نوائے پاکستان کے نام سے ایک ویکلی اخبار نکالا، اس اخبار کیلئے میں نے کئی نظمیں اور افسانے لکھے۔ میری نظم نکتہ چیں سے اسی اخبار کے فرنٹ پیج پر جلی قلم سے شائع ہوئی تھی۔ ہینڈ بیگ، اور اسپتال دو افسانے بھی اس میں شائع ہوئے۔ اس وقت ڈاک میں سہولت تھی، اخبار بھی آتا تھا، ان کے علاوہ چھوٹے دوستوں اور ملنے والوں میں مشہور ناول نگار اظہار اثرؔ اور عشرت کرتپوری تھے جنہوں نے بعد میں اچھی شہرت حاصل کی، دہلی اور بجنور میں آج کل رہتے ہیں۔

لاہور سے واپسی..................

غالباً پانچ چھ مہینے میں لاہور میں رہ سکا، میں وہاں مسلسل بیمار رہنے لگا اس لئے کوئی کام بھی تلاش نہ کر سکا۔ البتہ زمزم کے دفتر میں اکثر جایا کرتا تھا، لاہور کی سردی میرے لئے وبال جان بن گئی میں شب وروز بستر علالت پر رہنے لگا، کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ ایک دن قاضی صاحب نے شدید بخار کی حالت میں اسٹیشن پہونچایا اور طوفان میل کے ایک ڈبے میں بڑی مشکلوں سے سوار کرا دیا، اور میں وطن واپس آ گیا۔

مقامی مدرسہ کی نظامت..................

میرے وطن ادری میں فیض الغرباء مدرسہ کے ٹوٹنے کے بعد ایک عرصہ تک کوئی باضابطہ مدرسہ نہیں رہا۔ کچھ لوگوں کی تگ ودو کے بعد جو مدرسہ قائم ہوا اس کی تعمیر میں سب سے اہم کردار مولوی محمد ظہور صاحب مرحوم نے ادا کیا۔ جو میرے بچوں کے حقیقی نانا تھے۔ بڑی جفاکشی اور کثیر اخراجات سے ایک لمبا ہال اور بہت ہی بڑا

سائبان جامع مسجد کے قریب مشرقی جانب پختہ اینٹوں سے تعمیر کرادیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع کروایا، مدرسہ کا نام چشمۂ فیض رکھا گیا۔ ابتداء میں ایک مدرس کام کرتے تھے ایک صوفی صاحب کو اس کا انتظام سپرد کیا گیا، لیکن ان سے نظم نہ ہوسکا۔ تو رفیق مکرم مولانا عبدالمجید قاسمی کو بار نظامت سپرد کردیا گیا و رانہوں نے ایک مدرس کا اور اضافہ کیا۔ ۱۹۴۵ء کے آخر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جب میں لاہور سے ابتداء ۱۹۴۷ء میں وطن واپس آیا تو مدرسہ کی کمیٹی نے مجھے ناظم اعلیٰ منتخب کرلیا اور میرے رفیق قدیم مولانا محمد قاسمی کو نائب ناظم بنایا گیا، میں ان دنوں کریم آباد میں رہتا تھا۔ والد صاحب نے جونپور کی رانی دھن دیوی سے ۲۸ بیگہہ زمین اندارا اسٹیشن کے شمالی جانب خریدی تھی۔ اور وہاں ایک مسلم آبادی قائم کرائی تھی۔ جب ۲۵۔۳۰ مکانات تعمیر ہوگئے اور ایک مسجد بھی بنوادی تو ہمارا پورا خاندان وہیں منتقل ہوگیا تھا لیکن ادری کا قدیم مکان فروخت نہیں کیا تھا، اس میں کرایہ دار رکھ دیا تھا۔ جب مدرسہ کی ذمہ داری میرے سر آئی تو میں بھی اپنے قدیم مکان میں جو ادری میں تھا آکر رہنے لگا، چونکہ زندگی بھر مدرسوں سے ہی تعلق رہا اس لئے جب ایک مدرسہ کے نظام کو چلانے کی ذمہ داری کندھوں پر آئی تو پوری دلچسپی اور لگن سے کام شروع کردیا۔

اس مدرسہ میں اس وقت سب سے پہلا اور اہم مسئلہ مالیات کا تھا، جب تک معقول آمدنی نہیں ہوگی تب تک ترقی کی راہیں مسدود رہیں گی۔ اس لئے عوامی بیداری پیدا کرنے کیلئے دوسرے مقامات کے تجربے و مشاہدات سے میں نے فائدہ اٹھایا، اس مدرسہ کا سالانہ چندہ چند سو سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ دو مدرس کی تنخواہیں بارہ بارہ روپئے تھیں اور صدر مدرس کی غالباً سولہ روپئے تھے۔ یا اٹھارہ روپئے، کچھ صحیح یاد نہیں۔ سالانہ/۴۸۰ روپیہ خرچ تھا۔ باہر کے لڑکے یہاں نہیں پڑھتے تھے، پھر بھی

تنخواہیں اکثر باقی رہتی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ پہلے دن جو عمارت بن کر تیار ہوئی تو پھر اس پر کوئی مزید کام نہیں ہوا، مٹی کا کچا فرش تھا۔ دیواریں پلاسٹر سے محروم تھیں، چھت چونے اور گچ کی تھی۔ برسات میں چھلنی بن جاتی تھی۔ مگر آمدنی کم ہونے کی وجہ سے اس کی مرمت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ مدرسہ کی ساری آمدنی کا دارومدار گاؤں کی آمدنی پر تھا۔ اور وہ بھی صرف دیوبندی جماعت کے لوگوں سے جن کی مجموعی تعداد ڈیڑھ سو گھروں پر مشتمل تھی۔ اسی محدود دائرے کو اپنا مرکز بنانا تھا۔

طریقۂ کار میں تبدیلی........................

ہم نے گاؤں میں چندے کا طریقہ بدل دیا۔ مدرسہ کی ۲۱/افراد پر مشتمل باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل کی۔ گاؤں کے ممتاز اور بااثر افراد کو اس کمیٹی میں شامل کیا، کمیٹی بن جانے کے بعد اسکی ایک میٹنگ بلائی اور کوشش کی کہ کمیٹی کا ہر رکن اس میں شریک ہو، کمیٹی ہوئی، میں نے ان کے سامنے تجویز رکھی کہ گاؤں میں چندہ جلوس کے ساتھ کیا جائے، ہوسکتا ہے اس سے مدرسہ کی مالیات میں اضافہ ہو۔ کمیٹی نے میری رائے کی تائید کی بلکہ اپنے جوش وخروش کا بھی اظہار کیا۔ جب اتفاق رائے سے تجویز پاس ہوگئی تو میں نے کہا کہ اس جلوس کی رہنمائی ارکان کمیٹی کریں گے۔ یعنی کمیٹی کے ہر فرد کا جلوس میں رہنا ضروری ہوگا۔ میٹنگ ختم ہوگئی۔

دوسرے دن میں نے اپنے احباب کو جمع کیا ان کے تعاون سے اچھے اور خوش گلو اور بہترین نظم پڑھنے والوں کی ایک ٹیم بنائی اس ٹیم میں قصبہ کوپا گنج کے تین چار دوستوں کو شامل کیا۔ لالٹین گیس کرایہ پر حاصل کی گئیں، جب سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو بڑے بڑے قلمی پوسٹر لکھ کر تمام مسجدوں کے دروازوں پر چسپاں کرا دیئے جس میں چندہ کی تاریخ کا اعلان تھا۔ جامع مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے ایک پر جوش

تقریر کی۔عوام کی نفسیات کا تقاضا ہے کہ ان کے ماضی کے کاموں کو شاندار لفظوں میں بیان کیا جائے۔ان کی غیرت وانا کے تاروں کو چھیڑا جائے، ان کے آباد وجداد کے کارناموں کو سراہا جائے اوران کے حوالے سے ان کے دلوں میں جوش وخروش بھر دیا جائے تو پھر عوام سے ہر کام لیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں ان سارے حربوں سے کام لیا جس کا خاطر خواہ نتیجہ ہوا کہ جلوس میں پڑھنے کیلئے آٹھ دس نظمیں جن میں اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دیا گیا تھا پھر ان نظموں کے پڑھنے کی مشق کرائی، پڑھنے کا طرز وانداز درست کرایا۔ایک دوست کو تیار کیا کہ جب جلوس اس کے گھر پر پہونچے تو وہ چائے اور پان سے جلوس کی پذیرائی کرے۔ان تیاریوں کے بعد مقررہ تاریخ پر جلوس نکلا، ابتداء پہلے دوسرے دن تو پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ جلوس میں لوگ شریک نہیں ہوئے۔لیکن جب نظموں کی گونج گاؤں کی فضا میں لہرائی تو نعرۂ تکبیر اور زندہ باد کے نعروں سے فضا پرشور ہوتی چلی گئی۔تو دو تین دنوں کے بعد لوگوں کی دلچسپی بڑھی، پھر تو جماعت کا کوئی فرد امیر غریب، بوڑھے جوان اور بچے ٹوٹ کر اس طرح جلوس میں آئے کہ کسی کا گھر میں رہنا مشکل ہوگیا۔عوام کی بھیڑ سے گلیاں بھر جاتیں، ہر دم نئی نظموں کی فرمائش ہوتی، میری لنگڑی شاعری اس وقت بڑی تیز رفتار ہو چکی تھی، جلوس میں چلتے ہوئے پوری پوری نظم لکھ کر دے دیتا تھا۔ چندہ دینے والوں کی دیوانگی کا یہ حال تھا کہ نقد روپے دینے کیلئے کم معلوم ہوتے تو گھر کے زیورات، گھر کے برتن، کپڑوں کے تھان، تیار ساڑیاں حتیٰ کہ جانور تک چندہ میں دیدیتے تھے۔گھر کے اندر سے گھر کا جو فرد نکلتا ہاتھ میں دینے کیلئے کچھ لیکر نکلتا تھا۔جلوس جب تک نظم خوانی کرتا داد ودہش کا سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا۔ایک ایک گھر پر آدھا آدھا گھنٹہ صرف ہو جاتا تھا۔ برابر گھر میں سے کچھ نہ کچھ آتا رہتا تھا اور جب گھر کا مالک کہتا کہ اب لکھ لیجئے تو نعرۂ تکبیر

اور زندہ باد کے پرشور نعروں کے ساتھ جلوس اگلے گھر پر پہونچ جاتا۔ جلوس اکثر رات کے بارہ بجے اور ایک بجے تک گشت کرتا، ایک دو بار تو ایسا اتفاق ہوا کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ تب جلوس واپس ہوا۔ مہینوں میں یہ چندہ تمام ہوا، بے اندازہ رقم آئی۔ گاؤں کی تاریخ میں ایک نیا ریکارڈ قائم ہوگیا۔ عوام میں بے پناہ جوش وخروش تھا، ان میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی، مالی اعتبار سے مدرسہ مطمئن ہوگیا۔ مدرسین میں اضافہ کیا گیا۔ تنخواہیں بڑھا دی گئیں۔ دو بڑے بڑے نئے کمرے تیار کرائے گئے اور بقاعدہ طور پر دارالاہتمام قائم ہوگیا۔ پرانی عمارت کی مرمت کرائی گئی۔ اور مدرسہ کا نام پیشانی پر کندہ کرایا گیا۔

ایک جرأتمندانہ اقدام........................

جامع مسجد اور مدرسہ کی عمارت کے درمیان ۱۵ فٹ کا عام راستہ تھا۔ ذہن میں یہ بات آئی کہ مسجد کے فرش کو مدرسہ کے سائبان سے ملا دیا جائے تو صحن وسیع ہوجائے گا اور دونوں عمارتیں دیدہ فریب ہوجائیں گی۔ لیکن شاہراہ عام کو بند کرنا آسان کام نہیں تھا، کوئی بھی شخص اس کے خلاف قانونی کارروائی کرسکتا ہے۔ اپنے محسن احباب کو اپنا منصوبہ سمجھایا، انہوں نے اس کی تائید کی اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ بس ایک دن بہت سے مزدوروں کو بلا کر آناً فاناً جنوب وشمال میں دیواریں کھڑی کر کے راستہ بند کر دیا گیا اور پورے راستہ کو جو دونوں عمارتوں کے درمیان گلیارے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مٹی سے بھروا دیا اور راستہ بند ہوگیا۔ عوام کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ لیکن زمیندار طبقہ جو پورا کا پورا رضا خانی تھا اس نے پولیس میں رپورٹ کر دی کہ عام راستہ کو بند کر دیا گیا جبکہ اس راستے سے ہندوؤں کا ہولی کا جلوس گذرتا تھا اس راستہ کو فلاں فلاں نے بند کر دیا اور فساد کا اندیشہ ہے۔ رپورٹ میرے نام اور مولانا محمد قاسمی نائب ناظم کے خلاف تھی۔ مجھے اس کی

اطلاع ملی تو میں نے جماعت کے چند سر برآوردہ افراد کو بلا کر کہا کہ آپ لوگ فوراً چند سر برآوردہ ہندوؤں کو بلا کر بات کر لیجئے اور ان کو راضی کر لیجئے اور ان کو یقین دلا دیجئے کہ تمہارے جلوس میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی ۔ ہم لوگ مسجد کے عقب سے جو شاہراہ عام ہے اس سے تم لوگوں کا جلوس گزاریں گے، جلوس گزارنے کی ذمہ داری ہماری ہوگی ۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا، ہندو اس پر تیار ہو گئے ۔ جب تھانیدار تفتیش میں آیا تو ان ہندوؤں سے بیان دلوا دیا گیا کہ ہمیں راستہ بند ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ داروغہ مسلمان تھا، سمجھ گیا کہ یہ زمیندار پارٹی کی سازش ہے، اس نے رپورٹ لگا دی کہ یہاں راستہ کا کوئی سوال اور نزاع نہیں ہے، اطلاع غلط ہے ۔

ایک مسئلہ اور اٹھ گیا.........................

مدرسہ کے مشرقی جانب بہت بڑا تالاب ہے اسی تالاب کے حاشیہ پر مدرسہ کی عمارت ہے ۔ مدرسہ میں نئی تعمیر کیلئے اس سمت میں ایک فٹ بھی زمین نہیں تھی ۔ دوسرے یہ کہ مدرسہ کے پاس کوئی صحن نہیں تھا جہاں جلسہ وغیرہ کیا جا سکے ۔ کمیٹی میں میں نے یہ تجویز رکھی کہ مدرسہ کے مشرقی جانب تالاب کے کنارے مٹی بھروا دی جائے اور اس کو مسطح کرا دیا جائے تو مدرسہ کا صحن بن سکتا ہے ۔ اتنے دنوں کام کے بعد عوام کا اعتماد مجھ پر بڑھ چکا تھا، میرے اشارے پر وہ بڑے بڑے اور اہم سے اہم کام کیلئے تیار ہو جاتے تھے ۔ یہ تجویز منظور ہو گئی ۔ اور سینکڑوں مزدور لگا کر مٹی بھروانے کا کام شروع ہو گیا ۔ پہلی بار تقریباً ۳۰ فٹ چوڑی اور بیس فٹ لمبی سطح زمین پر بن گئی ۔ جہاں ایک فٹ زمین پاؤں رکھنے کی نہیں تھی وہاں اتنا لمبا چوڑا صحن نکل آیا تو لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب کی بار چندہ کا جلوس جس دن ختم ہو اس کے دوسرے دن شکریہ کا جلسہ کیا جائے اور دعوت کا انتظام کیا جائے ۔ اس

دعوت کا بار مدرسہ پرنہیں ہوگا، اپنی جیب سے پورا کریں گے۔ زمیندار طبقہ کی دناءت پھر سامنے آگئی، دو زمینداروں نے تھانے میں اطلاع دی کہ تالاب ہمارا ہے۔ اس پر فلاں فلاں ناجائز قبضہ کررہے ہیں، مجھے اس کا علم ہوا تو اس کی پیش بندی ضروری سمجھی میں ایک آدمی تھانے میں بھیج کر یہ پتہ چلایا کہ درخواست دینے والے کون کون لوگ ہیں؟ نام معلوم ہونے کے بعد کمیٹی کے بعض معزز ارکان سے کہا کہ آپ لوگ فلاں فلاں زمیندار کو دعوت میں مدعو کریں اور کسی طرح ان کو راضی کرلیں کہ وہ کھانے میں شریک ہوجائیں۔ جب شکریہ کا جلسہ ہوا تو وہ آئے لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر تھے، کھانا کھایا دسترخوان پر لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ زمین کو مدرسہ پر چندہ دیدیں تو انشاءاللہ آپ کو ضرور اجر ملے گا۔ اور ہمارے مدرسہ کا کام بھی بن جائے گا، یہاں دین کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس ثواب میں آپ حضرات بھی شریک ہوجائیں تو بہتر ہوگا۔

جلسہ میں میں نے شکریہ کی تقریر کی، اسی دوران ان دونوں سے اعلان کرادیا گیا کہ ہم مدرسہ کو یہ زمین بخوشی دیتے ہیں۔ ہمیں مدرسہ کے قبضہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اس طرح یہ اٹھتا ہوا فتنہ وہیں بیٹھ گیا۔

اسی طرح کی شب وروز جدوجہد کے بعد مدرسہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا، مالی اعتبار سے بھی مطمئن تھا۔ مدرسین کی تعداد میں مزید اضافہ کیا گیا اور حالات کے پیش نظر مدرسین کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا گیا۔

سیاسی سرگرمیاں:.........................

۱۹۴۵ء کے آخری اور ۱۹۴۶ء کے ابتدائی مہینوں میں پہلا الیکشن ہوا، وہ تشکیل حکومت کے بجائے استصواب رائے کا الیکشن تھا کیونکہ کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزش شباب پر تھی۔ لیگ کا مطالبہ پاکستان اب اتنا طاقتور ہوچکا تھا کہ برطانوی

حکومت کیلئے اس کونظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ ہندوؤں میں تو سوائے کمیونسٹ پارٹی کے سب کے سب تقسیم ہند اور پاکستان کے مخالف تھے۔ البتہ مسلمانوں میں دو نقطۂ نگاہ کے لوگ تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت تو تحریک پاکستان کی ہم نوا تھی، اور تیس فی صدی مسلمان جو جمعیۃ علماء سے وابستہ تھے یا براہ راست کانگریس میں تھے۔ وہ تحریک پاکستان کی شدت سے مخالفت کرتے تھے، انگریزی حکومت نے یہ جاننا چاہا کہ پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ یا کچھ ہی لوگ تحریک پاکستان کے حامی ہیں۔ اس لئے یہ الیکشن ہوا تھا اسی لئے الیکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر تھا۔ مسلمان مسلمان کو ووٹ دے گا اور ہندو ہندو کو۔ ہندوؤں میں کانگریس کے مخالف خال خال تھے جو اس زمانہ میں مہا سبھائی کہے جاتے تھے۔ اس لئے کانگریس ہندوؤں میں سونی ہوئی کامیاب رہی، البتہ مسلمانوں کے لئے یہ الیکشن معرکۂ کارزار ثابت ہوا۔ بڑے ہنگامے ہوئے، مار پیٹ ہوئی۔ قتل تک کی نوبت آئی۔ تنہا مسلم لیگ نے ۷۰ فیصدی سیٹیں جیت لیں اور جمعیۃ علماء اور اس کی ہم نوا پارٹیاں مل کر صرف ۳۰ فیصدی سیٹیں پا سکیں۔ پاکستان کو مسلم لیگ کا مطالبہ تھا وہ مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔ میں طالب علمی کے دور سے جمعیۃ علماء سے وابستہ تھا، کانگریسی اور کھلا نیشنلسٹ تھا، مدرسہ کے صدر مدرس مولانا محمد امین صاحب جو میری بیوی کے حقیقی چچا تھے وہ کٹر لیگی تھے۔ ان کا تعلق مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری سے تھا، ان سے بیعت ہو گئے اور ہر ہفتہ فتحپور جایا کرتے تھے۔ حضرت تھانوی سے نسبت رکھنے والے تمام حضرات مسلم لیگ کے حمایتی تھے۔ یہاں تک تو غنیمت تھا، لیکن تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ وہ جمعیۃ علماء کے خلاف اور بزرگان جمعیۃ کے خلاف بڑے جارحانہ انداز میں جھوٹے الزامات لگاتے تھے اور مولانا حسین احمد مدنی زیادہ نشانے پر تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کو فطری طور پر دلی

تکلیف ہوتی تھی۔تقریروں میں ان کے خلاف زہر اگلا جاتا تھا، ان کی مذمت میں جلسوں میں نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔

ہمارے مدرسہ کے صدر مدرس ان مجلسوں میں قائدانہ رول ادا کرتے تھے، ادری کا خوشحال اور مالدار طبقہ سب لیگی تھا۔اور گاؤں کی قیادت انہیں چند مالداروں کے ہاتھ میں تھی۔ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ مسلم لیگ کی رضا کاروں کی تنظیم ۔''مسلم نیشنل گارڈ'' کا جلوس نکلتا تھا جو ہرے رنگ کی وردی میں ملبوس ہوتا تھا۔جلوس ہم لوگوں کے گھروں کے پاس رک کر بڑے دل آزار نعرے لگاتا تھا۔طنزیہ جملے کہتا تھا۔میرا اور میرے ساتھیوں کا اس دن چلنا دشوار تھا۔ٹھیک الیکشن کے دن لیگ کے رضا کاروں نے راستہ میں ہمارا جھنڈا چھین کر وہیں جلا دیا۔ بڑی مشکلوں سے ہم آدمیوں کو لیکر کوپا گنج پہونچے اوران کے ووٹ گزار دیئے۔ہم نے سینوں پر پتھر رکھ کر حالات کو برداشت کیا،نبرد آزمائی کی ہم میں طاقت نہیں تھی۔ ہماری تعداد کم بھی تھی اور ہم کمزور بھی تھے۔ بہرحال الیکشن گذر گیا، کچھ دنوں کے بعد حالات کی تلخی بھی ختم ہوگئی۔الیکشن کے بعد مرکز میں انٹریم گورنمنٹ (عبوری حکومت) بن گئی تو فضا کا تناؤ کچھ اور کم ہوگیا۔

صدر مدرس کا استعفاء........................

کچھ دنوں کے بعد مولانا محمد امین صاحب صدر مدرس مدرسہ نے اضافہ تنخواہ کی درخواست دی۔اب میری نفسیات جاگی ،سینہ میں چوٹ کھایا ہوا دل جذبۂ انتقام کو لیکر بیدار ہوا اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اخلاقی اعتبار سے میرے لئے درست نہیں تھا۔مگر نوجوانی کا جوش اندھا تھا۔

مدرسہ کی میٹنگ بلائی، مولانا موصوف کی درخواست کمیٹی کے سامنے رکھتے

ہوئے میں نے کہا کہ اگر مطالبہ کے مطابق یہ اضافہ کر دیا جائے تو کل ہی سارے مدرسین کی درخواستیں اضافہ تنخواہ کیلئے آجائیں گی۔اور ہرایک اسی تناسب سے اضافہ کا مطالبہ کرے گا۔اس طرح ماہوار خرچ میں اتنا اضافہ ہوجائے گا اور سال میں اس کا میزان اتنا ہوجائیگا، اور پھر سالانہ اتنی رقم فراہم کرنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہوں گی کیوں کہ عام چندہ کے علاوہ اور کوئی دوسرا آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے۔ان حالات اور مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ جو چاہیں فیصلہ کریں اس کا آپ کو اختیار ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنی وضاحت کے بعد کون اضافہ کرتا۔میٹنگ نے متفقہ طور پر درخواست کو نامنظور کر دیا۔ دوسرے دن جب مولانا موصوف کو اپنی درخواست کے بارے میں کمیٹی کا فیصلہ معلوم ہوا تو انہوں نے بڑی برہمی کا اظہار کیا اور غصہ میں استعفاء لکھ کر میرے پاس بھیج دیا۔ مجھے اسی کی توقع تھی، میرے منصوبے کے عین مطابق حالات بنتے جارہے تھے۔ایک ہفتہ کے بعد میں نے پھر میٹنگ بلائی اور کمیٹی کے سامنے مولانا موصوف کا استعفاء رکھا۔ یہاں بھی میں نے وہی نفسیاتی حربہ استعمال کیا،عوام کی نفسیات کو میں اب تک اچھی طرح پڑھ چکا تھا، اسی کو پیش نظر رکھ میں گفتگو شروع کی۔میں نے کہا کہ مولانا کے اس استعفاء کا مطلب یہ ہے کہ کمیٹی کا فیصلہ غلط ہے۔اور میں کمیٹی کا فیصلہ ماننے کیلئے تیار نہیں۔جس مدرس کے دل میں یہ خیال ہو کہ کمیٹی کے لوگوں کی میرے سامنے کیا حیثیت ہے؟ جس مدرس کے ذہن میں مدرسہ کے انتظامیہ کی کوئی وقعت نہ ہو وہ مدرسہ کا صحیح معنی میں خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔ممکن ہے انہوں نے یہ سمجھا ہو کہ مدرسہ میرے دم سے چلتا ہو۔میں نہیں رہوں گا تو مدرسہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ استعفاء گویا کمیٹی کیلئے ایک چیلنج ہے۔اب آپ حضرات جو چاہیں فیصلہ کریں۔اس کے مطابق آگے کی کارروائی ہوگی۔ظاہر ہے کہ اس اشتعال انگیز

وضاحت کے بعد استعفاء کی منظوری کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں رہ گیا تھا، اس لئے اتفاق رائے سے مولانا موصوف کا استعفاء منظور کرلیا گیا۔

معمولی سے معمولی آدمی کی بھی نفسیات یہی ہے کہ اس کو اپنی انا کی شکست کی برداشت نہیں ہوتی۔ میرے تمہیدی جملوں نے ارکان کمیٹی کو یہی تاثر دیا تھا کہ یہ ان کی انا کی شکست ہے۔ اس لئے ٹھیک وہی ہوا جو میری منشا تھی۔ استعفاء بہ اتفاق رائے منظور کرلیا گیا، مولانا موصوف کا مدرسہ سے تعلق ختم ہوگیا۔ اس غیر اخلاقی اقدام پر آج تک مجھے ندامت ہے۔ دارالعلوم مئو میں مولانا موصوف کے نقطۂ نگاہ کے لوگوں کا غلبہ ہے۔ اس لئے ان کو وہاں جگہ مل گئی اور عرصہ دراز تک تعلیم دی۔ آخر عمر میں حدیث کی کتابیں پڑھانے لگے تھے۔ آپ فاضل دیوبند علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگردوں اور قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہم سبق تھے۔ تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں ۱۹۷۵ء میں انتقال کیا۔

ہندوستان آزاد ہوگیا......................

سال بھر مرکز میں عبوری حکومت قائم رہی جو کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ حکومت تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم تھے۔ اور سردار پٹیل وزیر داخلہ، مولانا آزاد وزیر تعلیم، مسلم لیگ کے تین وزراء تھے، نواب زادہ لیاقت علی خاں، راجہ غضنفر علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر مختلف محکموں کے وزیر تھے۔ وزیر مالیات لیاقت علی خاں تھے۔ پورے ملک میں امن وامان رہا۔ اور کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا جبکہ اس سے پہلے پورا ہندوستان پانی پت کا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہندو وزراء من مانی کر سکتے تھے۔ نہ تعصب کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ کیوں کہ مسلم لیگ کے وزراء ان کی کاٹ کیلئے حکومت میں فل پاور موجود تھے، اس تجربہ سے بھی لیگ والوں نے نہیں سمجھا کہ

متحدہ ہندوستان میں بھی مسلمان باعزت رہ سکتا ہے۔اور پورے ملکی نظام میں برابر کا شریک بن کر رہ سکتا ہے۔ان کا مطالبہ پاکستان اب بھی زوروشور سے جاری تھا۔۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم منظور کر لی گئی اور پاکستان تسلیم کرلیا گیا۔اور ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو رات میں ۱۲؍بجے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔

ریڈیو سے یہ خبر سنی گئی ،۱۶؍اگست کی صبح کو ہم نے جشن آزادی کے سلسلہ میں ایک جلسہ کیا ،اس وقت میری شاعری کا عنفوان شباب تھا۔ ہر موقعہ پر کوئی نہ کوئی نظم تیار ہوجاتی تھی ۔جشن آزادی کے اس جلسہ کیلئے رات ہی میں ایک نظم لکھ دی تھی ،اس نظم کے بعض متفرق اشعار اب بھی مجھے یاد ہیں ۔اس کے ہر شعر سے کتنی مسرت کا اظہار ہورہا ہے۔آپ دیکھیں ہر شعر دلی جذبات کا ترجمان تھا،نظم کا پہلا شعر تھا۔

لطف قدرت تجھ کو آخر آسرا دینا پڑا
قسمت ہندوستاں پر مسکرا دینا پڑا

یہ نظم تو ضائع ہوگئی مگر اس کے کہیں کہیں کے اشعار ذہن میں ہیں ،نظم میں انگریزوں سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

تم اصول بزم کے پابند رہ سکتے نہ تھے
آخرش اک روز محفل سے اٹھا دینا پڑا
تھپکیاں دیدے کے تم جس کو سلاتے تھے کبھی
آج اس شیر نیستاں کو جگا دینا پڑا

بقیہ اشعار صفحۂ ذہن سے مٹ گئے۔بس اس خوبصورت نظم کا آخری شعر یاد رہ گیا ہے۔

کل سر مغرور جس کا تھا فراز عرش پر
آج ذلت سے اسیرؔ اس کو جھکا دینا پڑا

مولوی حبیب الرحمٰن ندوی نے جلسہ میں اس نظم کو سنایا۔ میں نے تقریر کی، جلسہ میں صرف نیشنلسٹ طبقہ کے لوگ تھے، مسلم لیگ کے ہم نواؤں میں سے کوئی شریک اجلاس نہیں ہوا، ان میں تو صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ اب ان کا سارا نشہ اتر چکا تھا اور چند دنوں کے بعد تو وہ کونوں کھدروں میں چھپے پھرتے تھے۔ اور ہم لوگوں کی پناہ ڈھونڈھتے تھے۔ کیوں کہ کچھ ہی دنوں بعد کٹر لیگیوں کی انکوائری شروع ہوگئی تھی اور ان کو نکاسی قرار دیکر ان کی جائیدادیں محکمہ کسٹوڈین ضبط کر کے نیلام کرنے لگا تھا، ہائے ہائے کرتے تھے کوئی ان کی آہ وزاری پر کان دھرنے والا نہیں تھا، جتنے پر جوش اور بدزبان لیگی تھے وہ چور بنے ہوئے تھے۔

کوئی جائے پناہ نہیں.........................

پورے گاؤں میں بہت محدود تعداد میں لوگ ہم لوگوں کے ہم نوا اور ہمارے نقطۂ نگاہ کے تھے۔ لیگ والے اب بھی ہم سے دور ہی تھے۔ لیکن بہت جلد پورے ملک میں تقسیم کے نتیجہ میں ہندو مسلم دنگے، فسادات اور قتل و غارتگری کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا، سرکاری محکموں میں جتنے مسلمان ملازم تھے ان سے پوچھا گیا کہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہو یا پاکستان جانا چاہتے ہو؟ جس نے پاکستان کا نام لیا اس کا نام کاٹ دیا گیا اور نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ پاکستانی مان لیا گیا، کسی لیگی کو ہندوستان میں ملازمت نہیں مل سکتی تھی جو لوگ پاکستان چلے گئے ان کے پورے خاندان کی جائیداد ضبط کی جانے لگی، بلکہ اگر کسی نے جھوٹ موٹ پولیس میں رپورٹ کر دی کہ فلاں مسلمان پاکستان جانے کا ارادہ رکھتا ہے تب بھی اس کی جائداد پر محکمہ کسٹوڈین قبضہ کر لیتا تھا۔ اب لیگی بھگی بلی کی طرح پناہ ڈھونڈھ رہے تھے لیکن کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ جائداد کا خوف، جان کا خطرہ ہر ہر قدم پر ان کی روح کو چھلنی کئے

ہوئے تھا۔کل کے سورما آج کے انتہائی بزدل اور ڈرپوک انسان بن چکے تھے۔ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ حلق کی پوری طاقت سے چیخ چیخ کرنعرے لگاتے رہتے تھے، سینے پر گولی کھائیں گے، پاکستان بنائیں گے۔ پاکستان تو بن گیا،اب گولی کھانے کا وقت آیا تو سارا نشہ اتر گیا۔ ہر جگہ مسلمان خوف زدہ تھے۔اس نے اپنے کو مجرم سمجھ لیا تھا۔اور مجرم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔مسلمانوں کا ٹرینوں میں بسوں میں دیہاتی علاقوں میں سفر کرنا دشوار تھا۔مسلم آبادیوں پر ہندوؤں کے اجتماعی حملے ہورہے تھے۔ ہمارا گاؤں بھی اسی دہشت میں گرفتار تھا کیوں کہ سب کے سب پر جوش لیگی تھے ان کی بزدلی اورخوف زدگی کا کیاعالم تھا؟ صرف ایک واقعہ سےاس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

خوف اور سراسیمگی کا عالم.........................

اعظم گڑھ صدر سے ڈپٹی کلکٹر دورے پرآیا اس کے خیمے اندارا اسٹیشن کے مغربی جانب کے باغ میں لگ گئے۔اطراف وجوانب کے دیہاتوں اور گاؤں کے ہزاروں آدمی جمع ہوگئے ۔ یہ بھیڑ خالص ہندوؤں کی تھی۔گاؤں اور بلاک کی سطح کے سیاسی ورکر اور لیڈران بھی اس بھیڑ میں شامل تھے۔مجمع جب بڑھ گیا اور بھارت ماتا کی جے کے نعرے بلند ہوئے تو گاؤں کے مسلمان انتہائی خوف و ہراس میں مبتلا ہوگئے ۔اور پھر سے گاؤں میں افواہ گشت کرگئی کہ ادری پرحملہ ہونیوالا ہے۔جیسا کہ اس وقت پورے ملک میں ہورہا تھا،۔ان کا خوف و ہراس ایک دم بیجا بھی نہیں تھا کیونکہ حالات ہی ایسے تھے۔کسی مسلمان میں ہمت نہیں تھی کہ مجمع کےقریب جا کر پتہ چلاتا کہ یہ بھیڑ کیوں جمع ہوئی ہے؟ اوراس کے کیاارادے ہیں؟ وہ تو سمجھتے تھے کہ اس مجمع میں جومسلمان گیا سب سے پہلے قربانی کا بکرا وہی بنے گا۔نیشنل گارڈ جوادری میں لیگی رضا کاروں کی تنظیم تھی ہر جمعہ کو ہمارے دروازوں پرنعرے لگاتے ، ہم لوگوں کو

مسلمانوں کا غدار اور ہندوؤں کا غلام کہتے نہیں تھکتے تھے۔اس دن ہمارا گھروں سے نکلنا دشوار ہوتا تھا، وہ سب رو پوش ہو چکے تھے، یہاں کا خوشحال طبقہ جو یہاں لیگ والوں کا کمانڈر تھا وہ اپنے گھروں کے اندرونی کمرہ میں اس طرح گھس کر بیٹھے تھے جیسے خرگوش خطرہ کی بو سونگھ کر جھاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔

میرے ساتھی سیاسی درک میں شریک جو احباب ادری میں تھے ان کو اس کا علم ہوا تو افواہوں کے زور میں وہ بھی کچھ کہنے اور کرنے سے قاصر تھے۔خوف و ہراس کا ایسا دہشت بھرا ماحول تھا کہ انہوں نے بھی مجمع میں جانا دانشمندی کے خلاف تصور کیا۔

اشتعال انگیز تقریر........................

میں اس دن صبح کی ٹرین سے اعظم گڑھ گیا ہوا تھا اور دو بجے کی ٹرین سے میری واپسی تھی ۔ میرے دوست مولانا محمد قاسمی کو میرے پروگرام کا علم تھا اور اپنے ساتھ چار پانچ ساتھیوں کو لیکر اندارا اسٹیشن پر میری ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میں ٹرین سے اترا تو وہ لپک کر آئے اور صورت حال بتائی کہ حالات انتہائی خطرناک ہیں، پلیٹ فارم سے باغ کا مجمع نظر آ رہا تھا، انہوں نے مجھے دکھایا اور بتایا کہ پورے گاؤں پر سخت خوف و ہراس طاری ہے،کوئی بھی مسلمان گھر سے باہر نہیں نکل رہا ہے۔ خود ان احباب کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔

میں نے کہا گھبرانے کی کیا بات ہے۔آؤ میرے ساتھ چلیں دیکھیں کیسا مجمع ہے۔میں ان چاروں ساتھیوں کو لیکر سیدھا باغ میں پہونچ گیا، دیکھا کہ مجمع بہت بڑا ہے۔اور وہاں ایک اسٹیج لگا ہوا ہے۔ایک کرسی پر ڈپٹی کلکٹر بیٹھا ہوا ہے۔اور ایک کھدر پوش نیتا بڑی گرم تقریر کر رہا ہے۔وہ مسلمان بادشاہوں کے مظالم شمار کرا رہا تھا۔محمود غزنوی نے یہ کیا، اورنگ زیب عالمگیر نے یہ کیا۔ یہ بادشاہ مندروں کو توڑتے رہے،

لوٹتے رہے، اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بناتے رہے ۔ بڑی اشتعال انگیز تقریر تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ہندو مجمع کے دلوں میں آتش سیال بھرنے کی کوشش کرر ہا ہے۔اس نے جوں ہی تقریر ختم کی میں نے ڈپٹی صاحب سے جو جلسہ کی صدارت کرر ہے تھے کہا کہ میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ ڈپٹی کلکٹر نے کہا شوق سے آیئے اور اپنے خیالات کا اظہار کیجئے ۔ ہمیں خوشی ہوگی ۔یعنی اس کھدر پوش نیتا کی اشتعال انگریز تقریر کے بعد فوراً ہی مجھے اسٹیج پر بلایا گیا، پورا مجمع حیرت زدہ میری طرف دیکھنے لگا کہ ایک مسلمان وہ بھی تقریر کیلئے اسٹیج پر آ گیا۔ میں نے ہر طرف سے صرف نظر کر لیا۔ میں نے دیہاتی علاقے میں کام کرنے والے اس نیتا کی تقریر سن کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ تاریخ سے بالکل واقف نہیں ہے ۔ عام طور پر ہندوؤں میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف جو باتیں مشہور ہیں وہی دہرا رہا ہے۔اس لئے میں نے جوابی تقریر میں اس کے اسی کمزور پہلو کو نشانہ بنایا۔

میری تقریر.......................

میں نے اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے کہا: دوستو! اور بھائیو! ہمارے معزز دوست نے جو تقریر کی ہے مجھے نہایت افسوس ہے کہ انہوں نے غلط تاریخ اور مسلمان بادشاہوں کی غلط تصویر پیش کی ہے ۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و دشمنی پھیلانے اور دونوں بڑی توپوں کو آپس میں لڑانے کی نیت سے ہندوستان کی تاریخ کو مسخ کر دیا ہے۔مسلمان بادشاہوں کے غلط اور جھوٹے مظالم کی بھیانک تصویر پیش کر کے یہاں کے ہندوؤں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تمہارے پہلے حکمراں سب ظالم تھے۔ہم تمہارے لئے رحمت بن کر آئے ہیں ۔ ہم تمہارے نجات دہندہ ہیں تا کہ ہندو قوم انگریزی حکومت کی وفادار

ہو جائے۔ ہمارے ساتھی نے شاید وہی تاریخ پڑھی ہے۔ مغلوں کی صحیح اور اصل تاریخ فارسی زبان میں ہے جس میں سے بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے ہندوستان کی اصل تاریخ پڑھی ہے۔ ہندوستان کی ایک ہزار سال کی سچی تاریخ میری نگاہوں میں ہے اور میرے دماغ میں محفوظ ہے۔ ان کتابوں میں کہیں بھی ان مظالم کا ذکر نہیں جن کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ مغل بادشاہوں کا انصاف آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے انصاف کے تقاضوں کو کیسے پورا کیا، میں آپ کے سامنے صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

اکبر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ جہانگیر ہوا، ملکہ نور جہاں اس کی بیوی ہی نہیں اس کی محبوبہ تھی، اس کی پریمیکا تھی جس پر وہ اپنی جان نچھاور کرتا تھا اور اس کیلئے ہر قربانی دینے کیلئے تیار رہتا تھا۔ لیکن جب اسی محبوبہ نے جب ایک غریب ہندو کی ناحق جان لے لی اور اس کو گولی ماردی تو آپ کو معلوم ہے کہ جہانگیر نے اپنی محبوب بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے اپنے سینہ پر پتھر رکھ کر فیصلہ کیا کہ نور جہاں کو فوراً گرفتار کیا جائے اور اس غریب ہندو کے قصاص میں اس کی گردن ماردی جائے۔ کیا دنیا کے بادشاہوں میں اس انصاف کی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ کیا ہندوستان کی سر زمین نے انصاف کا شاندار مظاہرہ کبھی کہیں دیکھا ہے؟

صدر جلسہ نے تائید میں تالیاں بجائیں، پھر پورا مجمع تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج گیا۔، میں نے اپنا سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بس ایک مثال اور ایک مغل شاہزادہ عادل شاہ ہاتھی پر سوار جارہا تھا کہ ایک غریب ہندو کے گھر کے پاس سے گذرا اس کے گھر کی دیواریں نیچی تھیں۔ شہزادہ ہاتھی پر سوار تھا، گھر کے آنگن میں اس کی بیوی ننگی غسل کر رہی تھی۔ شاہزادہ کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اس کی طرف

ایک پھول پھینکا ۔ پھول دیکھ کر عورت چونکی ، دیکھا کہ شاہزادہ ہاتھی پر سوار ہے ، وہ بھاگ کر پردے میں چلی گئی ۔ اس نے اپنے شوہر سے اس واردات کا ذکر کیا۔ شوہر سیدھا بادشاہ کے دربار میں فریادی بن کر حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے تحقیقات کرائی ۔ واقعہ ثابت ہوا۔ پھر بادشاہ نے کیا فیصلہ کیا، آپ کو شاید نہیں معلوم؟ اگر آپ جانتے تو ان خیالات کا اظہار نہیں کرتے جو ابھی تقریر میں کیا گیا ہے ۔ سنئے اور میری تصدیق کیلئے ہندوستان کی صحیح تاریخ پڑھئے ، بادشاہ نے اس غریب ہندو کو اپنا فیصلہ سنایا کہ تم سرکاری ہاتھی پر سوار ہو جاؤ ، عادل شاہ کی بیوی اسی طرح ننگی غسل کرے گی اور تم اس کو دیکھ کر اس پر پھول پھینکو گے ۔ شاید آپ لوگوں کو پتہ نہیں کہ مغل شاہزادیوں کو چاند اور سورج بھی آسانی سے نہیں دیکھ سکتے تھے چہ جائیکہ ننگی حالت میں ایک معمولی آدمی کے سامنے ہو، یہ فیصلہ وہی بادشاہ کر سکتا ہے جس کا عدل وانصاف بے داغ ہو۔ سارا دربار اس فیصلہ کو سن کر سناٹے میں آ گیا۔ کیا آپ تاریخ سے اس کی کوئی دوسری مثال پیش کر سکتے ہیں۔

صدر نے اب کی بار اور زوروں سے تالیاں بجائیں اور ان کے ساتھ پورا مجمع دیر تک تالیاں بجاتا رہا۔ میری تقریر فضا بدلتی جا رہی تھی ۔ میرے دل میں خون کا دوران بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ منہ زور گھوڑا قابو میں آ رہا ہے تو میں نے ایک اور پر جوش بات کہی۔

بھائیو! مغل بادشاہوں کے جو مظالم بیان کئے جاتے ہیں ۔ اولاً تو وہ بالکل غلط اور جھوٹے ہیں ۔ اس جھوٹ کو انگریزوں نے اپنی کتابوں میں لکھ کر پھیلایا ہے ۔ لیکن تھوڑی دیر کیلئے مان لیجئے کہ مغل حکمراں ظالم تھے ۔ انہوں نے انصاف سے حکومت نہیں کی ، عوام پر انہوں نے ظلم کیا وہ لوگوں کو ستاتے رہے، اگر وہ آج ہوتے

اور اسی طرح کا ظلم کرتے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تو آپ یقین کر لیں کہ ان ظالم بادشاہوں سے جنگ کرنے میں ہم مسلمان ہی محاذ جنگ پر پہلی صف میں ہوتے، آپ کو ان سے لڑنے کی بھی زحمت نہیں ہوتی۔ ان ظالموں کے ظلم کو تہس نہس کرنے، ان کے نظام حکومت کو چکنا چور کرنے، اور ان کو انصاف پر مجبور کرنے کیلئے سب سے پہلے ہم اپنا سر کٹا دیتے تب آپ کو مقابلہ کرنے کی نوبت آتی۔

اس بات پر تو اتنی زور کی اور اتنی دیر تک تالیاں بجتی رہیں کہ جیسے تالیوں کی گڑگڑاہٹ کم ہی نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی بات کو مدلل کرنے کیلئے مثال دی کہ آپ بتائیں کہ مصر میں شاہ فاروق کی عیاشیوں اور بدمعاشیوں کے خلاف کون صف آرا تھے؟ جنرل نجیب اور اس کے ساتھیوں کے سوا کون مقابلہ کر رہا تھا۔ وہاں مصر میں تو کوئی غیر مسلم ہے ہی نہیں، مسلمان حکمرانوں کے ظلم کے خلاف مسلمان ہی صف آرا ہے۔ رضا شاہ پہلوی کے خلاف ایران میں کون جنگ کر رہا ہے۔ مصدق کے سوا کس کا نام لیا جا سکتا ہے؟ ایران میں تو صرف مسلمانوں ہی کی آبادی ہے۔ ایک ظالم مسلمان کا مسلمان مقابلہ کر رہا ہے۔ ترکی کا حال بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ ان تمام ملکوں میں مسلمانوں کی حکومت ہے لیکن حکمران غلطی کرتا ہے، عدل وانصاف کی راہ سے ہٹتا ہے، تو کوئی بھی مسلمان اس ظلم کو برداشت نہیں کر سکتا چاہے وہ ظلم اپنے ہم مذہبوں پر ہو یا غیر مذہب والوں پر ہو، ہمارا مذہب ہم کو یہی تعلیم دیتا ہے، یہ ہماری فطرت ہے کہ ہم ہر جگہ، ہر وقت، ہر طرح کے حالات میں، ظلم، ناانصافی، ناروا امتیازی سلوک کے خلاف نبرد آزما رہیں اور ظلم کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں، اس لئے میں اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ انگریزوں کے بوئے ہوئے ان زہریلے پودوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، ہندوستان میں بھائی چارگی، ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کی فضا

بنائیں۔آزاد ہندوستان میں پہلا کام یہی کرنے کا ہے۔جب ہم اور آپ دونوں مل کر پریم اور محبت کے پھول کھلائیں گے تبھی اس چمن میں کارواں در کارواں بہار آئے گی۔بس یہی چند باتیں مجھے آپ سے عرض کرنی تھیں۔آداب عرض!

میں نے انہیں باتوں پر اپنی تقریر ختم کر دی اس کے بعد تالیوں کی پرشور گڑگڑاہٹ میں جلسہ ختم ہوگیا۔مجمع کی فضا بدل گئی۔ ہر ہندو نوجوان خاص طور پر انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے اسٹوڈنٹ ہم لوگوں سے ملنے کیلئے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔اپنی اپنی بولیوں میں ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے۔پھر جلسہ میں شریک نیتاؤں سے تعارف ہوا۔ڈپٹی کلکٹر نے تو دل کھول کر مجھے مبارکباد دی۔اور کہا کہ کبھی کبھی آپ ملتے رہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

میری یہی تقریر اس دیار کے تمام سیاسی ورکروں، کانگریس لیڈروں سے تعارف کا ذریعہ بنی، پھر وہ سب کے سب ہمیشہ کیلئے میرے گہرے دوست بن گئے اور آج بھی وہ اپنے لڑکوں یا پوتوں کے ساتھ میرے گھر عید کی مبارکباد دینے آتے رہتے ہیں۔ مجھے سرگرم سیاست میں یہی دوستی کھینچ لے گئی۔اب تک میں صرف مسلمانوں میں کام کرتا تھا۔ ہندو علاقوں میں جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔منڈل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں آنے کے بعد تو اس دیار کا چھوٹا بڑا کوئی گاؤں نہیں جہاں میں نہ گیا ہوں اور تقریر نہ کی ہو۔ پھر ضلع کانگریس سے رابطہ پیدا ہوگیا اور اس کے جنرل سکریٹری بابو بشر ایم رائے ایک ایل اے ضلع کے سب سے سینئر لیڈر رہے۔ مسلمان سیاسی کارکنوں میں میں ان کا سب سے معتمد ساتھی بن گیا۔

کانگریس سے استعفاء......................

ہم لوگ ۱۹۴۸ء تک یعنی آزادی کے بعد ایک سال تک کانگریس میں رہے،

آزادی کے دوسرے سال ناسک میں کانگریس کے بائیں بازو کا اجلاس ہوا اس میں سب سے نمایاں کام جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا، اشوک مہتہ کا تھا، یہ سب سوشلسٹ ذہن ومزاج کے لیڈر تھے، وہ کانگریس کی اقتصادی پالیسی سے متفق نہیں تھے۔ وہ بڑی ملوں اور فیکٹریوں کے پرائیویٹ سیکٹر میں قائم کرنے کے خلاف تھے، وہ کچھ اس طرح کا اقتصادی نظام چاہتے تھے جیسے جاپان میں کاروباری اکائیاں تھیں یا جس طرح سوئز رلینڈ میں گھڑیوں کے کارخانے تھے۔ ان مقامات میں ایک شخص یا چند اشخاص کی مشترکہ ذاتی فیکٹریاں نہیں تھیں بلکہ کوالٹی اور معیار سرکار مقرر کرتی تھی۔ اور پروڈکشن عوامی سطح پر ہوتا تھا۔ مثلاً کپڑوں کی بڑی ملیں قائم کرنے کے بجائے وہ کہتے تھے کہ عوام کو پاورلوم مہیا کرایا جائے وہ مال اپنے گھروں پر تیار کریں کوالٹی اور معیار مقرر کر دیا جائے تاکہ مال معیاری تیار ہو، حکومت ان سارے مالوں کو خرید کر ملک میں تقسیم کرے یا بیرون ملک سپلائی کرے اس طرح ملک کی دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہے گی۔ بلکہ پورے ملک کے عوام میں گردش کرتی رہے گی۔ اور نچلی سطح سے خوشحالی کی نشو ونما اور ہر ہر فرد خوشحال ہو جائے گا۔ یہی درحقیقت معاشی انقلاب ہوگا جیسا کہ فرانس میں ہوا۔ اسی طرح کی چند اور باتیں تھیں جو یہ لیڈران کہتے تھے اور حکومت پر زور دیتے تھے کہ وہ یہ پالیسی اپنائے، کانگریس اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام رائج کرنے پر سارا زور صرف کر رہی تھی۔

ناسک میں یہ اجلاس ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ اگر حکومت ہماری پالیسی کو نہیں قبول کرتی تو کانگریس سے تعلق ختم کر کے سوشلسٹ سماج کیلئے جدوجہد کے واسطے سوشلسٹ پارٹی قائم کی جائے۔ اس فیصلہ کے بعد بائیں بازو کے تمام لیڈران نے کانگریس سے استعفا دیدیا، اس فیصلہ کے بعد صوبائی اور ضلع کانگریس کے لیڈروں

نے اور پھر منڈل کانگریس کے لیڈروں نے استعفے دیدیئے۔ اس طرح ہم سب ساتھیوں نے ایک ساتھ کانگریس سے استعفا دیدیا، اور سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ پھر صوبائی الیکشن لڑے گئے۔ ضلع میں چند سیٹیں ہماری پارٹی کو ملتی رہیں لیکن ہمارے منڈل سے سوشلسٹ پارٹی کا امیدوار کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد پارٹی میں اختلاف ہوا اس کے بطن سے پرجا سوشلسٹ پارٹی کا جنم ہوا، ہمارے ضلع اور منڈل کی کمیٹیاں اس پارٹی میں شامل ہوگئیں۔

جائداد کی واگذاری.........................

ملک میں ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ جتنے لوگ پاکستان گئے اور ان کے عزیز واقارب اور خاندان کے جملہ افراد ہندوستان میں رہ گئے اور خاندان کا صرف ایک فرد پاکستان گیا تو پورے خاندان کی جائداد محکمہ کسٹوڈین اپنے قبضہ میں کرلیتا تھا۔ یہ ایسا عفریت تھا جو صرف مسلمانوں کے خون پر پل رہا تھا۔ یہ محکمہ اس خاندان کا گھر بار کھیت اور ساری غیر منقولہ جائداد مجمع عام میں کوڑیوں کے بھاؤ نیلام کر دیتا تھا۔ اگر اتفاق سے اس علاقہ میں پناہ گزینوں اور رفیوجیوں کی آبادکاری کرنی ہے تو وہ مکانات رفیوجیوں کو الاٹ کر دیئے جاتے تھے۔ اس طرح ایک فرد کے پاکستان جانے سے پورا خاندان معاشی اعتبار سے تباہ ہوجاتا تھا۔ یہ بڑا روح فرسا معاملہ تھا اگر چہ پاکستان جانے والے سب پر جوش لیگی تھے۔ جنھوں نے ہم جیسے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ جینا دشوار کر رکھا تھا، لیکن بہر حال ہم تو ان کو مسلمان مان کر ان کے غم میں گھلتے تھے، کئی خاندان کی جائدادوں کو نیلامی کے بعد بھی لکھنؤ اور بنارس دوڑ دھوپ کر کے ہم نے واگذار کرایا اور ان کی جائداد اس خاندان کو واپس کرائی۔

حفاظت خود اختیاری.......................

گاؤں میں ہندو مسلم آویزش کی روک تھام پر اس دور میں میری خصوصی نگاہ تھی۔ یہاں چند ہندو نوجوان جو فسادی ذہنیت کے مالک تھے اور کچھ پڑھے لکھے تھے اور کچھ خوشحال بھی، وہ گاؤں کی فضا میں زہر بونے کی خفیہ کوشش کرتے رہتے۔ وہ بچھوؤں کی طرح رینگتے پھرتے تھے، ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا کہ کسی دن وہ ڈنک ماریں گے، ان کو پورا گاؤں پہچانتا تھا، ان کے ذہن و مزاج سے واقف تھا، ان میں سے بعض تو مسلمانوں کے یہاں ملازم بھی تھے، مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ یہ نوجوان خالص آر ایس ایس کی ذہنیت کے تھے۔ کبھی بھی گاؤں کی فضا میں کسی مسئلہ کو لیکر تناؤ پیدا کر دیتے تھے۔ میں نے اپنے ہندو ساتھیوں اور ورکروں کے ذریعہ ان میں سے کئی ایک کو اپنی پارٹی میں شامل کر لیا اور ان کو اپنی میٹنگوں میں بلانے لگا۔ ان میں سے بعض نے تو مئو سے آر ایس ایس والوں کو بلا کر آبادی کے باہر ایک تالاب کے پاس چاقو زنی، خنجر پھینک کر مارنا، لاٹھی چلانا، تلوار اور بھالا چلانا، بنوٹ کھیلنا، پریڈ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور بہت سے ہندو نوجوانوں کو بلا کر اس میں شریک کرنے لگے تھے۔ یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ بعد میں آر ایس ایس کے آلۂ کار بن کر گاؤں کو فساد کی آگ میں جھونک سکتے ہیں۔ اس لئے خاص طور پر ان کو اپنے جلسوں میں بلانا، مائک پر ان کے بارے میں چند تعریفی جملے کہتا۔ تجویزوں کی تائید کرنے کیلئے مائک پر کھڑا کرتا۔ میرے اس مسلسل اس طرز عمل سے ان کا ڈنک آہستہ آہستہ جھڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں ان کا سرپرست بن گیا وہ اپنے ذاتی مسائل بھی میرے پاس لانے لگے۔ اور میں ان کی اپنی پارٹی کو لیکر بھرپور مدد کرتا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب کہیں ہندو مسلمان اختلاف یا تناؤ کی شکل پیدا ہوتی تو ان کو لیکر پہونچ جاتا۔ افہام و تفہیم سے

مسئلہ حل کرتا وہ نوجوان میری مدد کرتے اور فسادیوں کے جوش وخروش کو ٹھنڈا کرنے میں کامیابی مل جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد بار حالات بگڑتے مگر ادری میں کبھی بھی ہندو مسلم محاذ آرائی نہیں ہوئی۔

ایک دلچسپ واقعہ........................

۱۹۵۲ء کے کے آغاز میں گاؤں کے مرکزی مقام پھاٹک میں ہمارا جلسہ ہورہا تھا میں نے اپنے بیان کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر ایک نظم لکھی تھی جو یہاں کے سرمایہ داران کی ذلیل سیاست پر طنز تھی، نظم تو مجھے یاد نہیں جو اس زمانے میں زبان زد عوام تھا اب بھی یاد ہے۔

ہر عیب ہنر بن جاتا ہے جب ہاتھ میں پیسہ ہوتا ہے
دولت کی سیاست دھوکہ ہے دولت سے بھلا کیا ہوتا ہے

ایک نوجوان مائک پر یہ نظم پڑھ رہا تھا اور ہر شعر پر اس کو روک کر ہر شعر کی وضاحت کرتا اس کا پس منظر بیان کرتا، اس وقت گاؤں کے سرمایہ داروں کی دوہری پالیسی، ان کی بداخلاقیوں اور ان کی کج فکری سے عوام کو بڑی اذیت تھی، یہ سب میرے سیاسی مخالفین میں تھے۔ میں انہیں مسائل کا ذکر کر رہا تھا، رات کا وقت تھا، گاؤں کا ایک سرمایہ دار نشہ میں دھت اپنے تین چار ہم مشربوں کو لیکر جلسہ گاہ کے کنارے سے گذرتے ہوئے ذرا بلند آواز سے کہا ''مولوی صاحب ذرا سنبھل کر تقریر کیجئے گا'' اسٹیج پر میرے پر جوش اور گرم مزاج ساتھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے جوں ہی سنا کہ فلاں شخص بول رہا ہے اور دھمکی دے رہا ہے۔ وہ اسٹیج سے دھما دھم کود پڑے اور وہیں سے للکارا پکڑو پکڑو جانے نہ پائے۔ پورا مجمع اٹھ کھڑا ہوا سب کا رخ اسی طرف تھا۔ مرا ایک جاں نثار اور فداکار ورکر پٹھان نوجوان بھاری تن وتوش کا تھا وہ جلسہ گاہ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا جہاں

دس بارہ ہاتھ اونچا بانس گاڑ کر اس میں ہارن باندھا گیا تھا، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک جھٹکے سے وہی بانس اکھاڑ لیا جس میں ہارن بندھا ہوا تھا وہی بانس مع ہارن لیکر دھم دھم دھم دھم دوڑا اور تمام ساتھی آواز کی جانب جھپٹے، نشہ باز سرغنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھاگا ان میں سے ایک راستہ میں ایک پلنگ سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا، گھٹنا پھوٹ گیا مگر پھر جلدی سے اٹھ کر دوڑتا ہوا بھاگا۔ اس میں ایک لنگڑا تھا تو ایک خان صاحب کے گھر میں گھس کر کواڑ اندر سے بند کر لیا اور سرغنہ بھاگ کر ایک سیٹھ کے گھر میں گھس گیا، سب کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

وہ منظر بھی عجیب تھا، مہا بھارت کی دیو مالائی کہانیوں میں جو گرز استعمال کیا گیا تھا ہمارے یہاں پٹھان ورکر کا ہارن بندھا ہوا لمبا بانس لیکر دوڑنا ایسا ہی منظر پیش کرتا تھا۔ بعد میں میں نے اس سے کہا کہ تم اس بانس سے کیا کرتے؟ اس نے کہا کہ یہ تو ڈرانے کیلئے تھا ان سب کیلئے تو میرا ایک ایک تھپڑ کافی تھا۔ زندگی بھر یاد کرتے۔

مجمع کچھ قابو میں کیا گیا اور لاؤڈ اسپیکر کا تار پھر سے جوڑا گیا ان کاموں میں کافی دیر ہوئی، مگر مجمع اپنی جگہ جما رہا۔ جلسہ کی کارروائی پھر شروع ہوئی، میں نے اس جلسہ میں بتایا کہ ہمارے گاؤں کی ایک تہائی آبادی زمینداروں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کسی نے اب تک میری کوئی بات نہیں مانی، انہوں نے ہمیشہ سیاست میں میری مخالفت کی ہے اس کا نتیجہ آج ان کے سامنے ہے۔ کسٹوڈین ان کی جائیدادیں نیلام کر رہا ہے لیکن میری ہمدردی آج بھی آپ کے ساتھ ہے۔ اسی ہمدردی کے ناطے آج پھر ایک بات کہہ رہا ہوں کہ عنقریب ہمارا صوبہ اتر پردیش میں زمینداری توڑ دی جائے گی۔ جتنی زمینیں آپ نے آسامیوں کو دے رکھی ہیں وہ آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ یہ اسی وقت بچ سکتی ہیں جب زمینیں ان کے ہاتھوں سے فوراً نکال لیجئے یا

احاطہ بندی کیجئے یا اس میں درخت نصب کر کے باغ اندراج کرا لیجئے۔ یا پٹواری سے مل کر خود کاشت لکھوا لیجئے۔ اپنی زمینوں کو بچانے کیلئے کچھ کیجئے۔ یہ بل اسمبلی میں پیش ہو چکا ہے۔ اس پر بحث چل رہی ہے۔ جس دن یہ بحث تمام ہو جائے گی تو خاتمہ زمینداری ایکٹ نافذ ہو جائے گا۔ اور ایک دن جب صبح کو سو کر اٹھیں گے تو معلوم ہوا کہ آپ کی ساری زمینیں دوسروں کے قبضے میں چلی گئیں اور آپ فاقہ مست ہو جائیں گے۔ زمینداری کا سارا جاہ و طمطراق دھرا کا دھرا رہ جائے گا، جلسہ انہیں باتوں پر ختم ہو گیا۔

لیگ والوں نے اب تک میری باتوں کو نہیں مانا میری اس خیر خواہی کو بھی انہوں نے ہواؤں میں اڑا دیا۔ اور چند ہی مہینوں بعد خاتمہ زمینداری ایکٹ نافذ ہو گیا۔ میرے تمام ہندو ساتھی جو میرے ساتھ پارٹی میں تھے وہ سب زمیندار تھے ان کی ایک انچ بھی زمین ان کے قبضہ سے نہیں نکلی اور ہمارے یہاں کے مسلمان زمیندار ایک تو پہلے ہی سے چھوٹے زمیندار تھے، اب اور بھی کچھ چھوٹے ہو گئے۔ اور چھوٹی چھوٹی کاشتکاریوں کے مالک ہو کر رہ گئے۔ پھر ہر لڑکے اور لڑکی کی شادی میں کھیت بکتے رہے اور آج نان شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ تعلیم سے پہلے ہی بے بہرہ تھے۔ اس لئے یہاں وہاں چپراسی یا چوکیدار ہو گئے۔ کہیں مدرسوں کے مطبخ میں باورچی ہوئے، کسی مدرسے میں چنگی وصول کرنے لگے، کچھ ٹمپو اور رکشا چلانے لگے، تنگ نظری اور جاہلانہ عصبیت نے ان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

عظیم الشان کانفرنس.........................

۱۹۵۲ء تک تقسیم ملک کے اثرات بے چینی اور خلفشار مسلمانوں کا احساس مظلومیت پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔ بابری مسجد پر قبضہ دو سال پہلے ہو چکا تھا۔

بازیافت کا مسئلہ الجھتا رہا۔ افسران کی مہا سبھائی ذہنیت نے بیراگیوں کو............ میں دیوار توڑ کر مسجد میں گھس جانے کو فوجداری کیس کے بجائے دیوانی کا مقدمہ بنا دیا اور بیراگیوں کے قبضہ کو بحال رکھا اور نقض امن کے نام پر مسلمانوں کو مسجد میں داخلہ سے روک دیا، اسی دور میں اردو پر بھی تعصب کی کند چھری پھیری جانے لگی تھی اور دھیرے دھیرے اس کی ایک ایک رگ کٹتی جارہی تھی۔ سرکاری اسکولوں میں ہندوازم کی تعلیم کیلئے زمین ہموار کی جانے لگی تھی۔ محکمہ کسٹوڈین نے لاکھوں مسلمان خاندانوں کو تباہ برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ انہیں حالات و مسائل کے پیش نظر میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مشرقی اتر پردیش کے ۲۳ ضلعوں کی جمعیۃ علماء کانفرنس ادری میں بلانے کا فیصلہ کیا، میرا مکان خالی تھا اس کو کانفرنس کی تیاریوں کا دفتر بنا دیا اور پورے تین مہینے میں نے اس کی تیاری میں لگا دیئے۔ ہندوستان گیر پیانے پر اس کی پبلیسٹی کی، اخبارات میں خود مضامین لکھے اور دوسروں سے لکھوائے، ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے پیغامات منگائے گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے تمام بڑے اور مشہور علماء ومشائخ کو کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند ایم پی چیف گیسٹ کی حیثیت سے مدعو تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند کی صدارت کا اعلان کیا گیا۔ ۲۳ ضلعوں کے نمایاں تمام جمعیتی کارکنوں کو نمائندہ کی حیثیت سے دعوت دی گئی۔ مالیات کی فراہمی میں اجلاس کی تاریخ آ گئی۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا ابوالوفاء شاہجہاں پوری، مولانا محمد قاسم شاہجہاں پوری اور چند دوسرے اکابر غلط فہمی کیوجہ سے کانفرنس سے ایک دن قبل ہی ادری تشریف لے آئے، کانفرنس تین دنوں کیلئے تھی۔ تیسرے دن کا اجلاس اردو کانفرنس

کے نام سے تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند کے نمائندہ خصوصی خیر بہوروی ایک ہفتہ قبل ادری آچکے تھے۔ انہوں نے کانفرنس کے دوران ایک علمی نمائش کا پروگرام بنایا تھا۔ ایک ہفتہ تک اس کی تیاریاں کرتے رہے۔ لکھنؤ سے حیات اللہ انصاری نے "دس دن میں اردو" کے کام سے ایک پروگرام چلایا تھا انہوں نے لکھنؤ سے اپنا ایک نمائندہ ادری میں دس دن پہلے بھیج دیا جوان پڑھ نوجوانوں کو دس دن میں اردو سکھا رہا تھا، اس طرح دس دن پہلے ہی سے گاؤں کی فضا میں صرف کانفرنس ہی کا تذکرہ اور اس کی چہل پہل چلتی رہی۔ ۱۴/۱۵/۱۶/ رجون ۱۹۵۴ء کو یہ کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس میں ساٹھ ہزار سے زیادہ خالص سفید پوش مسلمانوں کا مجمع تھا۔ اس وقت ادری ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، چھوٹی سی آبادی تھی، ادری کی سرزمین آدمیوں کا جنگل بن گئی۔ اس وقت گاؤں میں بجلی نہیں آئی تھی بلکہ مئو جیسے شہر میں بھی بجلی نہیں تھی۔ بلکہ ہمارے پورے ضلع میں کہیں بھی بجلی نہیں تھی۔ ہم نے کانفرنس کیلئے باہر سے ایک بہت بڑا جنریٹر کرایہ پر منگایا اور بانس گاڑ کر اور تار دوڑا کر ہر طرف روشنی کا بندوبست کیا گیا۔ درجنوں ہوٹل، چائے خانے عارضی طور پر تعمیر کئے گئے، ایک بہت بڑا پنڈال مہینوں کی محنت کے بعد تعمیر کیا گیا جس پر بیک وقت ایک سو آدمی بیٹھ سکتے تھے جو قد آدم اونچا تھا۔ جلسہ گاہ کی باونڈری کو قد آدم آم کی کڑیاں گاڑ کر رسیوں سے گھیر دیا دیا گیا صرف بیچ میں چھ فٹ کا راستہ اسٹیج تک جانے کا رکھا گیا جس پر دو قد آور نوجوان رضا کاروں کو متعین کر دیا گیا جو معززین کو اسٹیج تک پہونچاتی۔

باؤنڈری سے باہر ایک وسیع قطعہ اراضی کو گھیر کر اس کے گیٹ پر اردو بازار کا بینر لگا دیا گیا جس میں تمام دوکانیں علمی نمائش، ایک اسٹال، دارالمطالعہ شامیانوں میں قائم کئے گئے۔ یہ صحن ایک میلے کی شکل اختیار کر گیا، مسلمانوں کا اتنا بڑا ازدحام تھا

کہ ہر طرف آدمی ہی آدمی سفید لباسوں میں فرشتوں کی طرح پر جمائے ہوئے نظر آتے تھے۔مجاہد ملت جو پورے ہندوستان کا ہمیشہ دورہ کرتے رہتے تھے۔اور بڑے بڑے اجتماعات کو خطاب کرتے رہتے تھے انہوں نے اس مجمع کو دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ آزادی کے بعد سے اب تک مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع کو خطاب کرنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا ہے۔ پورا گاؤں میزبان بنا ہوا تھا،کھانا پکانے اور کھلانے کا نظم بہت بڑے پیمانے پر تھا۔ایک مستقل اور بڑی ٹیم شب و روز رضا کارانہ یہ کام انجام دے رہی تھی گاؤ کے بیس پچیس صاف ستھرے گھروں کو خالی کرلیا گیا تھا جہاں باہر کے معزز مہمانوں کو ٹھہرایا گیا تھا، ہر جگہ مستقل میز بانی کا مکمل نظم تھا لیکن اس گاؤں میں کچھ مار آستین بھی تھے جو دیوبندی جماعت کے تھے،بعض ان میں عالم فاضل تھے انھوں نے بڑی سازشیں کیں اکابر جمعیۃ کو خطوط لکھ کر دھوکا دینا چاہا کہ یہاں کوئی کانفرنس نہیں ہو رہی ہے،اکابر وہ خطوط لیکر آتے تھے لیکن نام مکتوب نگار نے فرضی لکھا تھا لیکن پہچاننے والے پہچان گئے یہ کون لوگ ہیں، سجکٹ کمیٹی میں خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کی مگر ہمارے رضا خانی ساتھیوں کی اخلاقی جرأت کی تعریف کی جائے گی کہ وہ صرف سیاست کے ساتھی تھے مگر وہ اس کانفرنس میں سایہ کی طرح میری ساتھ رہتے تھے ہر جگہ کڑی سے کڑی ڈیوٹی سنبھالے ہوئے تھے اور ہر مورچہ پر اس طرح ڈٹ گئے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلا سارے سانپوں کا فن کچل کر انھوں نے رکھ دیا،

رفیقوں سے رقیب اچھے جو جل کر نام لیتے ہیں
گلوں سے خار بہتر ہیں کہ دامن تھام لیتے ہیں

کانفرنس کے عظیم الشان سیلاب میں مخالفت اور زمین کے سارے کیڑے مکوڑے بہ گئے اور پوری کانفرنس تین دنوں تک پر سکون ماحول میں چلتی رہی، یہ

کانفرنس حالات اور ماحول کی وجہ سے ایک تاریخی کانفرنس بن گئی بہت دنوں تک اخبارات میں اس کا ذکر چلتا رہا علی گڑھ سے انجمن ترقی اردو ہند کا ایک اخبار ''ہماری زبان'' نے کانفرنس نمبر نکالا خیر بہوروی نے اس میں بہت مفصل آنکھوں دیکھا حال لکھا، اردو کانفرنس میں جو خطبہ استقبالیہ پڑھا گیا تھا جو ۱۶ رصفحات پر مشتمل تھا وہ پورا اخبار میں شائع کیا جو خیر مقدم کے عنوان سے طبع کرا کے تقسیم کیا گیا تھا، مسلسل تین مہینے مجھے اس کانفرنس کے سلسلہ میں شب وروز مصروف رہنا پڑا تھا۔

سفر بمبئی.......................

کانفرنس کے پرشور ہنگاموں کے بعد میری زندگی میں تنہائی کا زہر بھر گیا، میری بیوی دیوانی ہوچکی تھی، یہ جنون تقریباً ایک سال سے چل رہا تھا وہ گھر میں رہ نہیں سکتی تھی۔ اسلئے وہ مستقل اپنے میکہ میں رہتی تھی۔ بیوی شریک زندگی کہی جاتی ہے۔ جسم دو ہوتے ہیں مگر دونوں جسموں میں زندگی تقسیم ہوکر رہتی ہے۔ بیوی کے بغیر آدمی ادھورا ہوکر رہ جاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی متوازن نہیں رہ سکتی ہیں۔ بہت دنوں سے ادھوری زندگی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ اب تنہائی کی ناگن اس طرح ڈسنے لگی تھی کہ میرا دماغ، میرا دل دونوں ماؤف ہوتے جارہے تھے۔ میں اس عذاب سے فرار پر مجبور ہوگیا اور بمبئی جانے کا فیصلہ کرلیا اور پھر وہی صحافتی زندگی گذارنے کا سر میں سودا سمایا۔ رفیق محترم مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سے بمبئی میں اخبار انقلاب سے وابستہ تھے اور ایک رسالہ ''البلاغ'' نکالتے تھے۔ میں نے ان کو خط لکھا اور ان کو بمبئی آنے کی اطلاع دیدی تھی۔ بس ایک صبح سو کر اٹھا اور گھر میں تالا لگایا اور کنجی رفیق مکرم مولانا محمد قاسمی کے حوالے کیا اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ ایک حسرت آمیز گھر پر نظر ڈالی اور چل دیا،

گھر میں رہا ہی کون جو رخصت کرے ہمیں
چوکھٹ کو الوداع کہا اور چل دیئے

میں بمبئی پہونچ گیا، وی ٹی اسٹیشن سے وکٹوریہ لی اور سیدھا محمد علی روڈ وزیر بلڈنگ میں دفتر جمعیۃ علماء گیا، سامان دفتر میں رکھا اور قاضی صاحب کی قیامگاہ کی تلاش میں نکل پڑا۔ وہ رین روڈ پر رہتے تھے ان سے ملاقات ہوئی، وہ میرے ساتھ دفتر جمعیۃ علماء آئے تا کہ سامان لیکر ان کی رہائش پر چلے جائیں یہاں آکر جب سوٹ کیس کھولا تو جو کچھ اس میں زادِ سفر نقد تھا وہ اتنی ہی دیر میں دفتر کے چوروں نے صاف کر دیا تھا، میں سناٹے میں آ گیا۔ قاضی صاحب سے صورت حال بتائی تو انہوں نے کہا کہ یہ چوروں کا اڈہ بن چکا ہے۔ چپ چاپ یہاں سے چلے چلو اس کے ذکر سے کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوگا۔ اس لئے سوٹ کیس اٹھایا اور رین روڈ پہونچ گئے اور بسم اللہ ہوٹل کے عقب والی گلی میں ایک بلڈنگ دو منزلہ تھی اس کے ایک کمرہ میں قاضی صاحب رہتے تھے۔ رخت سفر وہیں کھول دیا یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں قاضی صاحب کے ساتھ ایک نوجوان رہتا تھا جو انقلاب اخبار میں رتن دیپ کے نام سے تصویری کہانیاں لکھتا تھا وہ اچھا مصور تھا اور فلموں کا دیوانہ، یہی شوق اس کو پاکستان سے لایا تھا۔ فلموں میں کام کی بہت کوشش کی، مگر اس کو کام نہیں مل سکا اس لئے گذر بسر کیلئے اس نے اخبار انقلاب میں ملازمت کر لی تھی غالباً اس کا اصل نام محمود تھا وہ ہندی فلموں کے بجائے انگریزی فلموں کا دلدادہ تھا۔ ایک بار مجھے ایک انگریزی فلم دکھانے لے گیا تھا۔

میں قاضی صاحب کے ساتھ ان کے کمرے میں رہنے لگا، ابھی کوئی کام نہیں ملا تھا اور صرف بمبئی گھومتا تھا، ایک دن ہم لوگ گیٹ آف انڈیا گئے اور ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کیا داہنے جانب تاج ہوٹل کی بلند و بالا عمارت تھی اور

سامنے حد نگاہ تک سمندر لہریں لے رہا تھا۔ نئے فیشن میں ملبوس لڑکیاں ہر طرف ہاتھوں میں یا کندھے سے بیگ لٹکائے گھوم رہی تھیں۔ وہ اپنے حسن کی قیمت وصول کرنے اس ساحل پر آیا کرتی تھیں۔ بتانیوالوں نے ہمیں بتایا۔صرف کاروالے اس کی قیمت چکانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ایک شام چوپاٹی کی ریت پر لوٹ پوٹ کی شام ڈھلتے ڈھلتے پانی ساحل سے میلوں دور چلا جاتا اور ریت کے ذرے چمکنے لگتے اور ہر شخص بلا تکلف ان ریتوں پر بیٹھ جاتا، آئس کریم کھاتا، جوڑے ہنسی دل لگی کرتے، ہر طرف ایک میلے کا سماں تھا، ایک بار ایک دوست علی بابا کے مزار پر پکنک منانے لے گیا، یہ مزار سمندر میں ہے۔ صدر روڈ سے ایک پتلی سڑک نکال کر مزار تک پہونچ گئی تھی۔۱۲ر بجے دن میں سمندر کا ایک عجیب منظر دیکھا، سمندر میں بہت دوری پر دیکھ رہا ہوں کہ سفید چاندی کی چمچماتی ہوئی بہت اونچی کوئی دیوار کھڑی ہے۔ وہ بتدریج ساحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ سمندری موج تھی جب وہ ساحل سے آکر ٹکراتی تو ایک پرشور آواز کے ساتھ صدر روڈ پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے واپس چلی جاتی تھی اور ایسا مسلسل ہوتا رہا، بڑا دلچسپ منظر تھا۔

انہیں تفریحات میں ابھی دن بیت رہے تھے کہ بمبئی کی مرطوب آب و ہوا نے جان لیوا پیچش میں مبتلا کر دیا دو مہینے مسلسل علاج میں گذر گئے۔ بہت ہی نحیف اور لاغر ہو گیا تھا۔ جب یقین ہو گیا کہ بمبئی کی آب و ہوا میں رہ کر صحت نہیں لوٹ سکتی اس لئے میں نے وطن لوٹنے کا فیصلہ کر لیا اور تین ماہ کے بعد پھر میں اپنے ویرانے میں آ گیا۔

تیسری شادی........................

میں گھر لوٹ آیا، تو گھر پر ویرانی برس رہی تھی ''خانۂ خالی را دیو میگرد'' یہاں میری آمد پر نہ کوئی خوش ہونیوالا تھا اور نہ مسکرا کر استقبال کرنے والا، حد یہ ہے کہ

میرے فرار پر کوئی ملامت کرنے والا بھی نہیں تھا۔ گھر کا تالا کھولا تنہا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سناٹوں نے یہاں ڈیرہ جما لیا تھا۔ جیسے گھر کے ہر کونے میں کوئی بھوت چھپا بیٹھا ہے۔ لیکن یہ وحشت یہ ویرانی کیسے ختم ہو؟ اس کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ شادی کر لی جائے۔ لیکن ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی ہمارے دیار میں تقریباً ناممکن ہے۔ اسی لئے میں نے اب تک دوسری شادی کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا، اور نہ کسی سے ذکر کیا تھا۔ مگر میری تنہائی کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں تھا۔ میرے بچپن کے دوست مولانا محمد قاسمی کو میری عبرتناک زندگی اور میرے گھر کی ویرانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اس کے لئے فکر مند تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی چھوٹی بہن کے سلسلہ میں سلسلہ جنبانی کی۔ پہلے اپنی بیوی کو شیشے میں اتارا، اس نے اپنے میکے جا کر اپنی ماں کو راضی کیا۔ اور مسئلہ حل کر لیا۔ اس کے والد مولوی محمد ظہور صاحب دنیا سے جا چکے تھے۔ صرف ماں تھی، اور انہیں کو راضی کرنا تھا۔ اس کی والدہ کے میرے بارے میں خیالات اچھے تھے۔ اور ان کو ساری معلومات حاصل تھیں۔ وہ میری پاگل بیوی کی موجودگی میں شادی کر دینے کیلئے تیار ہو گئیں۔ مولوی محمد صاحب قاسمی نے سارے معاملات طے کر لئے۔ تاریخ مقرر ہو گئی میں دوست واحباب کو چائے پر مدعو کر لیا اور جامع مسجد میں لڑکی کے چچا مولانا محمد امین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم مئو نے نکاح پڑھا، دوسرے دن بیس احباب کو کھانے پر بلا کر ولیمہ کی سنت ادا کر دی۔

موسم بہار آ گیا.........................

ایک لڑکی شریک زندگی بن کر میرے گھر آ گئی وہ تن تنہا نہیں آئی بلکہ اپنے ساتھ خوشیوں اور مسرتوں کا انبار لیکر آئی۔ وہ بادِ صبا تھی اور بہاروں کا پورا ایک قافلہ لے کر آئی۔ تمناؤں اور آرزوؤں کے رنگ برنگ پھولوں کی تیز خوشبو دل و دماغ پر چھا

گئی۔ کہ تین برسوں کی اذیت ناک تنہائی کا سارا درد و کرب میں بھول گیا۔ انہیں دنوں میں نے ایک غزل کہی تھی۔ جواب میرے حافظہ میں نہیں۔ صرف ایک شعر بھولا بھٹکا میرے دماغ کے ایک گوشے میں پڑا ہوا ہے۔ آپ بھی سن لیں۔

اس قدر ہے اثرِ کیفِ بہارِ امروز
مجھ پہ کیا گذری خزاں میں یہ مجھے یاد نہیں

ذہن پر زور ڈالنے کے بعد ایک شعر اور یاد آ گیا۔

داغ تو اب بھی ہیں سینے میں ہزاروں لیکن
تیر کس کے تھے کماں میں، یہ مجھے یاد نہیں

زمانے کی ستم ظریفی کے ذکر کی وجہ سے ایک تیسرا شعر بھی یاد آ گیا جو اس غزل میں تھا۔

طنز و تعریض زمانے کی تو ہے یاد مگر
زہر کتنا تھا زباں میں؟ یہ مجھے یاد نہیں

شب و روز دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھایا رہتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گھر کے ہر در و دیوار سے خوشی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ ہر طرف مسرت کی پریاں رقص کر رہی ہیں اور چمن زندگی ایک نئی بہار کی آمد سے لہلہا اٹھا، مرے کچے گھر کے نیم تاریک کمروں سے جیسے آسمان سے کہکشاں اتر آئی ہے۔ مگر میرے گھر کا کونا کونا رنگ و نور سے بھر گیا۔ یہ ایک ایسی بہار تازہ کی آمد تھی جس کی تیز خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی محسوس ہوتی تھی، حسن و شباب، شرافت و نجابت، دلدہی و دلداری، پھڑکتے ہوئے ہونٹ، مسکراتی ہوئی آنکھیں، لب و لہجہ کی حلاوت سے میری رگ رگ میں ایک نشہ سا گھول دیا تھا۔ میں نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔

افسانہ نگاری.......................

اس کے بعد ایک طویل عرصہ میں نے اپنے وطن ہی میں گذارا، سیاست اور معاشی جدوجہد یہی دو مشغلے تھے۔ دونوں غیر نفع بخش، دونوں میں (نقصان اور خسارہ) جب بھی کسی کاروبار کا آغاز کیا، نقصان اٹھانا پڑا۔ کیونکہ ذہن کاروباری نہیں تھا۔ زندگی اسی نشیب وفراز سے گذرتی رہی۔ لیکن اس دور میں میں نے بہت لکھا۔ سیاسی تاریخی مضامین لکھے، شعروشاعری کی، افسانے لکھے، رسالہ دارالعلوم دیوبند میں چار پانچ سالوں تک مسلسل لکھتا رہا۔ اس دوران بہت سے افسانے بھی لکھے۔ اس زمانہ میں دہلی سے ایک رسالہ''کامیاب'' نکلتا تھا جس میں اچھے لکھنے والے تھے۔ میں''کامیاب''میں لکھنے والوں کی صف میں شامل ہوگیا۔ اس دور میں سماجی اور معاشرتی انسانوں کی طلب زیادہ تھی۔ میں نے بھی سماجی مسائل ہی پر لکھے۔ عشق ومحبت کی کہانیاں میرے بس میں نہیں تھیں۔ افسانوں میں جو شائع ہوئے ان کے بعض عنوانات مجھے اب بھی یاد ہیں سب سے پہلا افسانہ''اتنا'' تھا۔ پھر اس کے بعد ''دولاشیں''،''نشیب وفراز''،''اعتراف شکست''۔ لاہور سے میرے ایک شناسا جن سے لاہور میں تعارف حاصل ہوا تھا، انہوں نے لاہور سے''نوائے پاکستان'' کے نام سے ایک ہفتہ وار نکالا تھا۔ ان کے خطوط آئے تو میں نے ان کے اخبار کیلئے کئی افسانے لکھے۔''ہینڈ بیگ'' اور''اسپتال'' کے دو عنوانات اب بھی یاد ہیں ان کے علاوہ بھی متعدد افسانے لکھے اور شائع ہوئے۔

اس زمانہ میں ایک تقدس مآب لیگی بزرگ نے میرے کھدر کے لباس اور جواہر کٹ صدری پر اعتراض کیا تھا اور اپنی مجلسوں میں تنقید کرتے رہتے تھے۔ مجھے یہ سن کر دلی تکلیف پہونچی، میں نے اس واقعہ پر ایک نظم لکھدی جس کا عنوان تھا۔

''نکتہ چیں سے'' وہ تین بندوں پر مشتمل تھی۔اس کے بعض اشعار ادھر اُدھر سے مرے حافظے میں پڑے ہوئے ہیں۔ترتیب بالکل بھول چکی ہے۔ایک بند کے دو تین شعر

مرے لباس پہ تو نے جو نکتہ چینی کی — خدا گواہ ہے مجھ کو کوئی ملال نہیں
نگاہ نکتہ رسی جس کی ہو فلک پیما — اسے نمود و نمائش کا کچھ خیال نہیں
ہر ایک بات روا ہے جہان میں لیکن — کسی کی ذات پہ تہمت مگر حلال نہیں

دوسرے بند کے بھی اتفاق سے تین ہی شعر یاد رہ گئے

فریب کا ہے تقاضا طلسم فریب ہیں — ترے کلام کی صحت میں کچھ کلام نہیں
نشان سجدہ جبیں پر مگر ضمیر سیاہ — جناب! مسجد جامع کا میں امام نہیں
مرے کلام سے روحوں کی تربیت ہے مگر — یہاں کنارِ سحر میں سوادِ شام نہیں

تیسرے بند کا ایک بھی شعر یاد نہیں رہا۔اس نظم کو ''نوائے پاکستان'' نے پہلے صفحہ پر جلی قلم سے شائع کیا تھا جب اخبار آیا تو احباب نے اس نظم کو خوب شہرت دی اور ہر مجلس میں بھی سناتے تھے۔معترض صاحب کا ناطقہ بند کر دیا۔

بعد میں میں نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ'' نشیب و فراز'' کے نام سے مرتب کیا تھا، پھر یاد نہیں کہ وہ مسودہ کیا ہوا اور کہاں غائب ہو گیا۔

ایک اور کتاب..................

یہی دور تھا جب کمیونسٹوں سے قانونی پابندی اٹھائی گئی اور وہ تمام جیلوں سے رہا ہوئے تھے وہ ایک سیلاب کی طرح ملک میں پھیلے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سیلاب پورے ہندوستان کو بہا لے جائے گا۔لیگ کے تقدس مآب بزرگوں کو تقسیم ملک کے بعد کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی تھی۔وہ سب کے سب کمیونسٹوں کے ہم نوا ہو گئے۔کہاں، اسلام قرآن اور اسلامی حکومت کا نام لیتے لیتے ان کا حلق خشک ہو رہا

تھا کہاں وہ یک بیک اس الحادی تحریک کے پر جوش ہم نوا بن گئے ۔ اسلام حیرت زدہ اور شریعت ان کا منھ دیکھتی رہ گئی ۔ میں نے اسی ماحول میں کمیونزم پر ایک ضخیم کتاب لکھی ۔ اس سلسلہ میں میں نے بہت سی کتابیں منگائیں اور تفصیلی مطالعہ کیا، کمیونزم کو خوب سمجھا، اس کی تاریخ پڑھی تب میں نے اپنی کتاب ''کمیونزم تجربات کی کسوٹی پر'' مرتب کی ۔ اس کے کچھ اجزاء رسالہ ''نقش دیو بند'' میں شائع ہوئے ۔ یہ رسالہ مولانا سید انظر شاہ کشمیری کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ چند شماروں کے بعد بند ہوگیا۔ یہ کتاب تقریباً تین سوصفحات کی تھی ۔ مسودہ ایک ناشر کو رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجا مگر مسودہ ان کو نہیں ملا۔ اور ڈال ضائع ہوگیا۔ نقل رکھنے کی عادت کبھی نہیں رہی ۔ اس کی وجہ سے میرا بہت سا قلمی سرمایہ ضائع ہوگیا۔، بیسوں سال میں نے شاعری کی ،غزلیں ،نظمیں ،قطعات سبھی کچھ لکھے اور ایک ضخیم مجموعہ کلام ''روداد قفس'' کے نام سے مرتب کیا تھا خدا جانے وہ مسودہ کیا ہوا ، زمین نگل گئی یا آسمان نے اچک لیا۔ یا ملہم غیبی نے اپنے الہامات واپس لیکر سرد خانے میں ڈال دیا۔ اس کا ایک ورق بھی میرے پاس نہیں ۔ مشاعروں میں کبھی اپنا کلام نہیں سنایا۔ اس لئے حافظہ میں بھی زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ اس کے ضائع ہونے کا افسوس کچھ زیادہ اس لئے نہیں ہوا کہ بعد میں شاعری میں نے ترک کردی۔ کیوں کہ جوں جوں عمر آگے بڑھتی جاتی ہے۔ پچھلی ہر بات کی قیمت نظر سے گرتی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے ہی کلام پر نظر ثانی کرتا تو اس کا بڑا حصہ قلمزد کردیتا، پھر ایسی چیز ضائع ہونے کا کیا افسوس!

دارالسلام کا قیام........................

اسی زمانے میں بڑے پیمانے پر ایک عربی مدرسہ قائم کرنے کا خیال آیا۔ بلکہ حالات نے اس کو قائم کرنے پر مجبور کردیا۔ ہمارا حلقہ اثر جن لوگوں پر مشتمل تھا وہ

یہاں کے قدیم مدرسہ کے تعلیمی وانتظامی نظام سے مطمئن نہیں تھے، میں اور رفیق قدیم مولانا محمد قاسمی ۱۹۵۲ء میں اس کی نظامت سے مستعفی ہو چکے تھے۔

میں نے احباب کولیکر ایک صاحب دل کے سائبان اور صحن میں ایک مدرسہ قائم کر دیا اور اس کا نام دارالسلام رکھا۔ یہ ۱۹۵۴ء کا واقعہ ہے۔محرم میں با قاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔اور زمین کی تلاش جاری رکھی، میرا نقطۂ نظر ابتداء ہی سے یہ تھا کہ مدرسہ اندرون آبادی نہیں ہونا چاہئے۔اس کیلئے کھلی فضا اور وسیع وعریض زمین چاہئے۔ اتفاق سے یہ بات میرے علم میں لائی گئی کہ آبادی کے باہر اسٹیشن کو جو راستہ جاتا ہے ٹھیک اس کے کنارے ایک افتادہ زمین ہے۔ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔زمین گرام سماج کی تھی۔گرام پنچایت میں ہندو مسلمان دونوں ممبر تھے۔مسلمان ممبران میں رضا خانی جماعت کے افراد بھی تھے۔ ہندو ممبران کو اپنا ہم نوا بنانا میرے لئے آسان تھا کیوں کہ وہ میرے سیاسی ورک سے واقف بھی تھے اور اعتراف بھی کرتے تھے۔البتہ مسلمان ممبران اور گرام پردھان کو راضی کرنا دقت طلب تھا۔اتفاق سے انہیں دنوں ہندو ممبران نے ایک میدانی علاقہ میں واقع ایک مندر کیلئے زمین کا مطالبہ کیا تب مسئلہ آسان ہو گیا، میں نے مدرسہ کیلئے زمین کی درخواست دیدی اور زمین کی نشاندہی کر دی۔ یہ دونوں درخواستیں ایک فائل میں آگئیں۔اس سے مندر اور مدرسہ دونوں کو زمین دان میں دینے کا پرستاؤ پنچایت میں آیا۔ دونوں پرستاؤ اتفاق رائے سے منظور کر لئے گئے۔اس کی با ضابطہ نقل میں نے لے لی۔صرف ڈپٹی کلکٹر کی منظوری باقی رہی۔اس کو ہم نے اپنے ذرائع سے حاصل کرلیا۔ یہ ایک بیگھہ کا پلاٹ جولب سڑک واقع تھا۔ جب زمین قبضہ میں آگئی تو پنچایت کے سارے ہندو مسلم ممبران کو دعوت دی گئی کہ وہ زمین پر ہمارا قبضہ دلائیں۔ پردھان اور سارے ممبران

اور کچھ دوسرے معززین اور میرے جملہ احباب موقعہ پر آ گئے۔ ان سب کی موجودگی میں سڑک کے حاشیہ پر والی دیوار کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ کچھ پرانے زمیندار مزاحمت کے ارادے سے آئے لیکن صورت حال دیکھ کر خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ البتہ ایک حریص زمیندار نے رخنہ ڈالنے کی کوشش کی۔ تو اس بنجر زمین پر تین درخت آم اور مہوے کے تھے۔ اس کو دیکر اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ دہن سگ بہ لقمہ باید دوخت۔ زمین پر قبضہ کے بعد شمالی جانب ایک پختہ مگر سفالہ پوش تیس فٹ لمبے کمرے کی بنیاد ڈال دی۔ اور اس کو مکمل کر کے مدرسہ کو یہاں مستقل کر دیا۔ پھر اس زمین سے متصل جتنے کھیت تھے باری باری سب خرید لئے گئے۔ جنوبی سمت میں زمین کا ایک قطعہ تھا اسے چک بندی آفیسر نے مدرسہ کے نام کر دیا۔ کیوں کہ وہ چک بندی کے دوران دارالسلام ہی میں مقیم رہا۔ اور کئی مہینے رہا، اس کو یہاں کئی طرح کی سہولتیں حاصل تھیں۔ اس لئے اظہار ممنونیت میں از خود یہ نمبر مدرسہ کو دیدیا۔ **الانسان عبدالاحسان**

دارالسلام کے سلسلے میں مجھ کو رفیق مکرم مولانا محمد قاسمی کے ساتھ بڑی مشکلات سے گذرنا پڑا۔ برسہا برس کی تگ و دو، دوڑ دھوپ اور بے پایاں جدوجہد کے بعد کچھ تعمیرات ہوئیں۔ اور بتدریج عمارت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج اس کی شاندار عمارت کھڑی ہے۔ اور ایک وسیع قطعہ اراضی کا مالک ہے۔ میں نے اپنے تجربات کی روشنی میں ساری زمینوں کی خریداری رجسٹری اور ساری دستاویزیں سب اپنے ذاتی نام سے لکھوائیں کیوں کہ مدرسوں کی تاریخ یہ رہی ہے کہ جب ہزاروں قیامتوں سے لڑ کر بانی مدرسہ اس کو ترقی دیتا ہے اور بلند مرتبہ پر پہونچا تا ہے تو وہ لوگ جو اس کے ابتدائے قیام کے زمانہ میں اس کے دشمن تھے اس کی مخالفت کرتے تھے، ہر کام میں رخنہ ڈالتے تھے۔ قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے۔ وہی لوگ اس کی ترقی یافتہ

شکل کو دیکھ کر اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ عزت وشاں کی جگہ بن چکی ہے۔اور بانی مدرسہ کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے ہیں۔اور جس پروگرام اور نقطۂ نگاہ کے پیش نظر اس نے یہ ادارہ قائم کیا تھا اس کو تہس نہس کر کے اپنے صوابدید کے مطابق چلاتے ہیں۔اور بانی مدرسہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔اس لئے میرے لئے ضروری تھا کہ ساری دستاویز اپنے نام لکھاؤں ،میرے حلقۂ احباب اور ساتھیوں کی بھی یہی متفقہ رائے تھی کہ کسی کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔بس ایک مشورہ کمیٹی بنائی تھی۔اس کمیٹی میں صرف وہی گنتی کے چند افراد تھے۔جن کو لیکر میں نے ساری زندگی قومی وملی سرگرمیوں کو انجام دیا تھا۔مدرسہ کی ساری زمین پر میرا مالکانہ قبضہ ہے۔لیکن اللہ کے فضل سے کبھی اس سے ذاتی فائدہ مدنظر نہیں رکھا۔اور ہمیشہ رضا کارانہ ساری خدمات انجام دیں اور مدرسہ سے میں نے یا رفیق مکرم مولانا محمد قاسمی نے کبھی ایک پائی حق المحنت نہیں لیا اور اخلاص کے ساتھ اجر آخرت کی امید پر کام کرتے رہے۔مولانا محمد صاحب قاسمی کو تاحیات اس کا ناظم بنا دیا۔انہوں نے ہر طرح کے حالات میں مدرسہ کو سنبھالا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کی مخلصانہ خدمت انجام دیتے رہے۔

ان کے انتقال کے بعد میں بالکل تنہا رہ گیا۔طبیعت بجھ کر رہ گئی۔دل ٹوٹ گیا، امنگیں اور حوصلے دم توڑنے لگے۔انہیں حالات میں مجھ سے وطن بھی چھوٹ گیا۔میں مستقل باہر رہنے لگا۔مالیات کی فراہمی میرے بس سے باہر ہو چکی تھی۔اس لئے چند سال قبل اس کو الہ آباد بورڈ سے ملحق کرا دیا۔خدا کا شکر ہے کہ اساتذہ ایک ذہن ومزاج اور ایک مکتبۂ فکر کے ہیں اس لئے کبھی کوئی انتشار آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔مدرسہ اپنی خصوصیات وامتیازات کے ساتھ نیک نام مدرسہ ہے، اکابر علماء و

مشائخ کی آمدورفت جاری ہے۔

جنون بادیہ پیمائی..........................

پندرہ سولہ برسوں تک مسلسل وطن میں رہا۔ ۱۹۷۲ء میں ضلع اعظم گڈھ کے مغربی حصہ میں دو مواضعات نوناری اور سجتی میں ہندو مسلم فساد ہو گیا بلکہ ان دونوں گاؤں پر شر پسند ہندوؤں کا اجتماعی حملہ ہوا، سب کچھ لوٹ کر گھروں میں آگ لگادی۔ مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند فساد زدہ علاقہ کا دورہ کرنے آئے، دیکھا کہ بیشتر مکانوں میں آگ لگادی گئی ہے۔ صرف دھوئیں سے کالی دیواریں کھڑی رہ گئی ہیں۔ بڑے بڑے لوہے کے صندوقوں کو جو سامانوں سے بھرے ہوئے تھے ان کو ہتھوڑوں سے توڑ کر سامان لوٹ لیا گیا تھا اور ہر گھر میں جھاڑو پھیر دی گئی تھی۔ یہ دونوں گاؤں مسلمانوں کے بڑے خوشحال گاؤں تصور کئے جاتے تھے۔ مگر آج اس کے باشندے لٹے ہوئے مسافروں کی طرح زندگی گذار رہے تھے۔ مولانا موصوف نے ان کی ریلیف کیلئے ایک کمیٹی محمد مسعود وکیل کی نگرانی میں بنادی تھی۔ اور ضرورت سمجھی کہ ریلیف کے کاموں کا کوئی نگراں یہاں مقرر کر دیا جائے تا کہ ضرورتمندوں کو امداد صحیح طور پر پہونچ سکے۔ کسی نے میرا نام پیش کر دیا، انہوں نے وہیں سے ایک خط لکھ کر ایک مولوی صاحب کے ذریعہ میرے پاس بھیج دیا۔ حامل رقعہ نے زبانی کہا کہ مولانا نے آپ کو ابھی بلایا ہے کہ آ کر ریلیف کے کاموں کو سنبھال لیں۔ میں اسی دن انہیں کے ہمراہ سرائمیر پہونچ گیا، ریلیف کا مرکزی دفتر نہیں تھا۔ وہاں سے نوناری تقریباً تین کیلومیٹر تھا۔ مسعود وکیل کو جو بعد میں پی ڈبلیو ڈی کے منسٹر ہوئے۔ اس وقت جمعیۃ علماء سے وابستہ تھے۔ وہی اس کے انچارج تھے۔ میں بیس دن سرائمیر کے اس دفتر میں کام کرتا رہا۔ اور آخری دس دن فساد زدہ نوناری گاؤں میں جو کچھ بن سکا

کیا۔ایک دن مجھے ٹیلیگرام ملا کہ فلاں تاریخ کو لکھنؤ آ جایئے میں دوسرے دن سراسیمہ سے لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ اور چار باغ ریلوے اسٹیشن سے اتر کر سیدھے نخاس اکبری گیٹ پہونچا جہاں حاجی سید محمد امین صاحب کی کوٹھی پر صوبائی جمعیۃ علماء کی میٹنگ ہو رہی تھی ۔ مجھے بھی اظہار خیال کا موقعہ دیا گیا۔ اسی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ مجھ کو صوبائی جمعیۃ علماء کے دفتر کا انچارج بنایا گیا ہے۔ دوسو روپئے ماہوار مشاہرہ طے ہوا۔ اور کہا گیا کہ کل آپ دفتر جا کر چارج لے لیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

چار برس لکھنؤ میں

اب میں لکھنؤ آ گیا ، یہاں تقدیر نے میرے پاؤں میں چار سالوں کیلئے بیڑیاں ڈال دیں، دوسرے دن صوبائی جمعیۃ کے سکریٹری خواجہ محمد رائق ایڈوکیٹ نے مجھے دفتر پہونچایا۔ مجھے چارج میں رجسٹر، فائلیں اور اہم کاغذات کے بجائے کھنڈر نما ایک عمارت دی گئی۔ جس میں کمزور دل کا آدمی تنہا نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ کھنڈر جس کو جمعیۃ علماء ہند کا صوبائی دفتر بنایا گیا تھا، نواب گونگے کے باغ میں واقع تھا۔ یہاں چاروں طرف پاکستان سے آئے ہوئے رفیوجیوں اور پناہ گزینوں کی آبادی تھی ۔ یہاں پنجاب کے سکھ اور ہندو اور کچھ سندھی ہندو ہی آباد تھے۔ دور دور تک کسی مسلمان کا گھر تھا نہ دوکان ۔ رفیوجیوں کی دوکانیں نو تعمیر اور خوبصورت تھیں ۔ ان کے شوروم خوب سجے ہوئے تھے، ان کے کاونٹر شیشوں اور سنمائیکا سے آراستہ تھے اور چمک رہے تھے۔ دیواریں آئلی پینٹ کی وجہ سے آئینہ تھیں ۔ یہ دورویہ دوکانوں کا سلسلہ جا کر ایک کھنڈر نما عمارت پر ختم ہوا تھا۔ یہ عمارت قدیم زمانہ کا ڈنجر ہاؤس معلوم ہوتی تھی ۔ جہاں

مردوں کو ڈال دیا جاتا تھا اور وہ سڑ گل کر ہڈیوں کا پنجرہ رہ جاتا تھا۔ اسی کھنڈر کی دوسری منزل پر جمعیۃ علماء کا دفتر تھا۔ دفتر کے زینے سے پہلے ایک نیم تاریک گلیارا تھا جس میں جاتے ہوئے وحشت ہوتی تھی اس کے راستہ میں گوبر لید پڑی ہوئی تھی۔ گلیارے کے آخری سرے پر ایک موٹی سی گائے بندھی تھی۔ اس کے آگے ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا سامنے آنگن میں تین چار موٹی تازی بھاری بھرکم پنجابی یا سندھی عورتیں چارپائیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ململ کا سفید باریک کرتا ان کے بھاری بھرکم وجود پر اس طرح چپکا ہوا تھا جیسے اب پھٹے تب پھٹے۔ اس آنگن کی دیوار سے متصل ایک زینہ تھا جو اوپر جاتا تھا۔ ہر زینہ کی ایک دو اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ جیسے بوڑھے آدمی کے دانت ادھر ادھر سے گر گئے ہیں۔ زینہ کی اینٹیں وہ اتنی گھس چکی تھیں کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ اینٹیں کس طرح کے سانچوں میں بنائی گئی تھیں۔ چار کونوں والے یا ملکہ وکٹوریہ کے روپیہ کی طرح گول سانچے میں بہت احتیاط سے زینوں پر پاؤں رکھنا پڑتا تھا، ذرا بھی غفلت ہوئی اور اکھڑی ہوئی اینٹ کے خلا میں آپ کا پاؤں پڑ گیا تو معلوم ہوا کہ آپ شکنجہ میں جکڑ دیئے گئے ہوں، یہ زینہ اوپر جا کر ایک دروازے میں ضم ہو جاتا تھا۔ یہ صرف قانونی دروازہ تھا کیوں کہ اس کے کواڑ بند ہونے کے باوجود آگے کا سارا صحن نظر آتا تھا، جب کواڑ کھولا گیا تو اس پر جڑی ہوئی ٹن کی چادریں بوسیدہ اور جھرجھر ہو چکی تھیں۔ اس طرح بجنے لگیں جیسے کسی نے جلترنگ چھیڑ دیا ہو، یا کہیں چڑیلیں رقص کر رہی ہیں اور ان کے پاؤں کی جھانجھ بج رہی ہو۔ اس کے فریم کا ہر جوڑ اتنا ڈھیلا اور خستہ ہو چکا تھا کہ دروازہ کھلنے پر اتنا تیز کانپ رہا تھا جیسے چور ہنٹر لئے ہوئے داروغہ کے سامنے کانپتا ہے۔

خواجہ صاحب کے ساتھ میں اوپر گیا، سامنے ایک بڑا سا کمرہ تھا، صحن میں

بانس کا ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس کا بان لٹک کر زمین کو چھو رہا تھا جیسے قریب الولادۃ عورت کا پیٹ اس کے جسم سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بڑے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ چوں چاں، چخ چخ چراک کا نعرہ لگاتے ہوئے کھل گیا یہ کواڑوں کا استقبالیہ ترانہ یا خیر مقدم سنگیت تھا جو نئے آفس انچارج کے اعزاز میں گایا جا رہا تھا، میں خواجہ صاحب کے ساتھ دفتر میں داخل ہو رہا تھا، میرا سر فخر وغرور سے تنا ہوا تھا کہ میں اتنے بڑے صوبے کے دفتر کا انچارج بنایا گیا ہوں میں اپنے صوبائی آفس میں بیٹھ کر میرٹھ، غازی آباد سے لیکر اعظم گڈھ اور بلیا تک میرے خداد حکومت میں داخل ہوگا۔ میرا حکم فرمان اتنے وسیع وعریض سرزمین میں جاری ہوگا جتنی وسیع وعریض یورپ کی بہت سی ریاستیں بھی نہیں ہیں۔ میں نے اپنے آفس میں قدم رکھا تو وہ ایک دم سے ویران نظر آیا، نہ کرسیاں، نہ میز، نہ زمین پر فرش حتیکہ ٹاٹ اور چٹائی تک نہیں تھی۔ زمین پر آدھی انچ سیاہ دھول جمی ہوئی تھی۔ جیسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرمہ بنانے کا کارخانہ ہوا اور سرمہ پیس کر پورے فرش پر پھیلا دیا گیا ہے۔ صرف ایک بوسیدہ اور بد رنگ اسٹول پر ٹیلیفون رکھا ہوا تھا، اس بڑے کمرے کے ایک چوتھائی حصہ کا پارٹیشن کر کے دفتر انچارج کا خاص اور پرائیویٹ آفس بنایا گیا تھا مجھے بتایا گیا کہ یہ پارٹیشن پلائی وڈ کا بنایا گیا ہے۔ لیکن مجھے کسی طرح یقین نہیں آیا، کیونکہ پلائی وڈ کی تینوں پرتیں خستہ اور بوسیدہ ہو کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکی تھیں، اگر چھت کا پنکھا چلایا جائے تو اس کی ہوا سے یہ پرتیں اس طرح اڑنے لگیں جیسے بادِ صبا کے جھونکے سے کسی زہرہ جمال کے سر کا ریشمی دوپٹہ۔ اسی پارٹیشن کے مخصوص حصے میں لکڑی کی ایک کالی الماری کھڑی تھی اس میں دس پندرہ فائلیں دھاگے سے باندھ کر رکھی ہوئی تھیں۔ کھول کر دیکھا تو کسی میں ایک کارڈ پڑا ہوا تھا، کسی میں ایک یا دو خط، کسی میں کچھ بھی نہیں۔

خطوط بھی ذاتی نوعیت کے تھے۔اس محفوظ حصہ میں بھی کسی طرح کا فرش نہیں، زمین سے گرد لپٹی ہوئی تھی۔

میں نے دفتر کا چارج لیا.........................

میں نے صوبائی دفتر کا چارج لے لیا، مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟ کن لوگوں سے رابطہ قائم کرنا ہے، اضلاع کے ذمہ دار کون کون ہیں؟ ان کا ڈاک کا پتہ کیا ہے؟ مجھے کس طرح سرکلر جاری کرنا ہے؟ اپنے دستخط یا صدر و سکریٹری کے دستخط سے؟ یہ دونوں کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کس طرح دستیاب ہوں گے؟ کس طرح کی ہدایات دینی ہیں، میرے حدود اختیارات کیا ہیں؟ اور فرائض منصبی کیا ہیں؟ اضلاع کے جماعتی کارکن آئیں اور ان کے کام کا تعلق حکومت اتر پردیش کے دفاتر سے ہو، یا کسی وزارت سے متعلق ہو، یا کسی وزیر سے متعلق ہو تو میں اس کو کیسے انجام دوں گا؟ اس طرح کے سیکڑوں سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔کوئی میری رہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔ میں گاؤں کی زندگی سے نکل کر آیا تھا، جس نے کبھی ٹیلیفون کا ڈائل تک نہیں گھمایا تھا، مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ حکومت کے آفسوں میں کیسے کام ہوتا ہے۔منسٹروں سے ملنے کا کیا طریقہ ہے؟ ان کے ملنے کے آداب کیا ہیں؟ ان سے ملاقات کا وقت کیسے لیا جاتا ہے۔غرضیکہ ان گنت مسائل تھے جن سے میرا کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا اور میں اپنے طور پر یہ سمجھ چکا تھا کہ مجھے یہ سارے امور انجام دینے ہیں۔

پہلا معرکۂ کارزار.......................

میرے لکھنؤ پہونچنے کے وقت تک ایک عارضی دفتر انچارج تھا اس کو قاری افتخار کہا جاتا تھا۔۴۷۔۴۸ سال کی عمر رہی ہوگی۔ مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں مدرس تھا۔ یہ انچارج گہرے سانولے رنگ اور کسرتی بدن والا آدمی تھا۔ دانت پیس کر بات کرنے

کی عادت تھی وہ ہر کام بائیں ہاتھ سے کرتا تھا۔ چہرے سے خشونت برستی تھی۔ جو صاف بتاتی تھی کہ بدمزاج اور تندخو آدمی ہے، دفتر سے تعلق رکھنے والے سکریٹری، خزانچی سب اس سے ڈرتے تھے، چونکہ بدزبان تھا۔ ہر شخص اس سے بات کرتے ہوئے جھجھکتا تھا کہ نہ جانے کب کیا کہہ دے؟ مجھے دوسروں سے یہی معلوم ہوا تھا، اسی اندیشہ کی وجہ سے چارج دیتے ہوئے اس کو انہوں نے نہیں بلایا تھا جبکہ اصولی طور پر اس کو موجود رہنا چاہئے تھا، چارج دینے والوں نے اپنی بلا میرے سر ڈال دی تھی۔ کہ نیا انچارج اس سے نمٹے، یہ پہلی بددیانتی تھی جو میرے ساتھ کی گئی۔ اسے اپنے عہدے کے چھن جانے کا ملال بھی تھا اور غصہ بھی۔ اس نے میری راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کئی بار کوشش کی۔

دفتر کی شکل وصورت ایسی تھی کہ کوئی بھی پڑھا لکھا اچھی سوسائٹی کا آدمی وہاں آنے کیلئے تیار نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے دفتر میں کسی کی بھی آمد ورفت نہیں تھی۔ ہر دم ایک ہو کا عالم رہتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ کس طرح اس کو اپنے رہنے سہنے اور اپنے کام کے لائق بناؤں۔ ذہن ہمیشہ سے ایک خاص طرح کی وضع داری کا عادی تھا، میں ان حدود سے باہر نہیں نکل سکتا تھا، جس جگہ بیٹھ کر انسان میں احساس کمتری پیدا ہو، ایسے مقامات پر کھڑا ہونا بھی میرے لئے دشوار تھا۔

میں نے پورے کمرے میں جھاڑو لگائی، پارٹیشن کی بدنما اور جھر جھر کرتی ہوئی پلائی وڈ کو نوچ کر باہر پھینک دیا اور پورے کمرے کو یکساں کر دیا۔ اپنے ساتھ کی دری اور گدا بچھا دیا۔ دو سفید چادریں میرے ساتھ تھیں ان کو اس پر ڈال دیا کہ ٹیلیفون کے اسٹول کو اٹھا کر اپنے زمینی فرش کے پاس رکھ لیا، کمرے کی فضا ایک گونہ صاف ستھری نظر آنے لگی میری وحشت کچھ کم ہوئی۔

ایک دن چار بجے سابق انچارج آیا تو اس نے کمرے کا نقشہ بدلا ہوا دیکھا، وہ کئی بار پہلے آ چکا تھا وہ لڑائی کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا اس نے کہا کہ یہ پارٹیشن کیا ہوا؟ کیوں ختم کر دیا گیا؟ اس کا لب ولہجہ جنگجویانہ تھا۔ دانت پیس کر اور آنکھیں چڑھا کر باتیں کر رہا تھا میں نے دل میں کہا "گربہ کشتن روز اول" میں نے جواب میں کہا، آپ کون پوچھنے والے؟ دفتر سے آپ کا کیا سروکار؟ اس نے گرم ہو کر اپنا بایاں ہاتھ فضا میں لہرایا۔ کالا آدمی جب غصہ ہوتا ہے تو اس کا چہرہ کچھ اور بھیانک ہو جاتا ہے۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا جلدی معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے خاموشی میں مصلحت نہیں دیکھی، ترکی بہ ترکی جواب دینا ہی حالات کا تقاضا تھا، میں نے کہا:

قاری صاحب! آپ کی کیا حیثیت؟ میں نے پولیس والوں کو پٹوایا ہے۔ تھانیدار پر مقدمہ چلوا کر معافیاں منگوائی ہیں۔ اگر میں کچھ کرنے پر آمادہ ہو گیا تو آپ کا پتہ نہیں چلے گا۔ ایک ٹیلیفون میں چوبیس گھنٹوں کے لئے آپ کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے بند کروا ہی سکتا ہوں، ۴۵۲ کی تھانے میں اطلاع آپ کی رگ رگ کا نشہ اتار دے گی، ورنہ شرافت کے ساتھ بات کیجئے۔ میں سیاسی ورکر ہوں، مولوی ملا نہیں۔ آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔"

اس نے جب میرا رویہ دیکھا اور میرے ٹھہرے ہوئے لب ولہجہ کو دیکھا تو وہ ذرا ٹھٹکا، دھونس جمانے والے اکثر ایسے آدمی اندر سے بزدل ہوتے ہیں، اگر حریف طاقتور ہے تو وہ زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا وار کارگر ثابت ہوا، میں ذرا تیوری چڑھا کر کہا آپ شرافت سے تشریف لے جایئے۔ آج کے بعد دفتر میں قدم رکھنے کی کوشش مت کیجئے گا ورنہ انجام بھگتنے کیلئے تیار رہئے گا۔ وہ دانت پیستا

ہوا چلا گیا اور پھر میں جب تک لکھنؤ میں رہا اس کی صورت نہیں دیکھی۔

دوسرا معرکہ......................

ہمارا کھنڈر نما دفتر کرایہ پر تھا، اس کی مالک ایک مسلمان عورت تھی، اس نے دفتر والوں سے کہا کہ آپ لوگ مکان خرید لیں میں آپ لوگوں کو کچھ کم قیمت پر دیدوں گی۔ اگر آپ لوگ نہیں خریدیں گے تو میں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردوں گی۔ لیکن دفتر والوں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ اس عورت نے ایک سندھی رفیوجی کو ۱۷ ہزار روپئے میں بیچ دیا۔ لیکن دفتر والوں نے دوسری منزل پر سندھی کا قبضہ نہیں ہونے دیا۔ اس نے ایک بار گراؤنڈ فلور پر دوکان بنانی چاہی تو اس کو دفتر والوں نے بذریعہ پولیس رکوادیا۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔ وہ رفیوجی تھا دفتر کے اردگرد تمام رفیوجی آباد تھے۔ سب اس سندھی کے ہم نوا اور ہمدرد تھے۔ سندھی نے دفتر والوں پر مقدمہ دائر کردیا۔ دوسال سے اس نے کرایہ لینا بند کردیا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کررہا تھا کہ عمارت خالی ہوجائے۔ تاکہ توڑ کر نئی عمارت تعمیر کرائے۔ مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تھی۔ اتفاق سے میں دہلی گیا ہوا تھا، ایک ہفتہ کے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ کمرے کی چھت کا ایک حصہ گر گیا ہے۔ کمرہ کیچڑ سے بھرا ہوا ہے۔ یہ برسات کا موسم تھا۔ مزدوروں کو بلا کر میں نے صفائی کرادی۔ اور اب میں چھت بنوانا چاہ رہا تھا، مزدور لگے ہوئے تھے کہ ایک دن بارہ بجے دس بارہ مسٹنڈے اور لحیم شحیم سکھ اور کچھ سندھی رفیوجی آئے، ان کو مالک مکان اپنی حمایت میں لایا تھا۔ میں اس وقت تنہا تھا۔ پاس پڑوس میں دور دور تک کوئی مسلمان نہیں رہتا تھا۔ صرف رفیوجیوں کے مکانات اور دوکانیں تھیں۔ بیچ میں یہ دفتر چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ ان کی آمد کا انداز، ان کی شکل وصورت ان کے ڈیل ڈول دیکھ کر پہلے مرحلہ میں ڈرا۔ ان میں کا ایک فرد بھی چاہتا تو اپنے دونوں

ہاتھوں پر مجھے اٹھا کر چھت سے باہر گلی میں پھینک سکتا تھا میں ابتداء کا دبلا پتلا، وہ جیم شحیم، میرا خوف اور ڈر فطری تھا۔ انہوں نے آتے ہی کہا کہ گھر ہمارا ہے۔ اس میں کسی کو کچھ تعمیر کرانے کا حق نہیں۔ کام ابھی بند کر دیجئے اور مزدوروں کو ڈانٹ کر کام رکوا دیا۔ میں نے کہا میں اس گھر میں کرایہ دار ہوں۔ اپنی آسائش کیلئے جو مناسب سمجھوں گا کروں گا، انہوں نے گرم لہجہ میں کہا آپ قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اگر میں قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہوں تو آپ کو تھانے جانا چاہئے۔ میرے خلاف رپورٹ کیجئے۔ پولیس آئے گی وہ خود کام بند کروادے گی۔ قانون کو آپ کو ہاتھ میں لینے کی کس نے اجازت دی ہے؟ اگر آپ پولیس نہیں بلا سکتے ہیں تو میں خود تھانے فون کر کے پولیس بلا لیتا ہوں، مسئلہ حل ہو جائے گا۔

میں ان کی صورتیں دیکھ کر دل میں تو ڈر گیا تھا لیکن سوچا کہ میرے چہرے بشرے پر ذرا بھی خوف زدگی کے آثار ظاہر ہوئے تو وہ سب کچھ کر گذریں گے۔ جو سوچ کر آئے ہیں، دل ساتھ چھوڑ رہا تھا لیکن عقل نے لگام اپنے ہاتھ میں رکھی تھی میں نے اپنے لب ولہجہ میں مرعوبیت کی جھلک نہیں آنے دی۔ یہ کہہ کر میں دو قدم ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔

ان کو دو چیزوں سے ڈر تھا ایک اس بلڈنگ پر ہمارا لہراتا ہوا جھنڈا اور اسی مکان نمبر سے ہمارے نام کا ٹیلیفون۔ یہ دونوں چیزیں مکان پر ہمارے قبضہ کا نا قابل انکار ثبوت تھیں۔ ان پر گھر میں گھس کر لوٹ پاٹ کا الزام آسکتا تھا۔ وہ ۴۵۲ کے ملزم بنائے جا سکتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ دیر کیلئے ہتھکڑیاں پڑ سکتی تھیں۔ اس لئے وہ ذرا ڈھیلے ہوئے اور ایک بوڑھے سندھی ہندو نے بات بگڑتی دیکھ کر بات سنبھالی اس نے سب کو روک کر خود بات کرنی شروع کر دی۔

وہ بڑا کائیاں جہاندیدہ اور تجربہ کار سندھی تھا۔ اس نے اپنی پاکستان کی زندگی کی کہانی چھیڑ دی۔ اس نے کہا کہ وہاں میرا گھر مسلمانوں کے محلے میں تھا۔ ہم لوگ بھائیوں کی طرح رہتے تھے، جب ہم لوگ اپنے گاؤں سے نکلے تو ہمارے پڑوسی مسلمانوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ انہوں نے ہماری خوشامدیں کیں کہ ہم لوگ رک جائیں، وہ ہر طرح ہماری حفاظت کریں گے۔ لیکن حالات ہم کو نکلنے پر مجبور کررہے تھے۔ اس لئے ایک طرف ہمارے مسلمان بھائی رورہے تھے دوسری طرف ان کو چھوڑتے ہوئے ہماری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہم ان کی یاد میں روتے ہوئے ہندوستان آ گئے۔

اس نے یہ کہانی اس انداز سے سنائی کہ میں بڑا متاثر ہوا۔ اب وہ اصل موضوع پر آیا۔ اس نے کہا کہ اتنے دن یہاں آئے ہوئے ہم لوگوں کو ہو گئے لیکن ابھی تک ہم لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں مل سکی۔ ہمارا کوئی گھر نہ بن سکا۔ یہ مکان خریدا تو آپ لوگوں کی وجہ سے اس پر ہمارا قبضہ نہ ہوسکا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ مکان رہنے کے لائق ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا، اگر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے گفتگو کیلئے تیار ہیں تو میں بھی گفتگو کیلئے تیار ہوں اس سندھی نے کہا کہ چار بجے شام کو غریب خانے پر تشریف لائیے۔ میں نے وعدہ کرلیا، پھر وہ سب اٹھے اور فوراً چلے گئے۔ چار بجے جب میں پہونچا تو دس بارہ آدمی وہاں موجود تھے۔ کھڑے ہو کر استقبال کیا اور پوچھا ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟

پورے لکھنؤ میں ایک بھی مخلص آدمی جمعیۃ علماء سے وابستہ مجھے نہیں ملا جو جماعتی ذہن ومزاج کا ہو۔ اوراس کے لئے کچھ کرنے کی اس میں ہمت ہو۔ لکھنؤ میں دو ماہ قیام کے بعد میرا تجربہ یہی تھا۔ اس لئے کسی پر میرا اعتماد نہیں تھا۔ اس لئے ان

سے مشورہ کا کیا سوال؟ جتنے لوگ تھے وہ سب مفاد پرست اور مصلحتوں کے پیش نظر جماعت سے اپنی وابستگی کی نمائش کرتے تھے، ایسے لوگوں سے مشورہ کرنا مسئلہ کو الجھانا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مرحلہ پر ہر محاذ پر میں تنہا ہی رہا۔ خود مجھے اپنے اختیارات کے حدود اربعہ نہیں معلوم تھے لیکن پوری زندگی سرگرم سیاست میں گذری تھی۔ اس لئے خود اعتمادی میری فطرت بن چکی تھی۔ اور قوت فیصلہ ہمیشہ میرے ہمرکاب رہتی تھی۔ ہر بات پورے عزم و جزم کے ساتھ کرتا تھا۔

بات اسی سندھی نے چھیڑی اور پوچھا آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا آپ مجھے دس ہزار روپے نقد دیدیں تا کہ میں دوسری جگہ انتظام کرلوں تو آپ کا مکان خالی کردوں، دوسرے یہ کہ مکان کی تلاش کیلئے ایک مہینہ کی مہلت اور اپنے ہائی کمان سے مشورہ کرسکوں، آج کل وہ لندن میں ہیں، ہفتہ عشرہ میں آجائیں گے۔ اس نے میری دونوں باتوں کو تسلیم کرلیا اور کہا کہ دو ہزار روپئے کرایہ کے آپ کے پاس باقی ہیں بقیہ آٹھ ہزار روپئے ہم آپ کو نقد پیش کردیں گے، چونکہ بات صحیح تھی۔ میں نے منظور کرلیا اور ایک مہینہ کی مہلت انہوں نے مان لی۔ رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت۔

مکان کی تلاش........................

میرے لکھنؤ جانے سے پہلے جمعیۃ والوں نے ایک مکان نادان محل روڈ پر حاصل کرلیا تھا۔ دفتر کا سارا سامان اس مکان میں پہونچ چکا تھا، وہ مکان ٹھیک صدر روڈ پر تھا اور پبلک لانڈری کے سامنے تھا۔ یہ لانڈری بہت مشہور اور اس کا کاروبار بہت بڑا تھا۔ ایک باپ چار رحیم شمیم اس کے بیٹے اس لانڈری پر بیٹھتے تھے۔ بھائیوں میں سے ایک دیندار قسم کا تھا اور حج کرچکا تھا اس کو جمعیۃ کے بزرگوں سے کچھ تعلق تھا۔

مصلحتاً پورا خاندان جمعیۃ والوں کے قریب رہتا تھا۔اسی خاندان کی نگرانی میں یہ مکان دیدیا گیا تھا کہ جب قدیم دفتر کا مسئلہ حل ہوجائے گا تو دفتر کو یہاں منتقل کردیا جائے گا ساری تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں مگر اس میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی ۔اسی دوران پبلک لانڈری والوں کا کاروبار کچھ اور بڑھ گیا،اپنی دوکان ان کو تنگ معلوم ہونے لگی اور وہ ایک اور جگہ کی ضرورت محسوس کرنے لگے ۔دفتر کی یہ عمارت ان کی سپردگی میں تھی ۔ان کی نیت خراب ہوگئی ۔اور اس پر قبضہ کرلیا۔اور کہہ دیا کہ ہم نے ہی اسے حاصل کیا تھا اب ہم کو خود ضرورت ہوگئی اس لئے دفتر کو نہیں دی جائے گی ۔دفتر والے کیا کرلیتے ۔جو لوگ جمعیۃ سے وابستہ تھے ان میں جرأت نہیں تھی کہ ان سے بات کرتے ،کسی نے سامنے آنا پسند نہیں کیا،آپسی تعلقات جمعیۃ کے لئے کیوں خراب کرتے ۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پبلک لانڈری والوں نے اس میں اپنا کاروبار شروع کردیا اور جمعیۃ علماء والوں کو ان دھوبیوں نے ایسا دھویا کہ صاف کردیا اس لئے مجبوراً مجھے ایک مکان کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑا۔

لکھنؤ میں پراپرٹی ڈیلر (زمینوں کے دلال) بہت ہیں ۔ایک بنگالی دلال کچھ دنوں سے میرے پاس آنے لگا تھا۔گٹھیلا بدن ،رنگ ایک دم کالا اس کی مونچھیں کھڑی کھڑی ایسی تھیں جیسے معلوم ہوتا تھا کہ دو سیاہ بچھو ڈنک اٹھائے ہوئے ہیں ۔دیکھنے میں ایک دم غنڈہ معلوم ہوتا تھا۔لیکن طبیعت کا نیک تھا میری بڑی عزت کرتا تھا۔اس کا نام کریم تھا۔ میں نے ایک دن اس سے کہا کریم !امین آباد کے ایریا میں کوئی مکان روڈ پر دلاؤ،اس نے کہا میں کل بتاؤں گا۔دوسرے دن وہ آیا تو اس نے کہا کہ چلئے میں آپ کو مکان دکھادوں ۔مگر میں وہاں کھڑا نہیں ہوں گا۔بس اس مکان کی طرف اشارہ کردوں گا کیونکہ وہ ملیح آباد کے ایک جلالی خان صاحب کا مکان ہے۔ان

کو بھنک بھی لگ گئی کہ کوئی دلال میرے مکان کی بات کررہا ہے تو میری جان کے لالے پڑ جائیں گے، میں اس بنگالی دلال کے ساتھ چلا، گلمرگ ہوٹل سے آگے گوئن روڈ کے چوراہے پر پہونچا تو وہیں سے کھڑے ہوکر کچہری روڈ پر واقع ایک مکان کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سامنے والا دومنزلہ مکان بکنے والا ہے۔اسکے مالک ملیح آباد کے ایک خان صاحب ہیں ان کے مکان کے سامنے والے رفیو جی بنئے کی دوکان سے ان کے گھر سامان آتا ہے۔اب اس کا قرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ وہ خانصاحب کی ادائیگی سے باہر ہے۔اس رفیو جی نے ان سے کہا ہے کہ مکان میرے ہاتھ فروخت کردیجئے بقیہ رقم میں آپ کو ادا کردوں گا۔آج ہی کل میں یہ سودا ہونیوالا ہے۔آپ آج ہی کسی وقت ان سے بات کرلیں ورنہ مکان ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مجھے مکان کا محل وقوع بہت پسند آیا۔ میں شام کو حمزہ صدیقی کو لیکر خانصاحب کے یہاں پہونچ گیا۔ وہ صوبائی مسلم مجلس کے جنرل سکریٹری تھے۔خاندان تعلیم یافتہ تھا، بڑے طمطراق سے رہتے تھے۔میں نے بلاتمہید ان سے کہا کہ سنا ہے آپ لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے ملیح آباد تشریف لے جانا چاہتے ہیں۔اگر آپ مکان ہمیں دیدیں تو عنایت ہوگی۔وہ بہت دھیمی آواز میں باتیں کررہے تھے۔شاید ان کی انا اس راز کے افشا کو برداشت نہیں کررہی تھی کہ خانصاحب مجبور ہوکر اپنا مکان بیچ رہے ہیں، اسی لئے میں بھی پیرایۂ بیان بدل کر ان سے بات کی، یہ نہیں بتایا کہ وہ ہندو بنیا کو دے رہے ہیں۔ انہوں نے بہت آہستہ سے کہا کہ کل آپ تنہا گلمرگ ہوٹل کے تہہ خانے والے ریسٹورنٹ میں بعد نماز فجر فوراً آجائیں اور میرے ساتھ چائے پی لیں۔ چائے پر بات بھی ہوجائے گی۔

میں دوسرے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق تنہا پہونچ گیا۔خان صاحب

منتظر تھے، چائے آئی، انہوں نے نہایت مختصر بات کی اور کہا آپ تیس ہزار روپئے مجھے دیدیں، مکان آپ کا ہوجائے گا، میں نے بہت ہی نرم لہجہ میں کہا آپ کی ڈیمانڈ تو ۲۵ ہزار کی تھی مجھ سے یہ پانچ ہزار زائد کا مطالبہ میرے لئے حیرت انگیز ہے۔ وہ ہنسے اور ہنس کر ہی کہا کہ آپ لوگوں کے پاس پیسے بہت ہیں، پانچ ہزار سے آپ لوگوں کا کچھ بگڑنے والا نہیں، وہ جانتے تھے کہ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کیلئے مکان خرید اجارہا ہے۔ خان صاحب کا اشارہ اسی طرف تھا، میں نے بھی ہنس کر کہا کہ لکھ پتی آدمی بھی واجب دام سے ایک پائی زیادہ دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا، ہماری کیا اوقات ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک مسلمان کا ایک مسلمان سے سودا ہے خوشی سے طے ہوجائے تو بہتر ہے۔ مجھے ان کی یہ بات پسند آئی اور پھر میری نگاہ میں تو وہ مکان اب بھی سستا تھا اور بہت سستا، میں نے کہا کہ مجھے تیس ہزار منظور ہے، ادھر چائے ختم ہوئی ادھر بات بھی ختم ہوگئی۔

میں سیدھے دفتر آیا اور فوراً دہلی دفتر کو فون کیا۔ اتفاق سے مولانا مدنی فون پر مل گئے، میں نے بتایا کہ میں نے ایک نہایت موزوں جگہ پسند کرلی ہے۔ بات چیت مکمل کرلی ہے۔ ۳۰ ہزار روپئے پر سودا طے ہوگیا ہے۔ آپ کل لکھنؤ تشریف لاکر مکان ملاحظہ فرمالیں اور مالک مکان کو ایڈوانس دیکر پابند کرلیں تو بہتر ہوگا۔ مولانا نے جواب میں کہا کہ میں صبح کو لکھنؤ پہونچ رہا ہوں۔

وہ حاجی عبدالعزیز میرٹھی کو لیکر دوسرے دن لکھنؤ آگئے میں نے ان حضرات کو خان صاحب کے مکان پر پہونچا دیا۔ دونوں حضرات نے گھوم پھر کر مکان دیکھا۔ پھر نیچے ڈرائنگ روم میں آئے، خان صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کو پندرہ ہزار ابھی دیدیئے جائیں، فوراً خان صاحب کو پندرہ ہزار دیدیئے گئے، انہوں نے رسید لکھنی چاہی مولانا نے فرمایا کہ ہم کو آپ پر کامل اعتماد ہے کسی رسید دستاویز

اور پرنوٹ کی ضرورت نہیں۔خان صاحب اس اظہار اعتماد سے بہت متاثر ہوئے ،ایک ہفتہ میں کمشنر سے اجازت نامہ حاصل کرلیا گیا اور مکان کی رجسٹری ہوگئی۔

نئے دفتر میں.........................

یہ سارا کام ایک مہینہ میں ہوگیا۔حسب وعدہ پرانے دفتر کے مالک سندھی رفیوجی کو بلایا گیا تا کہ اس کو قبضہ دیدیا جائے ،وہ اپنے ساتھ چند مزدوروں کولیکر آ گیا۔ اس نے فوراً آٹھ ہزار روپئے نقد دیئے ۔ہم نے اپنا ٹیلیفون کاٹا ،جھنڈا اتارا،مولانا محمد قاسم شاہجہانپوری دفتر کے ایک حصہ میں مع بیوی کے سکونت پذیر تھے۔مولانا مدنی نے مجھ سے تنہائی میں کہا کہ مولانا شاہجہانپوری کو چار ہزار روپئے دے کر ان سے دریافت کرلیا جائے کہ ان کا سامان کہاں جائے گا اس کیلئے ایک ٹرک کا انتظام کردیا جائے۔چار ہزار روپئے مولانا محمد قاسم صاحب کو دیدیئے گئے ۔انہوں نے فتحپور جانے کا ارادہ ظاہر کیا جہاں ان کی ایک بیٹی رہتی تھی ۔سامان سمیت مولانا شاہجہاں پوری رخصت ہوگئے ۔سندھیوں نے فوراً مزدور لگا کر عمارت ڈھانی شروع کردی۔میں اپنے نئے دفتر چلا آیا۔یہ دومنزلہ مکان تھا۔نچلے کمرے میں دفتر رکھا اوپر دو کمرے تھے ایک صاف ستھرا چھوٹا کمرہ تھا اس میں میں نے اپنا سامان رکھ دیا اور اپنے لئے خاص کرلیا۔اس کے بالمقابل جو بڑا کمرہ تھا اس کو باورچی خانہ کی حیثیت دیدی گئی۔حمزہ صدیقی میری ان تمام کارروائیوں میں ہمہ وقت ساتھ ساتھ رہے ۔ وہ میرے سکریٹری کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

حمزہ صدیقی.........................

میں جب لکھنؤ گیا اور دفتر کا چارج لیا تو اس کھنڈر نما مکان میں ایک وجیہ و شکیل نوجوان موجود تھا، چہرے سے کسی شریف خاندان کا معلوم ہوتا تھا،لکھنؤ یونیورسٹی

میں پڑھتا تھا اور اسی کھنڈر نما دفتر میں رہتا تھا ۔ یہ گویا دفتر والوں کا اس شریف نوجوان پر احسان تھا۔ جب خواجہ رائق ایڈوکیٹ مجھے دفتر کا چارج دینے کیلئے لے گئے تو وہ نوجوان موجود تھا۔خواجہ صاحب نے اس سے کہا آپ اپنا کوئی دوسراانتظام کرلیں ۔اب دفتر کے مستقل انچارج آ گئے ہیں ۔اب کسی دوسرے کو یہاں مستقل قیام کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ،وہ نوجوان اسی دن دفتر سے چلا گیا۔

ایک ہفتہ بعد وہ نوجوان دن میں دس بجے دفتر آیا، میں دفتر میں تنہا رہتا تھا۔ اس نے آ کر اپنا تعارف کرایا، میرا نام حمزہ صدیقی ہے ۔ میں بارہ بنکی ضلع کے ایک گاؤں پرشدے پور کا رہنے والا ہوں ۔ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے کا طالب علم ہوں ۔اور شہر میں ٹیوشن کرتا ہوں جس سے میں اپنا خرچ پورا کرتا ہوں ۔ میں کوئی مکان کرایہ پر لیکر رہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ۔،اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں پھر آجاؤں ۔اس کے چہرے سے اور بات سے شرافت نمایاں تھی ۔اس کی پیشانی پر غیرت وخودداری کی آب وتاب تھی ،لب ولہجہ بڑا غیر تمندانہ تھا وہ اپنی مجبوریوں کا اظہار کر رہا تھا لیکن اپنی غیرت وخودداری کوٹھیس نہیں لگنے دیتا تھا۔ مجھے اس کی یہ ادا پسند آ گئی ۔اس نے پیشکش کی کہ میں اپنا کھانا خود پکاتا ہوں ۔آپ کا کھانا بھی اپنے ساتھ پکادوں گا۔اپنے کپڑے خود دھوتا ہوں ،آپ کے کپڑے بھی اپنے کپڑوں کے ساتھ دھودوں گا۔میرا دل پانی پانی ہوگیا۔اس کی باتوں سے میں اتنا متاثر ہوا کہ میں نے کہہ دیا کہ آپ ابھی آجایئے اور مستقل میرے ساتھ رہئے ۔اور میرے چھوٹے بھائی کی طرح رہئے ۔جب تک میں ہوں آپ کو یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

چنانچہ وہ نوجوان آ گیا۔اس کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی ،صرف کندھے میں لگانے والا ایک ائیر بیگ تھا اور چند کتابیں وہ میرے ساتھ دفتر میں

رہنے لگا اور میں جب تک لکھنؤ میں رہا وہ ہمیشہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگا رہا۔

وہ ایک رئیس اور شریف خاندان کا لڑکا تھا۔ اس کے والدین انتقال کر چکے تھے۔ مرشدے پور میں اس کی ایک شاندار حویلی تھی۔ جو اب کھنڈر ہو چکی ہے۔ اس کھنڈر نما حویلی میں اس کے بڑے بھائی مولانا عبدالمتین صدیقی رہتے تھے۔ اس کو تعلیم کا شوق تھا۔ گاؤں میں اس کا کوئی سرپرست نہیں تھا۔ اس کے تینوں بھائی اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے طور پر زندگی گذارنے کا عزم بالجزم لے کر لکھنؤ چلا آیا۔ وہ اپنے گاؤں بہت ہی کم جاتا تھا۔ وہ یونیورسٹی اور ٹیوشن کے اوقات میں باہر رہتا تھا۔ ورنہ مستقل دفتر میں رہتا تھا، شہر میں اس کی دلچسپیاں بالکل نہیں تھیں، جب اردو ٹیچروں کی تقرری ہو رہی تھی تو اس کو بھی ایک جگہ مل گئی۔ اب ٹیوشن اس نے چھوڑ دی۔ اس کے اخراجات کا بندوبست ہو گیا، وہ اپنی غربت کے باوجود وضعداری سے رہتا تھا۔ بڑا جامہ زیب تھا، دفتر کے سارے کاموں میں میرا دست و باز و تھا۔ سرکاری دفاتر ہیں، کونسل ہاؤس ہیں وزیروں کے بنگلوں پر ہر جگہ وہ میرے ساتھ رہتا تھا۔ اسمبلی ہاؤس میں بغیر پاس کے داخلہ دشوار تھا وہ کوٹ پینٹ ٹائی میں ملبوس میرے آگے آگے رہتا اور نہایت شان بے نیازی سے گیٹ پر کھڑے پولیس کے سپاہیوں سے دو قدم آگے بڑھ کر مجھ سے کہتا آپ میرے ساتھ آجائیے، وہیں آپ کا کام ہو جائے گا۔ پولیس والا سمجھتا کہ یہ کوئی اسمبلی کے آفس میں کلرک ہے۔ اس سے کوئی تعرض نہ کرتا اور میں اس کے ساتھ بلا گیٹ پاس کے اندر چلا جاتا اور اپنا کام کر کے ہم دونوں چلے آتے، جب سے دفتر کی تعمیر شروع ہوئی تو ہم لوگوں نے وزیر اعلیٰ سے دو ہزار بورے سیمنٹ منظور کرائی تھی۔ حمزہ ساتھ تھا۔ دو ہفتہ کے اندر ہم دونوں سپلائی آفس پہونچے تو آفس کلرک ایک لڑکی تھی۔ حمزہ نے اس سے کہا کہ ہمارے دفتر کیلئے دو ہزار بوریوں کا

آرڈر آیا یا نہیں۔اس نے جھوٹ موٹ رجسٹر الٹا پلٹا اور کہہ دیا کہ ابھی نہیں آیا۔دو تین دنوں کے بعد ہم دونوں پھر گئے اس نے پھر کہا کہ کوئی آرڈر نہیں آیا جب تیسری بار ہم دونوں گئے تو پوچھنے پر اس لڑکی نے یہی جواب دیا کہ ابھی آرڈر نہیں آیا۔حمزہ نے جھپٹ کر اس کا رجسٹر چھین لیا۔اور جلدی جلدی پلٹ کر دیکھا اتفاق سے ہمارے نام کا آرڈر مل گیا جو کئی دنوں پہلے آیا تھا وہ لڑکی برابر جھوٹ بول رہی تھی۔اس نے لیڈی کلرک کو اس بری طرح سے ڈانٹا کہ اس کا سارا نازنخرہ بھول گیا پھر اس نے جو چاہا اس سے لکھوایا۔ چپ چاپ وہ سب کرتی رہی جو حمزہ کہتا رہا، اور اسی دن ہم کو دو ہزار بوریوں کا پرمٹ بن گیا۔

اسی طرح اس نے کئی جرأتمندانہ کام کیے میں نے کہا کہ تم بہت آگے بڑھ جاتے ہو اس نے کہا کہ جب آپ ساتھ ہیں تو مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔آپ کہیں تو میں بڑے سے بڑے آفیسر سے الجھ سکتا ہوں اور اس نے کر کے دکھا دیا۔ ہمارے دفتر کی تعمیر خلاف قانون دکھا کر اسکو گرانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔اور حکم آگیا تھا کہ کام فوراً بند کر دیا جائے۔ایک رات خود ہی انجینئر آگیا۔جس نے دفتر کی عمارت کو گرانے کا فیصلہ کیا تھا۔اس وقت رات میں بھی مزدور کام کرتے تھے۔اس نے جب دیکھا کہ آرڈر کے باوجود کام ہو رہا ہے تو اس کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا۔اس نے سخت لفظوں میں مجھ سے بات کی تو حمزہ کو غصہ آگیا اس نے بات بیچ میں کاٹ کر کہا آپ لوگوں کی آنکھیں بند ہیں، وہ سامنے والا مکان اسی سال بنا ہے، کیا وہ خلاف قانون نہیں ہے، وہاں کیوں نہیں روکا گیا۔ جایئے پہلے اس کو منہدم کرایئے تب ہمارے یہاں تشریف لایئے گا۔اس نے ذرا ڈانٹ کر کہا کام بند کرا دیجئے حمزہ نے اسی کے لہجہ میں کہا کام بند نہیں ہوگا، آپ جو چاہیں کیجئے ہمارا جو جی چاہے گا کریں گے۔وہ اپنا

سامنہ لیکر چلا گیا۔اس طرح کے اس کے بہت سے کارنامے ہیں۔ وہ اپنی تعلیم سے کبھی غافل نہیں رہا۔اس نے یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرلیا تو اب مجھے اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ اس کیلئے میرے پاس کئی رشتے آئے، ہر رشتہ پر میں اس سے مشورہ کرتا تھا۔ ایک بار ایک خان صاحب جن کا نام فتح محمد خان تھا اور میرے پاس دفتر میں آتے رہتے تھے۔حمزہ صدیقی ان کی لڑکی کو پڑھاتا تھا۔اس لئے ان کے گھر سے واقف تھا۔لڑکی تو اس کی شاگرد ہی تھی۔خان صاحب نے اپنی اس لڑکی کے رشتہ کیلئے مجھ سے بات کی، جب میں نے حمزہ سے کہا کہ خان صاحب کی لڑکی کیسی ہے؟ اس نے کہا کہ خوبصورت ہے، تعلیم یافتہ ہے۔تب میں نے کہا کہ خان صاحب اس کا رشتہ لیکر آئے تھے تم کیا کہتے ہو؟ تو اس نے مجھ سے بتایا کہ خان صاحب نے جوانی کے زمانہ میں ایک طوائف سے شادی کرلی تھی۔لڑکی اسی کے بطن سے ہے۔اگرچہ لڑکی نکاح کے بعد پیدا ہوئی ہے اور ان کی جائز اولاد ہے۔لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ماں کے خون کا اثر اس میں ہے یا نہیں۔اس لئے اس رشتہ کو نامنظور کردیجئے۔ میں اس کی سمجھداری پر عش عش کرگیا، اس کے پاس کوئی سہارا نہیں۔لیکن اس کی خاندانی شرافت اب بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔میں نے خان صاحب کو لطائف الحیل سے ٹال دیا۔اور کہا کہ جب حمزہ کچہری میں پریکٹس کرنے لگیں گے اور اپنے گھر کا بندوبست کرلیں گے تب ان کے رشتہ کی بات کی جائے گی۔سردست اس پہلو پر سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

ایک لڑکی انٹر پاس تھی اور اردو ٹیچر تھی، ایک پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی وہ اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھتی تھی۔اس نے مجھ سے ایک دن شرماتے شرماتے حمزہ سے اپنے رشتہ کی بات کہی۔میں نے کہا حمزہ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔دوسرے دن جب میں حمزہ سے کہا اور اس رشتہ کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ اسیر صاحب اس کے والد اپنے

نام کے ساتھ خان لکھتے ہیں۔اورلڑکی اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھتی ہے۔اس لئے دال میں کچھ کالا ہے۔معلوم نہیں کیسا خاندان ہے؟لکھنؤ میں باہر سے آکر آباد ہو جانیو الے اکثر آپ کو سید، صدیقی، فاروقی وغیرہ بن جاتے ہیں جبکہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ایسے بہت سے لوگوں سے میں واقف ہوں، لکھنؤ میں جھوٹے شجرے والوں کی بڑی کثرت ہےاس لئے یہ رشتہ مناسب نہیں ہے۔

آخر میں راجہ بازار کے سید سلطان احمد آئے ان کا کلکتہ میں کاروبار تھا، اپنی لڑکی کا رشتہ لیکر دفتر میں میرے پاس آگئے۔انہوں نے مجھے بتایا کہ لڑکی سٹی گرلس کالج امین آباد میں پڑھتی ہے۔اس سال انٹر کا امتحان دے رہی ہے۔میں نے چائے پانی سے ضیافت کی اور کہا کہ میں اس رشتہ پر سوچوں گا اور دو چار دنوں کے بعد جواب دے سکوں گا۔پھر وہ چلے گئے۔جب حمزہ آئے تو میں سید سلطان احمد کے آنے کا ذکر کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ یہ رشتہ مجھے پسند ہے۔خاندان ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔البتہ لڑکی کیسی ہے ؟اس کا پتہ چلانا تمہارا کام ہے۔تم لڑکی کو دیکھ لو، سید صاحب نے جو علامت اور نشانیاں مجھے بتائی تھیں وہ میں حمزہ کو بتادیں۔اس نے دوسرے دن دیکھ کر لڑکی کو پسند کرلیا۔پھر میں نے راجہ بازار کے اپنے بعض ملاقاتیوں سے ان کے خاندان کی بھی تحقیق کر لی تھی۔چار دنوں کے بعد سید سلطان احمد جب دفتر آئے تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ رشتہ ہم کو منظور ہے۔انہوں نے تاریخ مقرر کر دی کہ چند آدمیوں کو لیکر غریب خانہ پر زحمت فرمائیں تاکہ منگنی کی رسم پوری ہو جائے، میں نے تیاری شروع کردی، حمزہ کے ایک بھائی محمد مبین صدیقی یہیں لکھنؤ میں شکتی بھون میں سروس کرتے تھے اور ہر اتوار کو میرے پاس دفتر میں آتے تھے۔دیر تک بیٹھے رہتے تھے، دلچسپ آدمی تھے میں نے حمزہ سے کہا کہ بھائی کو بلالو حمزہ کی ایک بہن سٹی اسٹیشن کے پاس

رہتی ہیں جا کر ان کو تاریخ بتا دو کہ ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ اور جو کچھ منگنی میں ضروری ہے ان سے پوچھ کر تیار کرالو۔ حمزہ نے اپنے گاؤں میں ایک آٹا چکی لگائی تھی جس سے تھوڑی بہت آمدنی ہوتی رہتی تھی۔ وہ اس نے بینک میں جمع کر رکھی تھی۔ جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو میں ان لوگوں کو لیکر راجہ بازار سید سلطان احمد کے گھر گیا انہوں نے بڑی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ کھانے کے بعد گفتگو چلی اور بات پکی ہوگئی، اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ اب مجھے بارات کی تیاری کرنی تھی۔ حمزہ کی بہن کے ذریعہ جوڑا تیار کرایا گیا۔ باراتیوں کا نظم میں نے کیا۔ میں نے حمزہ سے کہا کہ اپنے تینوں بھائیوں کو بلا لو، بڑے بھائی عبدالمتین صدیقی پرشدے پور میں رہتے تھے۔ ایک چھوٹا بھائی اونچاہار میں ڈاکٹری کرتا تھا۔ تیسرے بھائی محمد مبین صدیقی تو لکھنؤ ہی میں تھے۔ مقررہ تاریخ پر تینوں بھائی دفتر آ گئے میں نے شہر کے دوستوں اور ملاقاتیوں کو بارات میں شرکت کی دعوت دی۔ حمزہ دولہا بنے، میں سرپرست بن کر بارات لے گیا، نکاح ہوا۔ دعوت کام و دہن کے بعد دولہن کو رخصت کرا کے اپنے دفتر لایا۔ اس وقت نیا دفتر بن کر تیار ہو چکا تھا۔ اوپر کی منزل میں چار کمرے تھے۔ ایک کمرے میں دولہن کو اتار اگیا۔ میں نے ایک دوست کی بیوی اور اس کے رشتے دار کی دو بہنیں جو کالج میں پڑھتی تھیں دفتر میں پہلے ہی بلا لیا تھا کہ وہ دولہن کا استقبال کریں، وہ گھر والیاں بن گئیں، انہوں نے دولہن کو اتار اور مجھ سے منہ دکھائی کا مطالبہ کیا۔ ہنسی قہقہوں سے اوپر کی منزل زعفران زار ہوگئی، لڑکی میری بہو بن گئی۔ اس کا پیار کا نام رانی رکھا گیا، وہ آج تک اسی نام سے پکاری جاتی ہے۔ میرے دفتر میں ولیمہ ہوا۔ میزبان میں تھا حمزہ کے بھائی صرف مہمان تھے۔ اسی حیثیت سے شریک بھی ہوئے تھے۔ آج حمزہ ایک کامیاب وکیل ہیں، کئی بچوں کے باپ ہیں، ایک مکان کے مالک ہیں جس میں

ٹیلیفون لگا ہوا ہے اسکوٹر سے کچہری آتے جاتے ہیں۔

اظہار احمد........................

حمزہ صدیقی ایک دن اپنے ایک دوست کو لیکر آئے اور تعارف کرایا کہ یہ اظہار احمد ہیں۔ سیتا پور کے رہنے والے ہیں۔ یہاں ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر ہیں، ہندی کے اچھے رائٹر ہیں۔ کچھ دیر وہ نوجوان بیٹھا پھر چلا گیا۔ کبھی کبھی دفتر میں مجھ سے ملنے آجاتا۔ پھر بہ کثرت آنے لگا اور پھر تو وہ میرا دست و بازو بن گیا بڑا ذہین، بڑا تیز طرار، حکومت کے محکموں اور دفتروں اور قوانین وضوابط سے خوب واقف، اخبار بہت پڑھتا تھا۔ ہندی میں کچھ لکھتا بھی تھا۔ وہ جنگجو قسم کا سیاسی ورکر تھا۔ کمیونسٹوں سے اس کے روابط زیادہ تھے۔ مجھ سے ملنے کے بعد اس کے یہ روابط کمزور ہو گئے، میں نے اس کو نشیب وفراز سمجھایا، اپنا سیاسی تجربہ بتایا کہ یہ تباہی و بربادی کا راستہ ہے۔ پھر اس نے کمیونسٹوں سے ناطہ توڑ دیا۔ میں اس کا سیاسی استاد بن گیا۔ منسٹروں اور وزارت کے دفتروں سے کیسے کام لیا جاتا ہے وہ اس کا ماہر تھا۔ مجھے اپنے دفتری کام کیلئے ایک نوجوان کی ضرورت تھی۔ بعد میں وہ میرا بڑا مخلص ثابت دوست ہوا، وہ ہندی کا تو اچھا انشاء پرداز تھا لیکن اردو لکھنا نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس کو اپنا شاگرد بنالیا اور اردو انشا پردازی سکھانے لگا چار چھ مہینوں کی مشق کے بعد جو پہلا مضمون اردو میں لکھا تو وہ اس معیار کا تھا کہ لکھنؤ کے مشہور اخبار قومی آواز کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا۔ مطالعہ اس کا بہت اچھا تھا۔ بعد میں اس نے خود رسالے اور اپنے اخبارات نکالے، اردو کا اچھا رائٹر بن گیا اور اچھا خاصا ایڈیٹر ہو گیا۔ ہندوستان کے مشاہیر ادیبوں اور اہل قلم سے اس کے گہرے روابط ہو گئے، آج کے دن ایک پریس کا مالک ہے۔ اردو کے دو رسالے نکالتا ہے۔ جن میں ملک کے مشہور اہل قلم لکھتے ہیں، بڑے سے بڑے آدمی

سے ملنے میں اس کو ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی تھی اتنا نڈر تھا۔ بعد میں وہ میرے لکھنوی خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ بیوی کو لیکر آجاتا اور کئی کئی دن میرے پاس رہتا تھا وہ پردے کا قائل نہیں تھا اس لئے اس کی بیوی میرے سامنے ہوتی تھی۔ اپنے حلقہ احباب میں اس کے شامل ہونے سے مجھے خوشی ہوئی۔

اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن........................

میرے قیام لکھنو کے دوسرے سال اتر پردیش کے گورنر اکبر علی خاں کی طرف سے صوبہ میں پانچ ہزار اردو ٹیچروں کی تقرری کا آرڈنینس جاری ہوا کہ ان اردو ٹیچروں کو پرائمری اسکول میں صرف اردو پڑھانے کیلئے رکھا جائے گا۔ ان کی باضابطہ تقرری ہوگی۔ مگر یہ تقرری بہرحال عارضی تھی۔ کیونکہ گورنر کا آرڈنینس عبوری دور کے لئے اور عارضی ہوتا ہے۔ اور حکومت کی باضابطہ تشکیل کے بعد از خود ختم ہوجاتا ہے۔ اس حکم نامہ پر عمل ہوا۔ ٹیچروں کی تقرری ہوگئی مگر زیادہ تر اسکولوں میں متعصب ہندو ہیڈ ماسٹروں نے ان اردو ٹیچروں کو اردو کلاس دینے کے بجائے دوسرے مضامین پڑھانے کیلئے دیئے۔ اور بہت سی جگہوں پر تقرری نہیں کی گئی۔ جگہ خالی رکھی گئی۔ اس کے علاوہ یہ افواہ عام تھی کہ الیکشن کے بعد آرڈنینس کی مدت پوری ہوجائے گی اور اردو ٹیچروں کی آسامیاں بھی یک لخت ختم ہوجائیں گی اور وہ بے روزگار ہوجائیں گے۔

اظہار احمد ایک دن اسی مسئلہ کو لیکر آئے اور انہوں نے تجویز رکھی کہ اردو ٹیچروں کی ایک تنظیم قائم کرکے ان ٹیچروں کی مستقلی کی تحریک چلائی جائے ،۔ تجویز مناسب تھی ، کیونکہ تمام ٹیچرس مسلمان تھے اور اردو زبان کے تحفظ سے بھی یہ مسئلہ جڑا ہوا تھا میں جس دفتر کا ذمہ دار تھا اس کے فرائض میں اردو کا تحفظ شامل تھا۔ میں نے اظہار احمد کی تائید کردی۔ انہوں نے کہا کہ آپ اس کے مستقل سرپرست بن جائیں

اور تنظیم کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میں کام کروں۔آپ کے جتنے اضلاع سے روابط ہیں ان کو سرکلر بھیج دیں کہ وہ اردو ٹیچروں کی فہرست صوبائی دفتر کو بھیج دیں، میں نے یہ سب باتیں منظور کرلیں۔ میں نے ایک سرکلر سائیکلوسٹائل کرایا اور تقریباً چالیس ضلعوں میں جہاں جمعیۃ کے کارکن تھے ان کو بھیج دیئے۔اور قومی آواز میں اعلان کردیا کہ اردو ٹیچروں کے مسائل حل کرنے کیلئے اتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کردی گئی۔ تمام اردو ٹیچروں کو اس تنظیم سے جلد از جلد رابطہ کرنا چاہئے اور اس کا ممبر بن جانا چاہئے۔ پھر میں نے ۳۱۔۳۵ ضلعوں کو ذاتی خطوط لکھ کر ان کو مطلع کیا کہ اردو ٹیچروں میں بیداری پیدا کریں۔ اور ان کے مسائل حل کرنے میں تعاون کریں۔ اس سرکلر اور خطوط سے پورے صوبے میں ایک نئی سرگرمی پیدا ہوگئی اور ہر طرف سے تائید کے خطوط آنے لگے۔

اظہار احمد جنرل سکریٹری بن گئے، میں نے کہا اردو ٹیچرس کا ایک نمائندہ اجلاس بلا کر ان کو صورت حال سے آگاہ کرنا اور ان میں اپنے حق کے واسطے لڑنے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ تبھی اس تنظیم میں جان آئے گی۔ اور یہ اجلاس لکھنؤ میں ہونا چاہئے۔ جو خطوط تائید میں آئے تھے ان کے پتے پر اظہار احمد نے تنظیم کے لیٹر پیڈ پر خطوط لکھے، میں نے اپنے روابط سے کام لیا، اخبار میں ہر دوسرے تیسرے دن مختلف نوعیّتوں سے اعلان کیا جاتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ مقررہ پر میرٹھ، غازی آباد سے لیکر بنارس، بلیا غازیپور تک کے نمائندے آئے۔ اردو ٹیچرس ہر چہار سمتوں سے اتنی تعداد میں آئے کہ پورے صوبے کی نمائندگی ہوگئی۔ اس میں سب نوجوان لڑکے تھے۔ جو جوش و جذبے سے بھرے ہوئے تھے۔ کوئی سن رسیدہ نہیں تھا، ممتاز اسکول میں یہ اجلاس رکھا گیا اور سارے نمائندوں کا قیام میں نے اپنے دفتر میں رکھا۔

سب نمائندے تعلیم یافتہ ،نو جون ، پر جوش اور جذبات سے لبریز دل لے کر آئے تھے جلسہ میری صدارت میں ہوا میں نے افتتاحی تقریر کی اور نو جوانوں کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دلایا اور بتایا کہ اگر آپ نے اس تنظیم کو متحرک اور فعال رکھا اور تنظیم سے اپنا رابطہ بنائے رکھا اور اسکی آواز پر لبیک کہتے رہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کا مسئلہ حل ہو کر رہے گا اور کوئی طاقت آپ کے حق کو غصب نہیں کر سکتی ۔ اگر آپ فولادی عزم وارادہ کے ساتھ میدان عمل میں جمے رہے تو ایک دن حکومت کو آپ کے پاؤں پر گرنا ہوگا، جھکنا ہوگا۔

اظہار احمد نے اپنی تقریر میں ٹیچروں کی تقرری کے ثانوی پہلوؤں کو واضح کیا اور بتایا کہ اگر ہم خاموش رہے اور بھر پور جد وجہد کا آغاز نہیں کیا تو نئی حکومت کے بنتے ہی ساری آسامیاں یک قلم ختم کردی جائیں گی ۔ ہم اور آپ پھر بے روزگار ہو جائیں گے ۔ کیونکہ یہ تقرریاں گورنر کے آرڈر کے ذریعہ ہوئی ہیں ۔ یہ ہمیشہ عارضی اور ایک خاص مدت کیلئے ہی ہوتا ہے۔اس لئے آپ کے سروں پر قانون کی تلوار لٹکتی رہے گی ۔ اگر آپ اس تلوار کے وار سے بچنا چاہتے ہیں تو اتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کو مضبوط کیجئے ۔ اس کے باضابطہ ممبر بن جائیے اس کی آواز پر اپنے اپنے علاقہ میں پوری پامردی سے عمل کیجئے ۔ ہم آپ کی مدد کریں گے ۔ ہم یہاں لکھنؤ میں آپ کی لڑائی لڑتے رہیں گے ۔ اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک آپ کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا ہے۔

بیگم حامدہ حبیب اللہ سابق وزیر حکومت اتر پردیش حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے جلسہ میں شریک ہوئیں ، اجلاس نے جب تقرریوں کو مستقل کرنے کا رزولیس پیش کیا تو بیگم صاحبہ نے اجلاس میں ایک مختصر تقریر کی اور اجلاس کو یقین دلایا

کہ ان آسامیوں کو مستقل کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا مطالبہ پورا کیا جائے گا۔

اس طرح یہ اجلاس بڑے جوش وخروش کی فضا میں ختم ہوا۔ ٹیچروں میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی۔ دوسرے دن اظہار احمد کی سرکردگی میں اردو ٹیچروں کا ایک وفد گورنر سے ملنے گیا اور ان سے ملاقات کرکے ان کی خدمت میں اپنا رزولیشن پیش کیا گورنر اکبر علی خاں نے مطالبہ پر بیداری سے غور کرنے کا وعدہ کیا۔

اس اجلاس کے بعد اردو ٹیچروں کی تنظیم پورے اتر پردیش میں روشناس ہوگئی، ہر طرف جوش وخروش کی فضا پیدا ہوئی، اردو اخبارات نے ایسوسی ایشن کی خبروں کو شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور اس مسئلہ پر نوٹ لکھے۔ پھر اس تنظیم کے متعدد اجلاس لکھنؤ میں بلائے گئے۔ تین سال مسلسل یہ جدوجہد جاری رہی، اسی دوران الیکشن ہوا، نئی حکومت بنی، نرائن دت تیواری وزیراعلیٰ اتر پردیش ہوئے، ان کے دور حکومت میں اس تنظیم نے اردو ٹیچروں کی آسامی مستقل کرانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ پانچ ہزار اردو ٹیچروں کی ملازمت مستقل ہوگئی۔ پھر اس تنظیم میں پھوٹ پڑگئی۔ دو کینہ پرداز شیعہ ٹیچرس نے فضا کو خراب کیا، دونوں نے جنرل سکریٹری بننے کیلئے جوڑ توڑ شروع کردیا۔ تب میں نے اپنی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور اظہار جنرل سکریٹری سے مستعفی ہوکر تنظیم سے علیحدہ ہوگئے۔ پھر اس کے بعد یہ تنظیم مرگئی اب اس کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا۔

اسٹیٹ اردو تعلیمی کونسل........................

ایک دن اظہار احمد نے آکر تجویز پیش کی کہ اردو کے مسئلہ پر ایک سیمینار بلایا جائے، میں نے کہا اس کے اخراجات بہت ہیں۔ ہم لوگوں کے پاس وسائل نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ یونیورسٹیوں سے مقالہ نگاروں کو مقالہ لکھنے پر آمادہ کرنا پھران کو شرکت کا پابند بنانا بھی ایک مسئلہ ہے، شاید ہم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

اظہار احمد نے کہا آپ صرف منظور کرلیں بقیہ سارے کام میں کروں گا، آپ کا کام صرف اتنا ہوگا کہ آپ یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو کے اساتذہ کو اپنے دستخط سے خطوط لکھ دیں۔ آپ داعی بن جائیں، میں نے جب منظور کرلیا تو اب اس نے خاکہ پیش کیا، ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے اور اس کا نام ''اسٹیٹ اردو تعلیمی کونسل'' رکھا جائے۔ دعوت نامہ اس تنظیم کی کی طرف سے جاری کئے جائیں، آپ اس تنظیم کے مستقل سر پرست رہیں، جب میں نے یہ سب باتیں مان لیں تو اظہار احمد، حمزہ صدیقی اور راقم الحروف صرف تین نفر نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک صوبائی تنظیم قائم کرلی۔ فوراً بلاک بنوایا گیا۔ لیٹر پیڈ چھپوایا گیا۔ اور ایک تاریخ مقرر کرکے دعوتنامے میں نے لکھ دیئے۔ دعوت نامہ پر میرا نام تھا، اظہار احمد ان دعوت ناموں کو لیکر بنارس، الہ آباد، علی گڈھ، دہلی کی یونیورسٹیوں کا دورہ کیا، بالمشافہہ سب سے مل کر ان کو دعوت نامہ دیا اور زبانی شرکت کا وعدہ لیا۔ اس کے بعد سفر سے لوٹ کر آئے تو بتایا کہ زیادہ تر مقالہ نگاروں نے شرکت کا پختہ وعدہ کرلیا ہے۔ بنارس سے حکم چند نیر، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالحق، ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، الہ آباد یونیورسٹی سے فاطمہ بیگم، راجستھان یونیورسٹی سے ڈاکٹر فضل امام، جے پور یونیورسٹی سے پروفیسر محمد علی، کشمیر یونیورسٹی سے عابد پشاوری، ، چندی گڑھ سے رام چندر، بھوپال سے اوصاف احمد وغیرہ نے سمینار میں شرکت کی منظوری دی۔

ایک دن اظہار احمد نے دفتر آکر کہا کہ چیف منسٹر سے ملنے کا ٹائم لے لیجئے۔ ان سے آج ہم اور آپ ملیں گے۔ میں نے پوچھا کام کیا ہے۔ بتایا کہ کچھ مالی امداد

لینی ہے، میں نے فون کر کے ٹائم لے لیا۔ہم دونوں وقت مقررہ پر پہونچے اس نے راستہ میں بتایا کہ چیف منسٹر کے فنڈ میں بہت سی رقم رہتی ہے ۔ وہ جس کو چاہیں جتنا چاہیں اپنی صوابدید سے دے سکتے ہیں ۔ان پر کوئی قانونی پابندی نہیں ۔اسی طرح ہر وزیر کا فنڈ ہوتا ہے۔لیکن وہ بہت محدود ہوتا ہے،اس فنڈ کی حیثیت جیب خرچ کی ہے۔

ہم لوگ چیف منسٹر ہاؤس پہونچ گئے ۔اس وقت اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا تھے جو مسلمانوں سے بہت قریب سمجھے جاتے تھے۔ بڑے شریف اور وضعدار انسان تھے۔ہم نے ان سے مل کر بتایا کہ ہندوستان کے مشاہیر دانشوروں کو سمینار میں فلاں تاریخ کو مدعو کیا ہے ۔مگر فنڈ میں بڑی کمی ہے ان کے شایان شان میز بانی نہیں ہوسکتی ۔اگر جناب والا اپنے فنڈ سے کچھ عنایت فرمادیں تو بڑا کرم ہوگا، انہوں نے بلا تامل پندرہ سو روپئے دینے کا سکریٹری کو حکم دیدیا۔ دوسری بات اظہار احمد نے کہی جو اس نے مجھے نہیں بتائی تھی ۔انہوں نے کہا کہ سمینار میں بہت بڑی شخصیتیں آرہی ہیں اگر ان کے قیام و طعام کا گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں اجازت دیدیجائے تو مزید کرم ہوگا۔ وہ ہنس پڑے اور ہنستے ہوئے کہا تم بہت چالاک معلوم ہوتے ہو۔سمینار تم کرو اور سارا خرچ ہم برداشت کریں ۔اچھا جاؤ قیام کا بندوبست ہوجائے گا ،مگر کھانے کا پیمنٹ کرنا ہوگا ، ہم لوگوں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چلے آئے۔ بڑا بوجھ ہلکا ہوگیا۔اسی طرح دو تین وزیروں سے اور بھی کچھ رقمیں مل گئیں ۔ سارے مہمان گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں نہایت شان سے رہے۔ میں،اظہار احمد اور حمزہ بھی گیسٹ ہاؤس ہی میں منتقل ہوگئے چائے ناشتہ اور کھانا وہیں ہوتا تھا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے پاس دو ہال ہیں ایک بڑا اور ایک چھوٹا ، پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے ذریعہ چھوٹا ہال مفت مل گیا۔ پروفیسر

صاحب سے میرے روابط پہلے سے تھے۔ ہم لوگ جب ان کے ڈپارٹمنٹ گئے انہوں نے چائے سے خاطر مدارات کی۔ وہیں ملک زادہ منظور احمد اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی سے بھی بے تکلفی ہوگئی۔ وہ تمام مقالہ نگار سمینار میں شریک ہوئے جن کا ذکر کیا گیا۔ مقالے پڑھے، مباحثے ہوئے، سمینار دن میں تھا۔ شام کے چار بجے ہندی بھون میں کھلا ہوا اجلاس ہوا۔ اس کے چیف گیسٹ وزیر اعلیٰ اتر پردیش مسٹر بہوگنا تھے۔ ہندی بھون کا ہال بہت بڑا ہے۔ جو حضرت گنج میں ہے۔ اظہار احمد نے اپنے تعلقات کی بنا پر ہندی بھون والوں سے مل کر مفت حاصل کرلیا تھا، اجلاس کو خطاب کرنے کیلئے وزیر اعلیٰ آئے۔ بڑی شاندار تقریر کی۔ خوب تالیاں بجیں۔ فوٹو لئے گئے۔ اس طرح ہمارا سمینار بڑی شان سے اختتام پذیر ہوا؛ البتہ گیسٹ ہاؤس کے کھانے کا بل ڈیڑھ ہزار روپیہ کا تھا۔ یہ کہاں سے ادا ہو؟ پریشانی ہوئی، اظہار احمد نے بتایا کہ اردو اکیڈمی میں بھی اتفاقی امداد کیلئے ایک فنڈ ہوتا ہے۔ اس سے بھی کچھ رقم مل سکتی ہے۔ اگر آپ بیگم حامدہ حبیب اللہ کو راضی کرلیں، وہی اس وقت اکیڈمی کی چیئر مین تھیں۔ ہم دونوں حضرت گنج پہونچے اور ان کی کوٹھی پر ان سے ملاقات کی اور صورت حال بتائی اور کہا کہ کم از کم ایک ہزار روپئے آپ دلا دیں تو عنایت ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ آپ ایک درخواست لکھ کر مجھے دیدیں۔ کل آپ کو روپئے مل جائیں گے۔۔ اس طرح ایک ہزار کا انتظام ہوگیا۔ بقیہ رقم کیلئے پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کے پاس یونیورسٹی گئے اور ان سے کہا تو انہوں نے اپنے پاس بیٹھے رہے لوگوں سے کہا کہ اسیر صاحب کا بار ہلکا ہونا چاہئے۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر احمر لاری گورکھپور یونیورسٹی سے آئے ہوئے تھے اور وہیں بیٹھے ہوئے ان سے بھی کہا اور ان سے میرا تعارف کرایا، ہم دونوں قریب الوطن نکلے میری ان سے باتیں ہوئیں وہ متاثر ہوئے،

انہوں نے کچھ دینے کا وعدہ کرلیا۔ گورکھپور جا کر تیسرے دن دوسوروپئے پروفیسر شبیہ الحسن صاحب کے پاس بھیج دیئے ۔ کہ اسیر صاحب کو بلا کر انہیں کے ہاتھ میں دیا جائے۔ اس طرح گیسٹ ہاؤس کا قرض ادا کیا گیا جو کمی تھی اس کی چھوٹ کرائی گئی،

اس سیمینار کی وجہ سے بہت سے لوگوں سے تعارف ہوا۔ عابد پشاوری بہت دلچسپ آدمی نکلے اور بڑے باغ و بہار ثابت ہوئے ۔ ڈاکٹر فضل امام راجستھان یونیورسٹی میں تھے۔ سیمینار سے ایک مہینہ پہلے وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ملک زادہ منظور احمد کے پاس بیٹھے پڑے تھے۔ ملک زادہ نے مجھ سے کہا کہ ان کو بھی سیمینار میں مدعو کر لیجئے، بڑے کام کے ہیں۔ چنانچہ وہیں ان کو دعوت نامہ دیدیا گیا۔ وہ میرے ہم وطن نکلے۔ اس لئے ان سے بے تکلفی زیادہ ہوگئی ۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ایک کتاب ''بھوجپوری ادب'' کے نام سے لکھی تھی، اس کا ایک نسخہ مجھے دیا۔ کتاب مختصر سی تھی مگر محنت سے لکھی گئی تھی، انہوں نے کتاب پر اظہار خیال کیلئے کہا میں نے وعدہ کرلیا، بعد میں آٹھ دس صفحات پر تبصرہ لکھ کر بھیج دیا، میں نے جو کمیاں نظر آئیں ان کی نشاندہی کی۔ میں بھوجپوری ادب سے تھوڑا بہت پہلے سے واقف تھا اس کی حیثیت لوک گیتوں کی ہے۔ یہ گیت بڑے موثر اور جذباتی ہوتے ہیں اس کی شاعری عورت کی زبان سے ہوتی ہے ۔ اور مرد کو محبوب کا درجہ حاصل ہے ۔ ان گیتوں میں نسوانی جذبات کا والہانہ، انتہائی دلگداز اور فطری اظہار ہوتی ہے کہ مرد تو کم لیکن صنف نازک زیادہ متاثر ہوتی ہیں ۔ یہ گیت عورتوں کو پاگل بنا دیتے ہیں ۔ اپنی معلومات کی روشنی میں ایک زوددار تحریر لکھ کر ڈاکٹر فضل امام کو ان کے پتہ پر روانہ کر دیا تھا معلوم نہیں ان کو ملی یا نہیں کیوں کہ ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ اور نہ دوبارہ پھر ان سے ملاقات ہوئی ۔ البتہ دہلی کے پروفیسر قمر رئیس سے دہلی اور لکھنؤ میں اس کے بعد کئی ملاقاتیں رہیں ۔ بے

ڈیل ڈول کا بدن ،لباس بھی یوں ہی سا مگر ذہن بڑا سلجھا ہوا، اچھے نقاد ہیں ۔ پریم چند پران کا اچھا کام ہے۔

دوسرا سمینار........................

دوسرے سال پھر ایک سمینار کیا گیا اس کا کنوینر مسٹر نظیر احمد ایم ایل اے کو بنایا گیا انہوں نے شرط لگائی کہ ملک زادہ منظور احمد سے استقبالیہ لکھوادیا جائے جو میں سمینار میں پڑھوں تب میں کنوینر ہونا منظور کروں گا۔ ملک زادہ سے میرا اچھا خاصا تعارف تھا۔ ایک دن نخاس ان کے مکان پر پہونچ گئے اور مقصد ظاہر کیا تو انہوں نے کہا کہ ابھی لکھ لیجئے۔ انہوں نے چائے منگائی کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر اپنے نئے عشق کی داستان سناتے رہے۔ پھر خطبہ استقبالیہ املا کرادیا اور وہ نظیر احمد ایم ایل اے کو دیدیا گیا۔ اب ہمیں مالیات کی فکر ہوئی ،ایک دن اظہار احمد آئے اور بتایا کہ لائٹ کمپنی الہ آباد والے شیروانی صاحب لکھنؤ آئے ہوئے ہیں اور اودھ کلارک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چلئے ان سے ملا جائے۔ ممکن ہے کہ رقم مل جائے۔ ہم لوگ ہوٹل پہونچے یہ فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ ریشپسنسٹ لڑکی سے ان کے کمرہ کا نمبر معلوم کیا اور چل پڑے۔ ہوٹل میں خودکار لفٹ لگی ہوتی ہے۔ ہم نے گھس کر ایک بٹن دبادیا وہ چوتھی منزل پر قیام پذیر تھے۔ لیکن ہم نے جو بٹن دبایا وہ کمبخت تیسری منزل کا تھا۔ لفٹ وہاں جاکر رک گئی ہم باہر نکلے اور پھر زینہ سے چوتھی منزل پر پہونچے وہاں باوردی چوکیدار کھڑا تھا۔ اظہار احمد افسرانہ انداز میں اس سے کہا فلاں نمبر کا کمرہ کدھر ہے ۔ اس نے انگلیوں سے اشارہ کرکے بتایا کہ وہ تیسرا کمرہ ہے ہم لوگ وہاں پہونچے تو دروازہ لاک تھا۔ شیروانی صاحب موجود نہیں تھے ۔ وہ ہوٹل سے باہر گئے ہوئے تھے ۔ ہم ناکام واپس لوٹے ۔ وہیں سے ہم سیدھے حضرت گنج بیگم حامدہ

حبیب اللہ کی کوٹھی پر پہونچے، وہ گرمیاں گزارنے کشمیر گئی ہوئی تھیں۔ دو تین دن قبل وہ لکھنؤ واپس آئی تھیں۔ ہم لوگ ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اطلاع کرائی گئی تھوڑی دیر بعد وہ آئیں۔ ہم نے کھڑے ہوکر تعظیم دی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ میرے ذہن میں یک بیک بجلی چمکی، بیگم صاحبہ باتھ روم سے نکل کر تروتازہ اور شاداب ہوکر آئی تھیں، چہرے پر تازگی تھی اور نکھار بھی، میں نے کہا کشمیر میں چار مہینے گذارنے کا آپ کی صحت پر بہت اچھا اثر نظر آرہا ہے۔ پھر ذرا رک کر میں نے کہا اس وقت آپ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی نظر آرہی ہیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ عورت کی نفسیات یہ ہے کہ اس کی عمر کا تخمینہ کم سے کم کر دو تو اسکا دل جیت لوگے۔ میں نے یہی نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔ انہوں نے فوراً بیرے کو آرڈر دیا کہ آپ لوگوں کو چائے پلاؤ اور کہا کہ آپ لوگ چائے پیجئے میں تھوڑی دیر میں آرہی ہوں۔ ہم لوگ چائے پینے لگے، ہم لوگوں کے ذہن میں تھا کہ بیگم صاحبہ کو شیروانی صاحب کیلئے ذریعہ بنایا جائے۔ کچھ دیر بعد وہ سج دھج کر آئیں یہ بال تو ان کے سن سفید ہو چکے تھے۔ لیکن وہ خوب سیاہ بالوں کی وِگ استعمال کرتی تھیں۔ اور بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ بال نقلی ہیں، صحت چونکہ اچھی ہے۔ اس لئے ان کی عمر کے اندازے میں اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔

ہم نے کہا کہ ہم لوگ سیمینار کر رہے ہیں۔ مالیات کے سلسلے میں تھوڑی زحمت پیش آرہی ہے۔ الہ آباد سے شیروانی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اور اودھ کلارک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے آپ ہمارے لئے دو کلمہ خیر کہہ دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں کہوں گی اور ضرور کہوں گی۔ تھوڑی دیر بعد میرے یہاں وہ چائے پئیں گے، اس وقت آپ لوگ آجایئے۔ میں ان سے کہہ دوں گی۔

ہم لوگ وہاں سے چلے آئے اور حضرت گنج کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگے۔شیروانی صاحب نو بجے کار سے آئے اور کوٹھی کے احاطہ میں ان کی کار داخل ہوئی اس کے آدھے گھنٹہ کے بعد ہم لوگ پہونچ گئے، ہم نے بیگم صاحبہ کو مخاطب کر کے اپنا مدعا کہا، بیگم صاحبہ نے شیروانی صاحب سے کہا۔ بھئی یہ بڑے کام کے لوگ ہیں۔ان کی کچھ مدد کر دیجئے۔انہوں نے کہا کہ جس فنڈ سے یہ رقم دی جاتی ہے وہ اس وقت خالی ہے۔میں اپنی جیب سے ایک ہزار دے سکتا ہوں۔بیگم صاحبہ نے کہا جو ہو جائے اچھا ہے۔ ہمارا کام بن گیا۔ہم سلام اور شکریہ ادا کر کے واپس ہو گئے۔اب کی بار مہمانوں کو امین آباد کے بمبئی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔مقالہ نگار اکثر وہی تھے جو پہلی بار آئے تھے۔سمینار کارپوریشن کے ایک ہال میں ہوا۔

دفتر کی تعمیر نو.........................

کچہری روڈ کی جو عمارت خریدی گئی تھی۔وہ دو منزلہ تھی۔مگر بیڈھنگی عمارت تھی۔ میں دہلی گیا ہوا تھا۔ایک دن مولانا مدنی نے فرمایا کہ اس کا نقشہ بنوا کر منظور کرا لیجئے۔اس کی از سر نو تعمیر ہوگی۔صوبے کے ایک سکریٹری خواجہ رائق ایڈوکیٹ بھی تھے۔انہوں نے ایک شیعہ نقشہ نویس کو کام دیا۔اس نے سال بھر خوب تنگ کیا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے نقشہ کی کاپیاں دیں، ریپیرنگ کا نقشہ تھا، اسی کی درخواست داخل کی گئی۔اور منظور ہوئی۔مولانا مدنی نے میرٹھ سے حاجی عبدالعزیز کو لکھنؤ بھیجا کہ وہاں ٹھیکداروں سے باتیں کر کے کام شروع کروادیں۔حاجی عبدالعزیز میرٹھ کے ایک مالدار اور زمانہ ساز آدمی تھے۔اخلاق میں کچھ اچھے نہیں تھے۔کٹر لیگی رہے۔جب پاکستان بن گیا اور ان کی جائیداد کسٹوڈین میں آگئی تو وہ فوراً دیوبند گئے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہو گئے، پھر چار سو بیس کر کے جائیداد بچالی۔جمعیۃ علماء کی تو

مالی امداد کم کرتے تھے البتہ حضرت مدنی کی ذاتی خدمت بہت کرتے تھے ۔ اور حاضری بہت دیتے تھے ۔ بہت جوڑ توڑ کے آدمی تھے ۔ میں ان کو ہمیشہ شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور محتاط رہتا تھا ۔

جب دفتر کی تعمیر شروع ہوئی تو مہینہ میں ایک ہفتہ وہ لکھنؤ میں رہتے اور تعمیر کی نگرانی کرتے اور پھر تین ہفتے میں سارے معاملات کو نمٹاتا تھا ۔ تعمیر جاری تھی ۔ دوسری منزل کی چھت لگ گئی تھی کہ حلقہ کے انسپکٹر نے کارپوریشن میں رپورٹ کر دی کہ عمارت خلاف قانون بن رہی ہے ۔ مقدمہ شہری مکانات کے انجینئر کے پاس تھا ۔ تصفیہ کی تاریخ آ گئی ۔ انجینئر مسلمان تھا ، میرٹھ کا رہنے والا ، عبدالرشید نام تھا ۔ اس نے فیصلہ کر دیا کہ نقشہ مرمت کیلئے داخل کیا گیا تھا اور بنیاد کھود کر عمارت از سر نو تعمیر کی گئی ہے ، اس لئے تعمیر ناجائز ہے ۔ اس نے فیصلہ میں لکھ دیا کہ عمارت چار فٹ پیچھے کھسکالی جائے ورنہ بذریعہ پولیس ڈھا دی جائے گی ، میں پریشان ہو گیا ، میرے اردگرد کوئی متنفس ایسا ہمدرد اور مخلص نہیں تھا جو جمعیۃ سے وابستہ ہو یا عہدیدار ہو ۔ جس سے میں مشورہ کروں ۔ لکھنؤ میں صوبہ کا ایک سکریٹری ، خزانچی اور مولانا اسعد مدنی کی لکھنؤ تشریف آوری کے موقعہ پر آگے پیچھے رہنے والے کئی آدمی تھے ۔ مگر کبھی کسی شخص نے میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا ۔ میں نے گھبرا کر مولوی جلیل صدر جمعیۃ علماء اتر پردیش اور صوبے کے جنرل سکریٹری وفاء الرحمٰن جامعی کو ٹیلیفون کر کے صورت حال بتائی ، دہلی دفتر کو تفصیلی حالات بتا دیئے اور کہا کہ صدر اور سکریٹری کو فوراً لکھنؤ بھیج دیا جائے تا کہ وہ آ کر مسئلہ کو حل کریں ورنہ عمارت منہدم کر دی جائے گی ۔ ان دنوں شہر میں دھڑا دھڑ عمارتیں گرائی جا رہی تھیں ۔ ایک ٹرک پر پچاسوں مزدور کدال پھاوڑے اور گینتی لئے ہوئے اور آگے آگے ایک ٹرک پر پولیس اور کارپوریشن کا عملہ ہوتا تھا ۔

جن عمارتوں کے بارے میں فیصلہ ہو چکا تھا وہاں پہونچتے ہی کسی سے کوئی سوال نہیں کرتے۔ٹرک سے مزدور اترتے اور توڑ پھوڑ شروع کر دیتے۔درجنوں لکڑی کی بڑی بڑی گومتیاں جو ہمارے روڈ پر تھیں۔ان کو اٹھوا کر دور پھنکوا دیا گیا۔اس لئے میری تشویش حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔فیصلہ کے دن کارپوریشن میں میں تنہا تھا۔کبھی کسی نے اس مقدمہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔فیصلہ کے بعد اس نے مجھ سے فیصلہ پر دستخط کرایا کہ تعمیر فوراً روک دی جائے۔میں نے دستخط بھی کر دیئے۔

عمارت تو مکمل ہو چکی تھی۔اندر پلاسٹر کا کام ہو رہا تھا۔کسی نے انجینئر کو اطلاع کر دی کہ تعمیر کا کام اب بھی جاری ہے۔میں شب و روز کام لگائے ہوئے تھا۔ایک روز مغرب بعد انجینئر خود آ گیا جس نے فیصلہ کیا تھا۔دیکھا کہ مزدور لگے ہوئے ہیں،کام جاری ہے۔میں کمرے سے نکلا میرے ساتھ حمزہ بھی تھے۔اس نے کہا کہ آپ نے دستخط کیا ہے کہ کام بند کر دیا جائے گا۔یہ خلاف قانون کام کیوں ہو رہا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ بات سچ تھی،سارا پہلو کمزور تھا،فوراً حمزہ بول پڑے آپ کو ہماری بلڈنگ تو خلاف قانون نظر آ رہی ہے آپ کی آنکھ کے سامنے جو بلڈنگ کھڑی ہے اس کی تعمیر آپ نے کیسے جائز مان لی اگر وہ جائز ہے تو یہ بھی جائز تعمیر ہے۔بات بڑی تلخ تھی۔اور بڑے گرم لب و لہجہ میں تھی۔لیکن حمزہ پر تو خود غصہ سوار تھا،انجینئر نے کہا کہ اس کا انجام خراب ہوگا۔حمزہ نے کہا جب خراب ہوگا دیکھا جائے گا۔وہ بھنایا ہوا چلا گیا۔مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر اس نے پولیس کی مدد لی تو معاملہ بڑا خطرناک ہو جائے گا۔اور لاکھوں کی عمارت شکست و ریخت کی شکار ہو جائے گی۔

دو تین دنوں بعد صدر اور سکریٹری دونوں آئے۔انجینئر عبدالرشید کے بعض اعزہ کے وہ میرٹھ سے خط بھی لائے تھے۔دونوں نے کارپوریشن جا کر وہ خط اس کو دیا

مگر اس نے کہا کہ اب تو فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر تین دنوں تک ان دونوں نے ادھر ادھر ٹکر ماری بھاگ بھاگ کر دارالشفاء جاتے رہے۔ چیف منسٹر سے ملنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ اس کا حل صرف وزیر اعلیٰ سے ملنے میں ہے۔ اور کوئی حل نہیں ہے۔ آپ لوگ فوراً وزیر اعلیٰ سے ملئے۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح چیف منسٹر سے ملاقات ہو جائے مگر وہ نا کام رہے۔ اور فیصلہ رکوانے کیلئے کوئی بھی کام نہ کر سکے۔ تیسرے دن مجھ سے کہا کہ وزیر اعلیٰ سے ٹائم لے لیجئے ان سے ملاقات کی جائے گی میں نے کہا کہ میں ایک معمولی آفس سکریٹری ہوں۔ آپ صوبہ کے صدر اور جنرل سکریٹری ہیں۔ آپ حضرات ٹائم لیں اور ان سے اسی حیثیت سے ملاقات کریں تو اس کا اثر بہتر ہوگا۔ آپ کونسل ہاؤس جائیں کوئی تدبیر کریں۔ مگر وہ تین دنوں تک سڑکیں ناپتے رہے۔ نہ وزیر اعلیٰ سے مل سکے نہ کوئی دوسرا کام کر سکے۔ انجینئر کی بہت خوشامدیں کیں مگر وہ تو ہم لوگوں سے جلا بھنا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر آپ لوگ چار فٹ پیچھے عمارت کو نہیں بنائیں گے تو بذریعہ پولیس عمارت منہدم ہو کر رہے گی۔ وہ منہ لٹکائے ہوئے چلے آئے، معاملہ کو اس خطرناک موڑ پر لا کر چوتھے دن بغیر مجھ کو مطلع کئے چپکے سے لکھنؤ سے بھاگ گئے۔ معاملہ جہاں کا وہیں رہا۔ بلکہ اور اشتعال پیدا کر دیا۔

وزیر اعلیٰ سے ملاقات.......................

یہ مجھے معلوم تھا کہ کارپوریشن کے فیصلہ کی کسی عدالت میں اپیل نہیں ہو سکتی اس کا فیصلہ صرف حکومت بدل سکتی ہے۔ دوسری کوئی سبیل نہیں ہے۔ جب یہ دونوں حضرات صدارت کا طرہ اور جنرل سکریٹری کا تمغہ لگائے ہوئے واپس چلے گئے تو

دوسرے دن، میں نے اپنے طور پر جدو جہد کا فیصلہ کرلیا۔ اتفاق سے اسی دن دس بجے میرے دوست نظیر احمد انصاری ایم ایل اے مجھ سے ملنے دفتر آ گئے ۔، وہ رات ہی اپنے وطن میرٹھ سے آئے تھے۔ میں نے چائے منگائی، خیر و عافیت کے بعد میں نے دفتر کی تعمیر کے سلسلے میں جو طوفان کھڑا ہو گیا تھا اس کی تفصیل اور صورت حال کی نزاکت بتائی اور کہا کہ امروز فردا میں کام نہیں ہوا تو خطرناک صورت حال پیش آ سکتی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ابھی دارالشفاء جا کر وزیر اعلیٰ سے ٹائم لے لیجئے۔ جو وقت مقرر ہو مجھے ٹیلیفون پر مطلع کر دیں میں پہونچ جاؤں گا۔ وہ میرے یہاں سے رخصت ہو کر گئے، ایک گھنٹہ کے بعد انہوں نے مجھے فون کیا کہ سوا بجے کا وقت ملا ہے ۔ آپ اس سے پہلے دارالشفاء پہونچ جائیں ۔ حاجی عبدالعزیز کو شیروانی ، پاجامہ پہنا کر ساتھ لیتے آئیں۔ ایک موٹا بھاری بھرکم آدمی جمعیۃ علماء کے وفد میں ہوگا تو وفد کا وزن بڑھے گا۔ بات تو ہم لوگوں کو کرنی ہے۔ اوران سے کہہ دیں کہ وہ درمیان میں کچھ نہ بولیں، میں نے جب ان سے چلنے کیلئے کہا تو وہ ہچکچائے اور کسی طرح تیار نہیں ہو رہے تھے تو میں نے ان سے صاف صاف کہدیا کہ آپ کو کچھ کرنا نہیں ہے۔ آپ کے بھاری بھرکم وجود سے ہم لوگوں کو نفسیاتی فائدہ اٹھانا ہے۔ بڑی مشکلوں سے تیار ہوئے ، میں ان کو لیکر دارالشفاء پہونچا۔ ۱۲ بجنے والے تھے۔ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے اسمبلی ہال پہونچ گئے۔

فیصلہ کی فائل سرد خانے میں.........................

ہم لوگ سیدھے چیف منسٹر کے کمرے میں داخل ہو گئے ۔ مسٹر بہوگنا نے آداب حکومت کے برخلاف خود ہی مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کیا اور کہا آیئے ! آیئے! کیسے آنا ہوا۔ نظیر احمد بڑے چرب زبان تھے ۔ باتوں کا سلیقہ خوب آتا تھا

انہوں نے کہا کہ کارپوریشن کے ایک انجینئر نے آپ کی حکومت کو بدنام کرنے کیلئے ایک حرکت کردی ہے۔اسی سے مطلع کرنے کیلئے ہم حاضر ہوئے ہیں۔وزیراعلیٰ نے پوچھا معاملہ کیا ہے۔میں نے تفصیل بیان کردی۔نظیر احمد نے اس میں پیوند لگایا کہ جس دن جمعیۃ علماء کا دفتر گرایا جائے گا نیوز ایجنسیاں پورے ملک میں اس خبر کو نشر کریں گی بہوگنا جی کی حکومت میں مسلمانوں پر ظلم کیا جا رہا ہے۔وہ جمعیۃ علماء جو کانگریس کے دوش بدوش آزادی کی جنگ میں رہی اس کے لکھنؤ کے دفتر کو کانگریس کی حکومت میں ڈھا دیا گیا۔بہوگنا جی نے کہا، آپ کیا چاہتے ہیں۔اس کے جواب میں میں نے کہا کہ آپ ہماری فائل کارپوریشن سے منگوالیں اور سرد خانے میں ڈال دیں اور فیصلہ کو کالعدم کردیں یہ اختیار صرف اتر پردیش حکومت کو ہے۔

انہوں نے فوراً اپنے سکریٹری کوہلی کو بلایا اور کہا کہ شاہ کو ٹیلیفون کرو کہ دفتر جمعیۃ علماء کی فائل لیکر فوراً آجائیں۔شاہ اس زمانہ میں لکھنؤ کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر تھے جو بہوگنا کے عزیزوں میں سے تھے۔تھوڑی دیر بعد مسٹر کوہلی نے بتایا کہ مسٹر شاہ آفس میں نہیں ہیں۔چیف منسٹر نے کہا کہ آفس کو فون کردو کہ وہ جب بھی آئیں ان کو مطلع کردیا جائے اور میرے پاس بھیج دیا جائے اور مسٹر کوہلی سے کہا کہ ان کا ٹیلیفون نمبر نوٹ کرلو، اور جب کاروائی ہوجائے تو ان کو مطلع کردینا میں نے اپنے دفتر کا ٹیلیفون نمبر مسٹر کوہلی کو نوٹ کرادیا۔ہم لوگ وزیراعلیٰ کا شکریہ ادا کرکے چلے آئے۔

شام کے چار بجے دفتر کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اٹھایا تو آواز آئی میں چیف منسٹر آفس سے کوہلی بول رہا ہوں، میں نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے کہا مبارک ہو۔آپ کا کام ہوگیا۔اتفاق سے مسٹر شاہ خود ہی صاحب سے ملنے آگئے تھے۔

فوراً وہ فائل منگوائی گئی اور اس پر لال نشان ڈال کر داخل دفتر کر دی گئی۔ سارا کیس ختم کر دیا گیا، میں نے شکریہ ادا کیا اور ٹیلیفون رکھ دیا۔

اظہار شکریہ........................

ہفتہ عشرہ کے بعد سید احمد ہاشمی آئے جو اس وقت ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند تھے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ چلئے چیف منسٹر کا شکریہ ادا کر آئیں۔ انہوں نے کہا ہاں یہ تو بہت ضروری ہے۔ انہوں نے ٹیلیفون کر کے ٹائم لیا۔ ہم دونوں کونسل ہاؤس گئے۔ وزیراعلیٰ سے ملاقات ہوئی۔ ہاشمی صاحب نے دفتر کے سلسلہ میں ان کی دلچسپی اور تعاون کے شکریہ کے الفاظ کہے۔ اس دن مسٹر بہوگنا بڑے اچھے موڈ میں تھے، انہوں نے کہا کہ آپ کی درخواست دو منزلوں کی تھی۔ اب بلا نقشہ داخل کئے تیسری منزل بھی بنوا لیجئے۔ اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی، پھر ہنس کر کہا شکریہ ادا کرنے کا وقت وہی ہوگا۔

وزیراعلیٰ کے اس تفریحی جملے سے میرا ذہن کھل گیا کہ دفتر کی جتنی تعمیر ہوئی ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ دوسری منزل میں صرف ایک ہال اور ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ ہال تو ہمیشہ مسافر خانہ بنا رہے گا۔ کمرہ میں آفس سکریٹری کی میز اور کرسی ہوگی۔ اور پھر فائلوں کی الماری اسکے علاوہ اس کمرے میں اور کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ اگر کچھ معززین دفتر میں آئے تو ان کو سکون و راحت کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ ٹھیکیدار ایک مسلمان حاجی محمد حسین تھے۔ میں نے اس سے مشورہ کیا کہ اوپر کتنے کمرے بن سکتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ چار کمرے ایک سائز کے اور چاروں کمروں کے درمیان اتنا بڑا چھت دار صحن ہوسکتا ہے کہ چار پلنگ بچھائے جا سکتے ہیں، جب یہ معلومات میں نے کر لیں تو دہلی ٹیلیفون کر کے مولانا مدنی سے کہا کہ تیسری منزل کے دفتر کی تعمیر نامکمل رہ جائے گی۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس پر کام شروع کرا دوں اور پھر چیف منسٹر سے

جو بات ہوئی تھی اس کی تفصیل بتادی انہوں نے فرمایا کہ بسم اللہ کیجئے، خرچ کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہوجائے گا۔ بلا تاخیر کام شروع کرادیجئے۔

اندر کے پلاسٹر کا کام ختم ہونے کے بعد تیسری منزل پر چار کمروں کی تعمیر شروع کرادی اور چاروں کمرے تیار ہوگئے۔ اب دفتر کے پاس گراؤنڈ فلور پر تین دوکانیں ان کے پیچھے ایک بڑا کمرہ گودام کیلئے، دوسری منزل پر ایک چھوٹا کمرہ آفس سکریٹری کیلئے اور ایک اوسط درجہ کا ہال۔ اوپر کی منزل میں چار کمرے معزز مہمانوں کیلئے خاص کردیئے گئے جس کے ایک کمرے میں میرا پلنگ تھا۔

دفتر کا افتتاح......................

جب عمارت مکمل ہوگئی تو میں نے مولانا مدنی کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر چیف منسٹر کو بلا کر اس کا افتتاح کرایا جائے تو بہت سی قانونی مشکلات جو اب بھی ہیں وہ دور ہوجائیں گی۔ مولانا نے میری تجویز منظور کرلی۔

ابھی سیور لائن کا کام باقی تھا میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کی وہ تیار ہوگیا میں نے بات صاف کرلی تھی۔ کہ سڑک کھودنے کا پرمیشن حاصل کرنا تمہارا کام ہے۔ اس نے منظور کرلیا تھا اس نے پائپ بھیج دیئے، جب تک گلی میں کھدائی ہورہی تھی تب تک کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا اور آدھی سڑک کھود کر پائپ بچھانے کی باری آئی اور اس نے کھدائی شروع کی۔ سیور لائن بیچ سڑک سے گذرتی تھی، بیچ سڑک میں مین ہول بنوانے لگا کہ ایک انسپکٹر اور کچھ پولیس والے تمام مزدوروں کو گرفتار کرکے لے گئے اور مزدوروں کے ساتھ سارا سامان بھی لے گئے معلوم ہوا کہ ٹھیکیدار مجھے دھوکہ میں رکھ کر بلا اجازت کام کرارہا تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا مگر کیا کرتا۔ حمزہ کو ساتھ لیا اور انسپکٹر کے پاس پہونچا میں نے بلا تمہید کہا اگر آپ کو کچھ لینا تھا تو براہ راست مجھ سے مل لئے ہوتے

اس ہنگامہ کی کیا ضرورت تھی ۔ دوسو روپئے پہ معاملہ طے ہوا مزدور سامان لیکر واپس آئے اور مین ہول کی تعمیر مکمل ہوئی۔

اب افتتاح کی تقریب کی تاریخ قریب آئی۔ دفتر کے سامنے روڈ پر اسٹیج لگایا گیا اور کرسیاں ڈال دی گئیں ۔ خاطر تواضع کیلئے کنٹریکٹ کرلیا گیا۔ باوردی بیرے آ گئے مولانا سید اسعد مدنی دہلی سے تشریف لائے ۔ اور صوبے کے تمام عہدیداران لباس فاخرہ زیب تن کئے ہوئے پہونچ گئے ۔ جلسہ میں وزیر اعلیٰ بہوگنا ٹھیک وقت پر آئے اور تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی پارٹی کانگریس کا دفتر کرایہ کے مکان میں ہے۔ آپ حضرات خوش قسمت ہیں کہ آپ کا دفتر آپ کی ذاتی عمارت میں ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میں بھی تو آپ ہی لوگوں میں سے ہوں ۔ مولانا نے شکریہ کی تقریر کی ۔ دفتر کا افتتاح ہوگیا۔ اور چائے ناشتہ کے بعد جلسہ ختم ہوا۔ اس تقریب میں صدر اور سکریٹری بھی آئے اور اپنے رفقاء سفر سے فخریہ شاندار دفتر کی تعمیر کا ذکر کرتے اور کہتے کہ ہم نے ہر کمرے پر نام کے کتبے بھی لگوادیئے ہیں، لوگ ان کی کارگزاریوں کی تعریفیں کرتے، میں یہ بات دیکھتا اور سنتا رہا، کیا کہتا:

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کے فرہاد ہوگئے

میری دفتری سرگرمیاں........................

میں ۱۹۷۲ء میں لکھنؤ آیا۔ اور ۱۹۷۶ء کے آغاز تک چار سال رہا میں نے صوبائی جمعیۃ میں نئی زندگی اور نئی سرگرمی پیدا کی ۔ دفتر کو متحرک اور فعال بنایا اس کو ایک ویران کھنڈر سے نکال کر قلب شہر امین آباد میں شاہراہ عام پر ایک خوبصورت سہ منزلہ شاندار عمارت میں منتقل کیا۔ اتر پردیش کے عہدیداران، معززین اور مختلف جماعتوں

کے لیڈران کی دفتر میں آمد بڑھی، اضلاع کی جمعیتوں کے نمائندے، عہدیداران اور کارکنوں سے دفتر ہردم بھرا رہنے لگا۔ اب کاریں دفتر کے سامنے آکر رکنے لگیں۔ معزز سے معزز شخصیات کو بلانے میں جو جھجک تھی وہ ختم ہوگئی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پرانے دفتر میں تھا، دہلی سے ایک عرب مہمان آیا اور مجھے فون سے مطلع کیا گیا کہ ایک عرب مہمان لکھنؤ جارہے ہیں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے، ان کا قیام اودھ کلارک ہوٹل میں ہوگا۔ آپ ان سے وہیں ملیں، اس مہمان کو دفتر اسلئے نہیں لاسکا کہ میرا دفتر آدمیوں کے بجائے بھوتوں کا ڈیرا معلوم ہوتا تھا ان کو باہر باہر لکھنؤ دکھایا اور رخصت کردیا۔

میں نے تیس پینتیس ضلعوں میں جمعیۃ علماء کو بیدار کیا اور پھر ان سے مسلسل اور مستحکم رابطہ رکھا۔ ہر جگہ کی تنظیم کو فعال بنانے کی کوشش کی۔ قومی وملی کام کرنے والوں کے مسائل ومشکلات میں تعاون دیا۔ وہ اضلاع سے اپنی ضرورتیں اور اپنے مسائل لیکر لکھنؤ آتے تو میں ہر ممکن تعاون کرتا، میں اس کو اپنا فرض منصبی ہی نہیں سمجھتا بلکہ مستقل سیاسی ورک کی وجہ سے یہ میرا مزاج بن گیا تھا اور میری فطرت ثانیہ۔

کانپور کا ایک مسئلہ........................

میں یہاں سیکڑوں مثالوں میں سے ایک دو مثالیں دینا چاہتا ہوں تاکہ میرے کام کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے، کانپور جمعیۃ علماء کے کئی ذمہ دار ایک ساتھ آئے جو شہری جمعیۃ علماء کے فعال اور بہت ہی متحرک کارکن تھے۔ مولانا قمرالدین مظاہری اور حافظ حمید احمد اس وفد میں شامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم لوگ پالن حقانی کا پروگرام کانپور میں رکھنا چاہتے ہیں اور کلکٹر نے پالن حقانی کے کانپور میں داخلہ پر پابندی لگادی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پالن حقانی کا پورے ملک میں طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت اتر پردیش میں گورنر راج تھا۔ حیدرآباد کے اکبر علی خاں اتر پردیش کے گورنر

تھے۔ میں نے گورنر ہاؤس فون کر کے بتایا کہ صوبہ جمعیۃ کے آفس سے سکریٹری بول رہا ہوں، میرے پاس کانپور کا وفد آیا ہوا ہے، ہمیں گورنر صاحب سے ملنا ہے، ہم کب آجائیں، گورنر کے سکریٹری نے ٹائم دیدیا، میں کانپور کے احباب کولیکر گورنر ہاؤس پہونچ گیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنے مخصوص کمرے میں تشریف لائے، ان کے سامنے عرضداشت پیش کی کہ پالن حقانی ایک مذہبی واعظ ہیں، صرف دین کی باتیں اپنی تقریر میں کہتے ہیں۔ ان کی تقریروں سے نقض امن کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے باوجود معلوم نہیں کیوں کلکٹر نے کانپور میں ان کے وعظ پر پابندی عائد کردی ہے۔ پھر حقانی صاحب کا اجمالی تعارف کرایا گیا۔ ان کی دینی اور مذہبی خدمات بتایا گیا۔ گورنر بہت حاضر دماغ اور نکتہ شناس آدمی تھے اور مختصر بات کرتے تھے، وہ بات کی تہہ تک پہونچ گئے، انہوں نے کہا کہ صرف تین دنوں کیلئے اجازت دی جاسکتی ہے۔ کلکٹر کو اطلاع کردی جائے گی۔ ہم شکریہ ادا کر کے واپس آگئے، احباب نے تین دنوں کا پروگرام بنایا اور کانپور میں خوب دھوم کے جلسے کئے۔

قتل کے ملزموں کی رہائی.........................

اسی طرح گونڈہ سے ایک مرتبہ چار آدمیوں پر مشتمل ایک وفد آیا وہ لوگ یہ مسئلہ لیکر آئے تھے کہ محرم کے موقعہ پر ایک سادھو کو شارع عام کے ایک مندر میں قتل کر دیا گیا تھا۔ ہندوؤں نے ۲۹ مسلمانوں کے خلاف نامزد ایف آئی آر کی، جس کی بنیاد پر سب کے سب گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے۔ اور سب کو ۳۰۲ کا ملزم بنا دیا گیا اور ضمانت پر بھی رہائی نہیں ہوئی۔ چھ ماہ سے وہ جیلوں میں تھے، مسئلہ ان کی رہائی کا تھا مسٹر بہوگنا کی حکومت کے آخری ایام تھے۔ الیکشن کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ گونڈہ شہر سے مسٹر ڈی آر گوئل کھڑے ہوئے تھے۔ جو ’’سامپر دائیکتا ورودھی سنستھا‘‘ کے

جنرل سکریٹری تھے۔ جمعیۃ والوں سے ان کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ کیونکہ وہ بہت صاف ذہن کے لیڈر تھے۔ مسز سبھد را جوشی ان کے ورک کے سلسلہ میں گونڈہ گئی تھیں۔ وہاں کے قومی کارکنوں نے ان سے ملاقات کر کے کہا تھا کہ اگر اس موقعہ پر مسلمان قیدیوں کو رہا کرادیا جائے تو مسلمانوں کا سب ووٹ آپ کو مل جائے گا۔ مسز سبھد را جوشی گونڈہ سے لکھنؤ آئیں۔ اور انہوں نے مسٹر بہوگنا وزیر اعلیٰ سے مل کر گونڈہ کے قیدیوں کی رہائی کے سلسلہ میں کوئی گفتگو کی پھر مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ میں گونڈہ گئی تھی۔ وہاں کے مسلمان قیدیوں کا مسئلہ میرے سامنے پیش کیا گیا تھا لیکن میں نے یہاں چیف منسٹر سے بات کر لی ہے۔ آپ گونڈہ کے چند معزز آدمیوں کو بلالیں اور ان کو لیکر چیف منسٹر سے مل لیں اور ان سے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کریں کام ہو جائے گا۔ گونڈہ سے چار آدمیوں کا وفد میرے دفتر آیا تو میں ان کو لیکر چیف منسٹر ہاؤس پہونچا اور گونڈہ کے مسلمان قیدیوں کا مسئلہ پیش کیا۔ وزیر اعلیٰ کو خود معلوم تھا ساری باتیں ان سے پہلے ہو چکی تھیں۔ انہوں نے فوراً اپنے سکریٹری کوہلی کو بلایا اور کہا کہ ہوم سکریٹری کو فون کرو کہ وہ گونڈہ کے کلکٹر کو ٹیلیفون کر کے گونڈہ کے ۲۹ قیدیوں کو باعزت رہا کر دیں۔ مسٹر کوہلی نے ہوم سکریٹری تک بات پہونچائی، انہوں نے اسی وقت گونڈہ کے کلکٹر سے رابطہ کیا اور حکمنامہ بھیج دیا، ہماری موجودگی ہی میں سب ہو گیا۔ وزیر اعلیٰ نے ہم لوگوں سے کہا کہ جب تک آپ لوگ گونڈہ پہونچیں گے تمام مسلمان رہا ہو کر اپنے اپنے گھروں کو پہونچ چکے ہوں گے۔ ہم شکریہ ادا کر کے واپس ہوئے، بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہوا جب وفد کے لوگ پہونچے تو وہ رہا ہو چکے تھے۔

صدر جمعیۃ علماء کی ناراضی........................

اسی الیکشن میں جمعیۃ علماء سے وابستہ کئی افراد کانگریس پارٹی سے ٹکٹ کے

خواہاں تھے۔انہیں میں مولوی جلیل سیوہاروی صدر جمعیۃ علماء اتر پردیش بھی تھے۔ انہوں نے سیوہارہ سے دوآدمیوں کو اپنے خط کے ساتھ لکھنؤ میرے پاس بھیجا خط میں انہوں نے مجھے لکھا کہ آپ میرے لئے کانگریس سے ٹکٹ کی کوشش کریں اگر آپ دل سے چاہیں گےاور کوشش کریں گے تو مجھے ٹکٹ مل جائے گا۔

خط پڑھ کر مجھے بڑا غصہ آیا، میں ایک معمولی آفس سکریٹری، جب کبھی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوتی ہے تو صدر کے مقام پر مسند لگا کر وہ بیٹھتے ہیں۔میٹنگ کی ساری کارروائی پر ان کے دستخط ہوتے ہیں۔ان کے نام سے اخبارات میں خبریں دی جاتی ہیں۔میری حیثیت تو چپراسی کی ہوتی ہے۔نظم کی ساری ذمہ داری میری ہوتی ہے، ہر ایک کا اعزاز واکرام اور خاطر مدارات مرے فرائض میں شامل ہے،اور جب الیکشن کا زمانہ آیا اوران کو ایک اوراونچی کرسی کی خواہش ہوئی تو میں یک بیک اتنا بڑا آدمی ہوگیا کہ کانگریس آفس میں جہاں بڑے بڑے لیڈروں کی دال نہیں گلتی اور ٹکٹ کیلئے بھکاریوں کی طرح پھرتے ہیں اپنے اثر ورسوخ سے ٹکٹ ان کو دلا دینے کی پوزیشن میں ہوگیا، یہ ایک احمقانہ بات تھی۔میں نے ان دونوں آدمیوں سے کہا کہ موصوف کو خود لکھنؤ آکر اپنے بڑے عہدے کے حوالے سے ٹکٹ کا مطالبہ کرنا چاہئے۔جب ان دونوں نے سیوہارہ جا کر میری بات ان کو بتائی تو انہوں نے بہت پیچ وتاب کھایا اور کہا کہ وہ ٹکٹ دلا سکتے ہیں۔اور جان بوجھ کر بے نیازی اور لاپرواہی برت رہے ہیں جبکہ اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں تھی، ان کو ایک اخباری خبر سے غلط فہمی ہوئی تھی۔کہ میں ٹکٹ کے معاملہ میں دورنزدیک ضرور کچھ دخیل ہوں اور مسلمان امیدواروں کے ٹکٹ دینے میں میرا مشورہ بھی ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جب ٹکٹوں کی تقسیم کا زمانہ آیا تو ہزاروں امیدوار کانگریس کے

صوبائی دفتر میں جمع ہوگئے اور بالکل ایک میلے کی شکل ہوگئی ۔ ان میں ۲۵/۳۰ ر امیدوار مسلمان تھے۔ان میں سے کئی ایسے تھے جو ایم ایل اے رہ چکے تھے۔کچھ ایسے تھے جن کا جمعیۃ علماء سے بھی کچھ تعلق تھا۔ان لوگوں نے جب اپنے بارے میں ٹکٹ تقسیم کرنے والی کمیٹی سے گفتگو کی تو بہت خشک جواب ملا، وہ سب کے سب مسلمان امیدوار برہم تھے اور بڑے جوش وخروش سے آپس میں باتیں کررہے تھے ان میں زیادہ تر مغربی اضلاع کے نمائندے تھے۔جب ان لوگوں کو دوٹوک جواب دیدیا گیا تو سب کے سب جھنجھلائے ہوئے تھے جیسے کاٹ کھانے پر آمادہ ہوں ۔آپس میں ایک دوسرے سے گرم گرم لب ولہجہ میں تبادلہ خیال کررہے تھے میں بھی اپنی بیگ لئے تماشائیوں میں شامل تھا ان میں سے کئی ایک میرے شناسا بھی تھے ۔ ایسے امیدواروں کی تعداد بیس اکیس تھی جن کی ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں ۔ وہی سب سے زیادہ برہم تھے ۔ وہ سب کانگریس آفس کے نیچے والے ایک چھوٹے سے ہال میں جمع ہوئے تاکہ اپنی پالیسی طے کریں کہ اب ان کو کیا کرنا ہے ۔ میں بھی انہیں لوگوں کی صف میں صرف تماشائی کی حیثیت سے بیٹھ گیا کیوں کہ میرا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔دروازے والی دیوار چھوڑ کر بقیہ تینوں طرف دیوار سے ٹیک لگا کر سب بیٹھ گئے ۔ ترتیب سے ہر امیدوار دوتین منٹوں میں اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتا،سب کی تقریروں کا ماحصل اور ہر ایک کے بیان میں قدر مشترک یہ بات تھی کہ مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ان کی حق تلفی کی جارہی ہے ۔تنگ نظری اور تعصب سے کام لیا جارہا ہے ۔ غیر مقبول اور علاقہ کے ناپسندیدہ یا بدنام آدمیوں کو ٹکٹ دیا جارہا ہے۔کسی نے جوش میں کہا کہ میں کانگریس امیدوار کو ہرا کر رہوں گا،کسی نے کہا میں اپنے علاقہ سے کانگریس کی جڑ بنیاد کھود دوں گا۔غصہ کی دیوانگی ، ناکامی کے شدید تاثر میں منہ میں جو

آتا تھا وہ کہا جارہا ہے گویا وہ سب کے سب کانگریس کے باغی لیڈروں جیسی باتیں کر رہے تھے۔اب شمع گردش کرتی ہوئی میرے سامنے آئی میں نہ امیدوار تھا نہ ٹکٹ کا خواہاں اور نہ اس مسئلہ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی لیکن ذہن تو بہرحال کانگریسی تھا۔میں اپنی باری پر کھڑا ہوا، میں نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے گفتگو شروع کی میں نے کہا کہ آپ حضرات پہلے ہی مرحلہ پر بازی ہار چکے ہیں آپ کی جدوجہد کا اصل میدان آپ کے ضلع کانگریس کا دفتر تھا، جہاں سے اپنی سفارش کے ساتھ صوبے میں امیدواروں کے نام بھیجے جارہے تھے۔آپ حضرات نے اپنے ضلع کی کانگریس پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا کہ وہ مجبور ہو کر صوبہ دفتر کو آپ کا نام امیدوار کی حیثیت سے بھیجتا۔ آپ میں سے شاید کسی کا بھی نام اس کے ضلع دفتر نے نہیں بھیجا ہے۔اور صوبے کے اس دفتر میں صرف انہیں ناموں پر غور کیا جارہا ہے جنہیں ضلع یونٹ نے بھیجا ہے۔ آپ نے اپنا نام نہیں بھجوایا تو آپ کا نام زیرِ غور کیسے آئے گا۔آپ تو پہلے ہی بازی ہار چکے ہیں۔ یہاں تگ و دو سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور نہ یہاں کوئی سفارش کام آئے گی۔آپ ہواؤں سے لڑ رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ آپ تمام حضرات پرانے کانگریسی ہیں مگر کسی امیدوار نے پارٹی اسپرٹ سے بات نہیں کی، اپنے ذاتی مفاد کو پارٹی مفاد پر مقدم رکھا جو ایک سچے کانگریسی لیڈر کے شایانِ شان نہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کانگریس کو چھوڑ بھی نہیں سکتے، اگر جذبات میں آ کر آپ نے کانگریسی امیدوار کی مخالفت کی تو چاہے کانگریس امیدوار جیتے یا ہارے لیکن آپ کا سیاسی کیریئر ہمیشہ کیلئے برباد ہو جائے گا۔عوام کا پارٹی کا آپ کے ساتھی پارٹی کارکنوں کا اعتماد آپ کی ذات سے ہمیشہ کیلئے اٹھ جائے گا یہ سب سے بڑا خسارہ ہوگا۔ کانگریس ہارے یا جیتے آپ خود بازی ہار جائیں گے۔

پارٹی کے فیصلے کو تسلیم کر لینا ہی وقت کا تقاضا ہے اپنے ذہنوں سے پارٹی مخالف سرگرمیوں کا خیال نکال دیں۔ آپ کے حق میں یہی بہتر ہوگا۔

میرے بعد حیات اللہ انصاری بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بہت زمانہ شناس تھے وہ ہوا کے رخ کو خوب پہچانتے تھے۔ رفتار زمانہ کی نبض پر ان کی انگلیاں رہتی تھیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ کامیاب رہے۔ حکومت کے مختلف تنظیموں اور پروگراموں کے نام پر مالی امداد حاصل کرتے رہے، پندرہ سالوں سے وہ برابر راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ وہ تجربہ کار سیاستداں اور ذہین صحافی تھے انہوں نے کھڑے ہو کر حرف بحرف میری باتوں کی تائید کی اور کہا کہ اسیر صاحب کی باتوں میں وزن ہے، تجربات کا نچوڑ ہے، میں تو کہوں گا کہ ان کو کانگریس کی اقلیتی سیل کا کنوینز آج بنا دیا جائے۔

بھانت بھانت کی انہیں بولیوں پر یہ میٹنگ برخاست ہوگئی، بجھے بجھے ہوئے دلوں کے ساتھ لوگ میٹنگ ہال سے باہر آ گئے۔ باہر قومی آواز کا مقامی نامہ نگار موجود تھا اس نے یہ کارروائی دیکھی اور سنی تھی۔ اس نے قومی آواز میں یہ خبر شائع کی کہ آج کانگریس اقلیتی سیل کا اسیر ادروی کو کنوینز بنا دیا گیا ہے۔ اس وقت قومی آواز اخبار کا حلقہ بہت وسیع تھا، بات بڑی دور تک پہونچ گئی حالانکہ اخباری خبر کے بعد میں ایک دن کیلئے کانگریس دفتر نہیں گیا اور نہ میں نے کبھی کسی سے اس کا ذکر کیا کہ میں اقلیتی سیل کا کنوینز ہو گیا ہوں، میں جانتا تھا کہ یہ ہوائی بات ہے اور بے ضابطہ ہے۔

صدر جمعیۃ علماء مولوی جلیل کو اسی اخباری خبر سے غلط فہمی ہوئی اور ان کے دل میں میری طرف سے کینہ بیٹھ گیا کہ انہوں نے جان بوجھ کر مجھے ٹکٹ نہیں دلایا۔ ہماری جمعیۃ میں کانا پھوسی بہت چلتی ہے۔ پھر بڑی خطرناک اور زہریلی ہوتی ہے۔ یہ دیمک کی طرح کسی مخلص کارکن کی جڑ بنیاد کھودنے میں بڑا اہم رول ادا کرتی ہے۔ جب کسی

کے وقار کو مجروح کرنا ہوتا ہے اس کی تیز تر سرگرمیوں سے اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے کہ اب وہ چھا جائے گا اس کا نام اونچا ہوجائے گا وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہوجائے گا تو یہی مناجات کی مہم چلائی جاتی ہے۔ میرے خلاف بھی یہ مہم شروع ہوگئی تھی میں سمجھ چکا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

وقف بورڈ کی ممبری.......................

مولوی جلیل ذہین وزیرک آدمی نہیں ہیں جسم ضرور بھاری بھرکم ہے، اگر اسی تناسب سے عقل بھی ہوتی ہے، ایسے لوگ صلاحیتوں سے محروم ہونے کی وجہ سے رشک وحسد کے شکار ہوکر کینہ پرور ہوجاتے ہیں۔ ان کے دل میں میرے خلاف سب سے پہلا چر کہ اس وقت لگا جب ۱۹۷۳ء میں مدنی منزل بنارس میں صوبائی جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ میں اس میٹنگ کے سلسلہ میں ایک ہفتہ قبل بنارس آچکا تھا اور مدنی منزل میں مقیم تھا۔ اس اجلاس میں ایک ایجنڈا اتر پردیش وقف بورڈ کیلئے جمعیۃ علماء کی جانب سے ایک ممبر کو منتخب کرنا تھا۔ وقف بورڈ کے بائیولاج میں یہ شامل ہے، حکومت کی طرف سے مراسلہ آچکا تھا کہ صوبائی جمعیۃ علماء اپنا ممبر منتخب کرکے حکومت کو بھیج دے۔ کمیٹی چل رہی تھی اور جب اس ایجنڈے کو پیش کیا گیا تو لکھنؤ کے عبدالمتین نے جو جمعیۃ کے خازن تھے۔ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے میرا نام پیش کردیا۔ اور اپنی تجویز میں وزن پیدا کرنے کیلئے انہوں نے کہا کہ اسیر صاحب لکھنؤ میں رہتے ہیں ان کو سہولت ہوگی۔ اور پھر وہ اپنے سیاسی تجربات کی وجہ سے اس کیلئے سب سے زیادہ موزوں بھی ہیں۔ اس لئے ان کو منتخب کرلیا جائے۔ بغیر کسی غور وفکر کے سارے ممبران نے اس کی تائید کردی۔ اور کسی نے اس رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ البتہ مولوی جلیل خاموش رہے نہ تائید کی اور نہ انکار۔ چونکہ کوئی دوسرا نام پیش نہیں ہوا

اس لئے ووٹنگ یا رائے شماری کی ضرورت نہیں تھی ۔ اتفاق رائے سے میرا نام منظور ہوگیا۔اور میٹنگ ختم ہوگئی ۔ کارروائی رجسٹر باندھ کر رکھ دیا گیا،لوگ اپنی اپنی دلچسپیوں میں مصروف ہو گئے ۔

مولوی عبدالجلیل عہدوں کے بہت بھوکے تھے وہ چاہتے تھے کہ ہر اونچی کرسی ان کیلئے خاص کردی جائے چاہے وہ اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں ۔ وہ سنی وقف بورڈ کے خود ممبر ہونا چاہتے تھے، میٹنگ میں کسی نے ان کا نام تک نہیں لیا۔ان کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔مولوی جلیل نے مولانا مدنی سے اپنا غم بیان کیا اور کانا پھوسی شروع ہوگئی جس سے میں ہمیشہ خائف رہا میں سمجھ گیا کہ اب کچھ ہونے والا ہے ۔ کیونکہ اس مناجات کی زہرناکی سے جمعیۃ میں رہ کر خوب واقف ہو چکا ہوں ۔ بڑی دیر تک کانا پھوسی چلتی رہی کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا ہر شخص ایک دوسرے سے تفریحی گفتگو میں لگا ہوا ہے۔تقریباً آدھا گھنٹہ بعد مجھے اور دو ایک ممبران کو مولانا مدنی نے بلایا اور ممبران سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ اسیر صاحب اپنا نام واپس لے لیں تو کیا حرج ہے؟ جواب مجھے دینا تھا میں نے عرض کیا نہ میں نے اپنا نام پیش کیا نہ میں اس کا خواہشمند تھا۔ نہ میں نے اس سلسلہ میں کسی سے کوئی گفتگو کی ہے اور نہ اپنے منتخب ہونے کی مجھے کوئی خوشی ہے،جس نے میرا نام پیش کیا ہے وہی نام بھی واپس لے سکتا ہے ۔میرا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ، پھر عبدالمتین خازن بلائے گئے ،ان سے گفتگو رہی ۔اب کئی ممبران مولانا مدنی کے پاس آ گئے ۔عبدالمتین نے کہا کہ جب اتفاق رائے سے نام منظور ہوگیا تو اب نام کی واپسی کا کیا سوال؟ اگر اختلاف رائے ہوتا تو البتہ اس کی گنجائش تھی ، یہ ضابطہ کی اور قانونی بات تھی جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ پھر مولانا مدنی نے عبدالمتین اور مجھ کو تنہائی میں بلا کر کہا کہ مولوی جلیل کو بہت شوق

ہے ان کا شوق پورا ہونے دو۔ بدمزگی پیدا کرنے سے کیا فائدہ، جب بات یہاں تک پہونچی تو میں نے کہا کہ قانون اور ضابطہ ایک طرف، آپ کارروائی رجسٹر منگوا کر اس میں میرا نام کاٹ کر اس مولوی جلیل کا نام لکھ دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میٹنگ کی باضابطہ کارروائی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن سارے ممبران وہیں مقیم تھے۔ دسترخوان لگایا جارہا تھا اور کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ مولانا مدنی نے اپنے سامنے موجود جو ممبران تھے ان سے کہا کہ اسیر صاحب اپنا نام واپس لے رہے ہیں۔ اور ان کی جگہ مولوی جلیل کو منتخب کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس تجویز پر نہ لوگوں کی رائے لی گئی نہ ممبران نے اس نام کی منظوری دی۔ قطعی بے ضابطہ کارروائی تھی، میرا نام کٹ گیا، مولوی جلیل کا نام درج ہو گیا۔

نظام عام پہ اک شخص منفرد حاوی
اگر یہ بت شکنی ہے تو بت گری کیا ہے؟

اسی دوران ایک واقعہ اور ہو گیا، سیاسی حالات پر نظر رکھنا، حالات کے پیش نظر جمعیۃ علماء کے نقطۂ نگاہ کو واضح کرنا، اپنی یونٹوں کی رہنمائی کرنا صوبہ دفتر کے فرائض میں ہے۔ ہر موقعہ پر بیان دیتا، حالات کا تجزیہ کر کے اپنے موقف کو واشگاف لفظوں میں ظاہر کر دیتا اور علاقائی کارکنوں کو جمعیۃ کی پالیسی سے آگاہ کرنا صوبہ کے جنرل سکریٹری اور صدر کا فرض ہوتا ہے۔ لیکن یہ سارا کام میں کرتا تھا۔ بیان میں دیتا تھا، پالیسی کی وضاحت میں کرتا تھا۔ اخبارات میں جمعیۃ کے موقف کا اظہار میں کرتا تھا۔ اضلاع کی جمعیتوں کو سرکلر میں بھیجتا تھا۔ اور اپنے نام سے کرتا تھا۔ دستخط میرا ہوتا تھا۔ یہ بات صدر صاحب کو گراں ہوتی تھی، وہ چاہتے تھے کہ آفس سکریٹری یہ سارے کام کرے مگر میرے نام سے کرے میں اس استحصال کیلئے تیار نہیں تھا، انہوں نے کئی مرتبہ

اعتراض کیا مگر میں نے ان کا نام نہیں دیا کیوں کہ میں اس کے انجام سے واقف تھا۔ اگر اس نے کوئی اخباری بیان دیا اور کسی طرف سے اس پر گرفت ہوئی تو وہ فوراً انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ میں نے یہ بیان نہیں دیا ہے۔ وہ اسیر صاحب نے لکھا ہوگا اور میرا نام استعمال کیا ہوگا۔ میں اس کا ذمہ دار نہیں اس کا جواب وہی دیں۔ اس طرح مخالفت میں وہ مجھ کو رسوا کر دیں گے،۔ اور اگر ان کی پبلسٹی ہوئی، تعریف ہوئی تو فخر یہ اس بیان کو اپنی طرف منسوب کر کے لوگوں سے داد و تحسین حاصل کریں گے۔ اسی وجہ سے میں اس حماقت کیلئے کبھی تیار نہیں ہوا۔ خود ان میں کہنے یا کسی مسئلہ پر اظہار رائے کی صلاحیت بالکل نہیں تھی، نہ وہ ایک سطر کسی مسئلہ پر لکھ سکتے تھے۔ جب کئی بار یہ بات آئی تو میں نے ان حالات کے تحت رفیق عزیز عزیز الحسن صدیقی غازی پوری کو ایک خط لکھا جس میں پورے حالات تفصیل سے لکھ دیئے۔ چونکہ میں ذہنی کوفت میں مبتلا تھا، صورت حال سے بیزار تھا اسلئے میرا لب ولہجہ قدرے سخت ہو گیا تھا۔ عزیز الحسن صدیقی سے یہ غلطی ہوگئی کہ انہوں نے وہ خط مولانا مدنی کے پاس دہلی بھیج دیا، انہوں نے وہ خط مولوی جلیل کو دیدیا۔ بڑا طوفان اٹھا، صدر کی پوزیشن مٹی میں مل رہی تھی، لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے، مجھ سے باز پرس کی ان میں ہمت نہیں تھی کیونکہ اس میں کوئی بات خلاف واقعہ نہیں تھی۔ بس کانا پھوسی یا مناجات ان کے اختیار میں تھی اور وہ کرتے رہے اور مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اب میرا قیام لکھنؤ چند دنوں کا ہے۔

سیاسی غلطی........................

۱۹۷۴ء میں مولانا مدنی کی راجیہ سبھا کی ممبری کی مدت ختم ہوگئی۔ جلد ہی صوبائی الیکشن ہونیوالا تھا۔ مولانا مدنی کے دائیں بائیں عہدوں کے حریص چھائے پڑے تھے۔ جب الیکشن میں کانگریس نے ان کو ٹکٹ نہیں دیا تو ان تمام لوگوں نے

مولانا مدنی کو گھیرا کہ کانگریس نے ٹکٹ کی تقسیم میں ہم لوگوں کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے، اس لئے اب کی بار ہم کانگریس کا سپورٹ نہیں کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس سلسلہ میں ایک بیان اخبارات کو دیدیں۔ انہوں نے اتنا تنگ کیا کہ مولانا مدنی کو آخر ایک بیان کانگریس کی مخالفت میں دینا ہی پڑا۔ مولانا مدنی کا بیان جس وقت ہو گیا تو سید احمد ہاشمی نے دہلی سے ٹیلیفون پر مجھے مطلع کیا کہ مولانا مدنی کا ایک بیان کانگریس کی مخالفت میں شائع ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے فون پر ہی کہا کہ آپ مولانا مدنی کو روکئے کہ وہ اس طرح کا بیان نہ دیں کیوں کہ اس سے ان کی پوزیشن کمزور ہونے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے مجبور کر کے یہ بیان دلوایا ہے، مولانا مدنی کے بیان کے بعد خود ہی اس کی تائید نہیں کریں گے۔ وہ بہت بے حیا کانگریسی ہیں، وہ اپنی امیج خراب نہیں ہونے دیں گے، مولانا مدنی کے بیان کی قدر و قیمت تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب ان کے بیان کے بعد مختلف سمتوں سے اس کی تائید میں مسلسل بیانات اخبارات میں آنا شروع ہو جائیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی تائید میں ایک بھی بیان نہیں آئے گا۔ پھر ایسی صورت میں مولانا مدنی کی کیا پوزیشن ہوگی؟ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں۔ آپ مولانا سے بات کریں اور میری بات بھی بتادیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ بیان تو دہلی کے اخبارات میں آچکا ہے اب کیا ہو سکتا ہے، اس کی کاپی لیکر لکھنؤ آ رہا ہوں۔ چنانچہ دوسرے دن وہ لکھنؤ آگئے اور پریس میں دینے کی بات کہی، میں نے کہا کہ ہاشمی صاحب اس بیان کو پھاڑ کر پھینک دیجئے، آپ لوگ اس کو نباہ نہیں سکتے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی تائید میں خود جمعیۃ علماء والوں کا بھی ایک بیان نہیں آئے گا اور بعد میں مولانا مدنی خود بھی سرینڈر ہو جائیں گے۔ میں بالکل اس بیان کے حق میں نہیں ہوں، عشرت علی صدیقی ایڈیٹر قومی آواز کو جب معلوم

ہوا تو انہوں نے بھی میری بات کی تائید کی اور پرزور تائید کی، ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ یہ بیان شائع نہ کیا جائے۔ ہاشمی صاحب نے کہا کہ یہ بیان دہلی میں پریس کو جا چکا ہے۔ اگر قومی آواز میں شائع نہ بھی ہوتو پھر بھی یہ پورے ملک میں پھیل ہی جائے گا بہرحال ہاشمی صاحب نے وہ بیان پریس کو دیدیا اور اخبارات میں آ گیا۔

آخر میں وہی ہوا جو میں بار بار کہتا رہا، پورے ملک سے ایک بھی جمعیۃ علمائی لیڈر کا کوئی بیان اخبارات میں نہیں آیا نہ اس بیان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ بلکہ ایک طرح سے اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا، جن لوگوں نے مجبور کر کے مولانا سے بیان دلوایا تھا میں ان میں سے کئی ایک کے ناموں سے واقف ہوں ان میں سے کسی نے بھی اس کی تائید نہیں کی بلکہ در پردہ کانگریس ہائی کمان سے اپنی وفاداریوں کا اظہار کرتے رہے، میں نے تین چار فرضی ناموں سے تائیدی بیانات قومی آواز میں شائع کرائے مگر ہر طرف سناٹا ہی رہا۔ مولانا مدنی کانگریس ہائی کمان کے نزدیک معتوب ہو گئے۔ کانگریس والوں نے مولانا مدنی کے بیان کا زبردست نوٹس لیا اور مولانا موصوف کانگریس کی صفوں میں شک وشبہہ کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ اندرا گاندھی کی بلیک لسٹ میں مولانا مدنی کا نام بڑھا دیا گیا۔ اندرا گاندھی سیاست میں انتقام کو اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی مخالف کو برداشت نہیں کیا۔

اس کا اظہار الیکشن کے دوران نہیں ہوا۔ جب الیکشن قریب آیا تو مولانا مدنی نے اپنے بیان سے رجوع کیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا وہ معتوب کے معتوب ہی رہے۔ جب مولانا مدنی کی راجیہ سبھا کی ممبری ختم ہوئی اور ناموں پر غور ہونے لگا تو اندرا گاندھی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مدنی صاحب کو قطعی ٹکٹ نہیں دیا جائے گا۔ وہ انتقام پر یقین رکھتی تھیں۔ مولانا مدنی کو کیسے بخش سکتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود

ایک دن مولانا مدنی لکھنؤ تشریف لائے، قیام تو وہ ہمیشہ اکبری گیٹ پر کرتے تھے دفتر میں بوقت ضرورت آتے تھے وہیں سے گاڑی لی اور تنہا دفتر میں تشریف لائے اور فرمایا تیار ہوجائیے، اسمبلی ہاؤس چلنا ہے، گاڑی میں بیٹھ جائیے۔

میں چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بات مولانا نے ہی چھیڑی میں نامنیشن کیلئے چل رہا ہوں اگر چہ میرا نام فہرست میں نہیں آیا ہے لیکن میں آسام جارہا ہوں، اگر نام آگیا تو میرا فارم موجود ہوگا اور اگر میرا نام نہیں آیا تو واپسی کا فارم بھی بھر دوں گا، میرا فارم اٹھا لیجئے گا۔ ہم لوگ اسمبلی پہونچ گئے۔ فارم لیکر مولانا مدنی اس کی خانہ پری کرنے لگے میں نے دیکھا کہ کلپناتھ سامنے کھڑا ہے، وہ میرا قریب الوطن تھا۔ ایک بار پی ایس پی کا امیدوار بنا کر الیکشن بھی لڑوایا تھا اس زمانہ میں وہ بھٹہ چلا رہا تھا ابھی نوجوان تھا ہار گیا، میں نے کہا ارے کلپناتھ تم کہاں؟ میں بھی راجیہ سبھا کا فارم بھروں گا مجھے تعجب ہوا میں نے پوچھا کیسے؟ پھر اس نے تفصیل بتائی کہ الیکشن کے موقعہ پر چار مہینے میں بہوگنا جی کے حلقہ انتخاب میں رہا اور شب وروز کام کیا ہے، وہ جیت بھی گئے انہوں نے میری کارگزاریوں پر خوش ہوکر مجھے راجیہ سبھا کا ٹکٹ دلایا ہے اور فارم بھرنے آیا ہوں۔

مولانا مدنی فارم بھر چکے تھے، دستخط اردو میں کیا تو افسر نے کہا وہی نام ہندی میں بھی لکھ دیجئے، دستخط ہندی میں ہونا ضروری ہے۔ مولانا ہندی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے تھے میں نے ایک کاغذ پر   لکھدیا کہ اس کو فارم پر نقل کردیں، مولانا نے ایسا ہی کیا، کارروائی کے بعد ہم واپس چلے آئے۔ مولانا تو آسام چلے گئے، میں دفتر چلا آیا۔

مولانا نے اپنی نامزدگی کی بات شک وشبہہ کے انداز میں کہی تھی لیکن مجھے

یقینی طور پر بعض ذرائع سے معلوم ہو چکا تھا کہ اب کی بار اسی بیان کی وجہ سے جس کی میں نے بھر پور مخالفت کی تھی کانگریس کی طرف سے راجیہ سبھا کی ممبری کیلئے وہ نامزد نہیں کئے جائیں گے۔ یہ سیٹ جمعیۃ علماء کے ہاتھ سے جارہی تھی۔ اب پارلیمنٹ میں ہماری آواز اٹھانے والا کوئی نہیں رہ جائے گا۔ ۹ ربجے شب میں مجھے یک بیک یہ خیال آیا تو سوچا کہ میں اپنے طور پر ایک کوشش کروں ڈوبتے کو تنکا کا سہارا، مثل مشہور ہے۔

میں نے ایک جگہ مسز سبھدرا جوشی کا نام لیا ہے۔ وہ ایک سندھی رفیوجی خاتون ہیں۔ عمر ان کی پچاس کے قریب ہوگی۔ بہت سبک بدن، نازک اندام، گوری چٹی، خوبصورت عورت تھیں۔ ان کا ظاہر جتنا خوبصورت تھا ان کا باطن اس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ وہ پاکستانی علاقہ سے لٹی پٹی حالت میں کسی طرح جان بچا کر ہندوستان آئی تھیں، جس کا فطری نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ مسلم دشمن عورت بن جائیں جیسا کہ عام رفیوجیوں کا ذہن ومزاج بن گیا تھا، لیکن یہ عورت بڑے ظرف کی تھی۔ انہوں نے ہندوستان میں جب سر چھپانے کی جگہ بنالی تو انہوں نے ایک تنظیم ''سامپردائیکتا ورودھی سنگھٹن'' کے نام سے فرقہ واریت مخالف پارٹی بنائی اور ہندوستان میں فرقہ واریت کے خلاف ایک محاذ ایک پلیٹ فارم بنایا۔ اس کے لئے انہوں نے بڑی جانفشانیاں اٹھائیں، فساد زدہ مقامات کا دورہ کرتیں، ریلیف کا نظم کرتیں شہروں میں فرقہ واریت مخالف جلسے کرتیں، ان کے سکریٹری ڈی آر گوئل جیسا صاف دل انسان مل گیا۔ یہ دونوں جمعیۃ علماء کے رہنماؤں سے ہمیشہ بہت قریب رہے۔ ڈی آر گوئل تو کئی دنوں تک میرے دفتر میں رہے۔ مسز سبھدرا جوشی کی وجہ سے گونڈہ کے ۲۹ قتل کے ملزم مسلمان بے داغ چھوڑ دیئے گئے۔ اسی موقع پر میرا ان سے تعارف ہوا تھا میں

اس تعارف سے فائدہ اٹھانا چاہا، سوچا اگر وہ چاہیں تو راجیہ سبھا کی یہ سیٹ جمعیۃ کے قبضہ میں رہ سکتی ہے۔

میں نے بغیر سوچے سمجھے ٹیلیفون کا ڈائل گھما دیا۔ سبھدرا جی کے گھر کا ٹیلیفون نمبر میرے پاس تھا، فوراً ریسیور اٹھایا گیا۔ ایک مترنم سی آواز آئی جیسے چاندی کے کٹورے بج رہے ہوں۔ آواز آئی کون صاحب؟ میں نے کہا میں لکھنؤ دفتر جمعیۃ علماء سے اسیر بول رہا ہوں۔ مجھے سبھدرا جی سے بات کرنی ہے، جواب آیا، میں بول رہی ہوں، میں نے آداب عرض کے بعد کہا میڈم! مولانا مدنی کا نام کانگریسی امیدواروں کی فہرست میں کیوں نہیں ہے، انہوں نے کہا اسیر صاحب! میڈم اندرا گاندھی ان سے بہت ناراض ہیں۔ میں نے کہا آپ خود ان سے بات کریں، انہوں نے کہا کہ وہ اس مسئلہ پر بات کرنے کیلئے تیار نہیں۔ میں نے کہا آپ اس پہلو پر بات کریں کہ یہ سیٹ جمعیۃ علماء کی جماعت کو دی گئی تھی، مولانا مدنی کی ذاتی سیٹ نہیں ہے وہ جنرل سکریٹری تھے تو وہ راجیہ سبھا کے ممبر ہوتے رہے۔ اب ہاشمی جنرل سکریٹری ہیں اس لئے ان کا نام آنا چاہئے۔ یہ سیٹ جمعیۃ علماء کے پاس رہنے دیں۔ ورنہ پوری ایک جماعت کانگریس سے کٹ جائے گی۔ البتہ امیدوار بدل دیں۔ سبھدرا جی نے کہا آپ نے بہت اچھا سجھاؤ دیا۔ اب میں بہت پر زور طریقہ پر آپ کی بات پہونچا دوں گی۔۔ اور کل اسی وقت میں آپ کو نتیجہ سے مطلع کروں گی۔ نمبر نوٹ کروا دیں۔ میں نے اپنا فون نمبر نوٹ کرایا اور شکریہ ادا کر کے بات ختم کر دی۔

مسز سبھدرا جوشی کا اندرا گاندھی سے تعلق بے تکلف سہیلیوں جیسا تھا۔ دونوں آپس میں بہت بے تکلف تھیں جیسا کہ مجھے معلوم ہوا، اس لئے میرے ذہن میں آیا کہ عورت عورت کی بات بہت جلد مان جاتی ہے۔ اسی نقطۂ نگاہ سے اندرا گاندھی کو

راضی کرنے کیلئے میں نے ایک عورت ہی کو وسیلہ بنایا اور میرا خیال سچ ثابت ہوا، دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ تیر نشانے پر لگ گیا، سبھد راجی نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ ہاشمی کا نام لسٹ میں آ گیا میں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ دس بجے رات ہاشمی کا فون آیا کہ غازیپور عزیز الحسن صدیقی کو مطلع کر دیں کہ میرے ووٹ کا نمبر لیکر ڈی ایم سے تصدیق کرا کے لکھنؤ لیتے آئیں، تیسرے دن ہاشمی صاحب لکھنؤ آ گئے اور ان کا نام نیشن ہو گیا، مولانا مدنی کا واپسی کا فارم بھرا ہوا رکھا تھا، ان کا نام اٹھا لیا گیا۔ پھر ہاشمی ایم پی ہو گئے۔

رشک وحسد کا زہر........................

اس کامیابی پر پوری جمعیۃ علماء کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ہمارا نمائندہ پارلیمنٹ میں اب بھی موجود رہے گا، مگر معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ہاشمی صاحب کا اعزاز کچھ لوگوں کیلئے سوہان روح بن گیا، مولوی جلیل اور ان کے ہم نواؤں کیلئے ہاشمی کی جیت نا قابل برداشت صدمہ بن گئی۔ اب میرے نام کے ساتھ ان کے نام پر بھی کانا پھوسی ہونے لگی۔ اور تازہ انتقام اس طرح لیا کہ ہاشمی مرکزی جمعیۃ کے جنرل سکریٹری ہو کر بھی اپنے ماتحتوں کا وار نہ روک سکے۔ بالآخر درجہ شہادت پایا۔

بچھو رینگنے لگے........................

اپنے الیکشن کے سلسلہ میں ہاشمی صاحب لکھنؤ دفتر میں پندرہ دنوں تک رہے، نتیجہ آؤٹ ہونے کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ اب کے ٹیلیفون کا بل جو آیا وہ آٹھ ہزار کے قریب تھا۔ جبکہ اس کا بل ہمیشہ اپنے حد میں رہتا تھا کیوں کہ میں صرف شہر میں ٹیلیفون سے کام لیتا تھا۔ یا شاید کبھی کبھی دہلی دفتر کو فون کرتا تھا یا کبھی کانپور اس لئے

بل کم ہی رہتا تھا۔ جب خزانچی کے پاس بل گیا تو اس نے صدر مولوی جلیل کو مطلع کیا، انہوں نے کہا کہ یہ بل ہاشمی صاحب کے الیکشن کی وجہ سے اتنا آیا ہے۔اس لئے یہ بل ہاشمی صاحب ادا کریں یہ ان کا ذاتی خرچ ہے۔صوبہ کا دفتر یہ بل ادا نہیں کرے گا۔

حالانکہ یہ بل الیکشن کی وجہ سے اتنا زیادہ نہیں آیا تھا بلکہ اس کے دوسرے اسباب تھے ۔ ہاشمی صاحب جن دنوں لکھنؤ دفتر میں تھے انہیں دنوں ملک میں کئی مقامات پر فسادات ہوگئے ۔ ہاشمی صاحب ان مقامات کے کلکٹروں، پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں، مرکزی حکومت کے وزراء، اور اس علاقہ کے جماعتی کارکنوں کو ٹیلیفون کئے تھے۔تا کہ فسادات پر قابو پایا جائے ۔ بروقت مسلمانوں کی مدد کی جاسکے۔بحیثیت جنرل سکریٹری یہ ان کا فرض منصبی تھا۔اس لئے یہ بل بہت زیادہ بڑھ گیا۔اس بل پر اعتراض کی قطعاً گنجائش نہیں تھی ۔ مرکزی دفتر میں ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔اور کبھی اس پر اعتراض نہیں ہوا۔اگر صوبہ کے دفتر میں وہی صورت حال پیش آ گئی تو اس پر اعتراض کا کیا جواز ہے۔صوبہ کا دفتر صرف موج مستی کیلئے ہے یا قومی وملی کچھ کام بھی اس کے ذمہ ہے ۔مگر ہاشمی صاحب مجرم بنا دیئے گئے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ بل کی رقم ہاشمی صاحب نے دی یا صوبہ دفتر نے ادا کی ۔لیکن مجھے ہاشمی صاحب کا انجام معلوم ہوگیا ان کے مستقبل کی پوری تصویر میری نگاہوں کے سامنے آ گئی۔

مولوی جلیل اور ان کے قبیل کے لوگوں نے ہاشمی صاحب کے اعزاز کو برداشت نہیں کیا۔ان کا ممبر پارلیمنٹ ہونا ان کے مستقبل پر لال نشان لگا گیا۔مرکزی دفتر میں کانا پھوسی شروع ہوگئی ۔ جو وہاں کا معمول ہے ۔مولانا مدنی کے کان بھرے جانے لگے۔ہاشمی صاحب کے نخل اقتدار کی جڑوں میں کھولتا ہوا پانی مسلسل دیا جانے لگا میں نے سمجھ لیا کہ اس تناور درخت کی جڑوں میں دیمک لگ گئی ۔ یہ دیمک اس

وقت تک جڑوں کو کھاتی رہے گی۔ جب تک کہ یہ درخت پورے دھماکے کے ساتھ گز ر نہ جائے۔ میں نے ہاشمی صاحب سے لکھنو دفتر میں ایک موقعہ پر کہا تھا کہ یہ موٹے موٹے صدر سکریٹری آپ کو ایسی جگہ ماریں گے جہاں پانی نہیں ملے گا۔ چنانچہ مستقبل نے میرے خیال کی تصدیق کر دی جب ان کی راجیہ سبھا کی ممبری دو ماہ میں ختم ہونے والی تھی کہ ان پر حملہ کا بگل بجا دیا گیا اور مولانا مدنی کو مجبور کر دیا گیا کہ ہاشمی صاحب کو بلا کر کھڑے کھڑے استعفا لے لیا جائے۔ یہ قصہ بہت بعد کا ہے۔

میں نے شادی کرائی.........................

میں دفتر میں تھا کہ ایک صاحب جن کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی میرے پاس آئے مائل بہ فربہی، پیٹ قدرے نمایاں، کلین شیو، چاندی کے بال کچھ اڑے ہوئے، پینٹ اور شرٹ پہنے ہوئے تھے انہوں نے کہا مجھے اسیر صاحب سے ملنا ہے۔ میں نے کہا فرمایئے! خادم حاضر ہے۔ پھر انہوں نے سلام ومصافحہ کیا اور جب آرام سے بیٹھ گئے تو اپنا تعارف کرانے لگے، میں دس سال سے لندن میں رہتا ہوں وطن میں میرا کوئی نہیں ہے۔ پورا خاندان اجڑ چکا ہے، میں نے لندن ہی میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ اور اپنا فلیٹ بھی بنا لیا ہے۔ میرا خاندان مذہبی تھا اس لئے میں نے بچپن میں حفظ کر لیا تھا، اپنے خاندانی ذہن ومزاج کی وجہ سے لندن میں اب تک میں نے شادی نہیں کی، ورنہ وہاں تو ہر موڑ پر ایک لڑکی راستہ روکے ہوئے کھڑی مل جاتی ہے۔ میں نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ میں جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں گا تو شادی ہندوستان ہی میں کروں گا۔ اسی انتظار میں میری عمر بڑھتی چلی گئی۔ اب جبکہ میں ہر طرح مطمئن ہوں، میں ہندوستان صرف شادی کیلئے آیا ہوں۔ میں نے دو ٹکٹ واپسی کیلئے لے رکھے ہیں۔ یہاں شیخ مستنصر اللہ صاحب کے ذریعہ ایک رشتہ طے

ہو چکا ہے۔لڑکی کی عمر ۳۳ سال کے قریب ہے۔لڑکی کافی تعلیم یافتہ ہے۔یہاں ایک کالج میں لکچرار ہے۔میں آپ کے پاس اسی مسئلہ میں تعاون کیلئے آیا ہوں اور آپ کی سرپرستی چاہتا ہوں۔

میں نے چائے منگائی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا، میرا مقصد یہ تھا کہ وہ کچھ اور بے تکلف ہو جائیں اور کھل کر باتیں کریں۔تاکہ ان کو جس تعاون کی ضرورت ہے اس کی نوعیت کو سمجھ سکوں، شریف اور خاندانی آدمی چاہے جس عمر کا ہو اپنی شادی کی بات کرنے میں قدرتاً اس میں کچھ جھجک اور کچھ حجاب سا ہوتا ہے۔وہ لاکھ لندن میں رہتے تھے لیکن ذہن ومزاج تو مشرق ہی کا تھا۔یہیں کی آب وہوا، یہیں کے ماحول میں بنا تھا اس لئے وہ رک رک کر اور کچھ جھینپے جھینپے بات کر رہے تھے۔میں نے آہستہ آہستہ ان کو کریدنا شروع کیا۔

آپ نے لڑکی دیکھ لی ہے؟ کبھی کبھی بڑا دھوکا ہوتا ہے۔انہوں نے بتایا کہ ہاں میں دیکھ چکا ہوں قبول صورت ہے۔عمروں کا تناسب بھی ٹھیک ہی ہے میں نے کہا آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔اور آپ کو کیسا تعاون چاہئے؟ انہوں نے بتایا کہ میں یہاں بالکل مسافر ہوں آپ کے بارے میں جب میں نے سنا تو مجھے کچھ قربت کا احساس ہوا۔سوچا کہ آپ کو اس کام میں اپنا سرپرست بنالوں۔شادی میں بہر حال کچھ رسم ورواج ہوتے ہیں۔اس کی پابندی سماج میں ضروری ہوتی ہے۔دولہن کیلئے جوڑا بنوایا جائے گا۔بارات جائے گی۔مجلس نکاح منعقد ہوگی۔میں لکھنؤ میں ایک دم پردیسی ہوں۔یہ تیاریاں میرے اختیار سے باہر ہیں۔میں نے کہا ٹھیک ہے۔آپ صبح شام دفتر میں آتے رہیں۔میں ساری تیاریاں مکمل کرادوں گا آپ بالکل بے فکر رہیں۔جوڑے بھی بن جائیں گے۔بارات بھی شان سے نکلے گی۔بارات میں شہر

کے معززین، مشاہیر وکلا، صحافی، قومی وملی سیاسی لیڈران اور شعراء وغیرہ یعنی کریم آف سٹی (شہر کا مکھن) شریک ہوں گے وہ خوش ہو کر چلے گئے اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر گئے۔

چار بجے شام کو حمزہ آئے اور کچہری لوٹتے ہوئے خواجہ رائق ایڈوکیٹ بھی آ گئے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ میں نے آج ایک لڑکے کو متبنیٰ بنایا ہے۔ اب اس کی شادی کرنی ہے۔ آپ لوگ اس کے لئے تیار رہیں۔ پھر میں نے پوری تفصیل بتائی۔ بڑی دیر تک ہنسی دل لگی رہی، دوسرے دن وہ آئے اور جوڑے کی خریداری کیلئے مارکیٹ چلنے کی بات کہی۔ میں حمزہ کو لیکر ان کے ساتھ کپڑے کی مارکیٹ میں گیا۔ بہت سے کپڑے دیکھے لیکن میں لکھنؤ کی پسند سے واقف نہیں تھا، اس لئے تھک ہار کر میں نے کہا کہ آج خریداری نہیں ہوگی۔ اور حمزہ سے کہا کہ تم اپنی آپا کے ذریعہ جوڑے کی خریداری اور تیاری کرا دو یہ آسان ہوگا۔ اور لکھنؤ کے مزاج اور معیار کے مطابق ہوگا۔ ان کی بہن یہیں لکھنؤ میں بیاہی تھیں۔ سٹی اسٹیشن کے پاس رہتی تھیں۔ چنانچہ بڑی عمدگی سے یہ سارے کام ہو گئے۔ برات کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ اب مجھے بارات کیلئے فہرست مرتب کرنی تھی۔ حمزہ اور خواجہ رائق کی مدد سے یہ فہرست تیار کی، ان دونوں کے علاوہ مندرجہ ذیل نام لکھے گئے۔ میرے پڑوس میں ہائی کورٹ کے دو مشہور وکیل شفیق مرزا اور ظفریاب جیلانی تھے ان کے نام رکھے گئے۔ پھر آفتاب ایڈوکیٹ، نسیم ایڈوکیٹ، عشرت علی صدیقی ایڈیٹر قومی آواز، امین سلونوی داختر شجاعت علی سندیلوی، حمزہ صدیقی، اظہار احمد، عثمان غنی سب ایڈیٹر قومی آواز، حسین امین اسٹاف رپورٹر قومی آواز کے نام باراتیوں میں لکھے گئے۔ میں نے دعوتنامہ اپنے نام سے جاری کیا۔ ہر طرف سے مبارکباد کے فون آنے لگے۔ مذاق بھی چلتا رہا۔

نوشاہ کیلئے ایک کار تھی، شفیق مرزا ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کے پاس نئے ماڈل کی بڑی خوبصورت کار تھی، میں نے مرزا صاحب سے کہا بارات میں کار کی بھی ضرورت ہوگی، مجھے آپ کی کار چاہئے، انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا اسیر صاحب! آپ کے لڑکے کیلئے تو میں کار بھی دوں گا اور ڈرائیور بھی بنوں گا۔ سات بجے شام کو میں نے تمام باراتیوں کو دفتر بلایا نوشاہ کو سجایا گیا۔ شفیق مرزا بولے سہرا تو آیا نہیں۔ فوراً انہوں نے ایک آدمی پھول والی گلی دوڑایا وہ خوب موٹا پھولوں کا گجرا لے کر آیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے نوشہ کے گلے میں ڈالا اور بارات چل پڑی شفیق مرزا کی کار میں نوشاہ بیٹھ اور سچ مچ شفیق مرزا ہی ڈرائیور کی جگہ بیٹھے، باراتی پیدل تھے، بارات قریب ہی جانی تھی۔ کار دروازے پر پہونچ کر روک دی گئی۔ بارات کو گھر کی چھت پر ٹھہرنے کا نظم تھا۔ بس اس کا زینہ اسی سڑک پر تھا۔ نوشاہ اور شفیق مرزا کار سے باہر آئے کار پیچھے کر دی گئی۔ زینہ سڑک سے سیدھا چھت پر جاتا تھا اس میں موڑ نہیں تھا۔ زینہ کے دروازے پر بارات کا استقبال کیلئے دروازے کے ایک جانب رانی بخشی وزیر تعلیم حکومت اتر پردیش و پرنسپل مہیلا کالج لکھنؤ کھڑی ہیں اور دوسری جانب بیگم سلطانہ حیات صدر انجمن ترقی اردو سر وقد کھڑی ہیں۔ دونوں نے جھک جھک باراتیوں کو آداب کیا۔ اور استقبال کیا۔ زینہ روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر زینہ پر دورویہ زہرہ جبینان لکھنؤ زرق برق لباسوں میں سروقد کھڑی ہیں۔ زینہ کے دروازے سے اوپری زینہ تک دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے حوریں زینہ بہ زینہ نیچے اتر رہی ہیں۔ جگمگ کرتے ہوئے ستاروں کی کہکشاں زمین پر اتر پڑی ہے۔ یا حوریں بہشت کا دروازہ کھولے ہمارے استقبال میں کھڑی ہیں۔ پورا زینہ چاند، سورج، زحل، عطارد، مریخ اور مشتری جیسے مختلف روشنی والے ستاروں سے جگمگا رہا تھا اور آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں

۔نوشاہ کو آگے کیا گیا۔اس کے پیچھے میں اور شفیق مرزا ایڈوکیٹ تھے۔میں نے مرزا سے کہا،مرزا صاحب یہ پل صراط ہے،پل صراط سنبھل کر چلئے گا ذرا بھی دائیں بائیں آپ جھکے تو قیامت سے پہلے ٹکرا جائیں گے کیوں کہ دورویہ کھڑی زہرہ جمالوں کے کپڑے اور ریشمی غرارے ہمارے جسموں اور کپڑوں سے برابر چھیڑ کر رہے تھے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ وہ لکھنوی انداز میں اپنی حنائی انگلیوں کو ذرا خم کر کے اور قدرے لچک کر آداب بھی بجالا رہی تھیں۔

مرزا نے کہا کہ اگر یہی پل صراط ہے تو میں ساری زندگی اسی پل صراط پر گذار دینے کیلئے تیار ہوں۔اس بات پر زوردار قہقہہ برس پڑا۔اور قہقہوں کے طوفان میں یہ پل صراط پار ہوا۔بارات چھت پر پہونچ گئی۔وہاں مکلّف فرش بچھا ہوا تھا گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے، دودھ کی طرح شفاف چاندنی بچھی ہوئی تھی۔سلیقے سے تمام مہمان بیٹھ گئے۔لڑکی والوں نے گولہ گنج کے قاری ودود الحی کو بلا رکھا تھا۔نکاح ان کو پڑھانا تھا، قاری صاحب نے نکاح پڑھایا، دعا مانگی گئی۔مرزا نے کہا اسیر صاحب صاحبزادے کی شادی مبارک ہو دوسروں نے بھی آواز میں آواز ملائی، دعوت کام ودہن کے بعد بارات واپس ہوگئی۔

دوسرے دن ملنے آئے اور کہا کہ آج ہماری فلائٹ ہے۔میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے اور ولیمہ میں شرکت کی دعوت دینے آیا ہوں۔میں نے کھڑے ہو کر ان سے ہاتھ ملایا دعائیں دیں اور خدا حافظ کہا وہ چلے گئے۔ایک مہینہ کے بعد لندن سے انہوں نے چھپا ہوا دعوتنامہ بھیجا۔معلوم ہوا کہ وہ لندن میں بھی مجھے یاد رکھے ہوئے ہیں۔ پھر دفتر کے ہنگاموں میں یہ واقعہ داستان پارینہ بن گیا۔

مولانا مدنی کے بیان پر ہنگامہ.......................

مجھے لکھنؤ آئے ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے تھے۔ ۱۹۷۲ء کے آخر میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور پاکستان سے علیحدہ ہوگیا۔ گویا پاکستان کا ایک بازو ٹوٹ گیا، پاکستانی فوج کے نوے ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور ہندوستانی فوجی کے قیدی ہوگئے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے المناک واقعہ تھا۔ پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ خاں اپنی محبوبہ ترانہ کے ساتھ بادۂ وساغر میں مدہوش رہے اور بنگال میں پاکستانی فوجیوں کو شرمناک شکست اٹھانی پڑی، اس واقعہ کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر مختلف طرح کا پڑا۔ ہندوستان میں ابھی وہ نسل باقی تھی جن کی ذہنی وابستگی پاکستان کے ساتھ تھی اور اس کو قبلہ و کعبہ سمجھتے رہے۔ وہ بہت تلملائے۔ ہندوستان کی حکومت بنگال میں پاکستان کی فوج کو ذلت آمیز شکست دے رہی تھی۔ اس کے خلاف بیان دینے کی ان میں ہمت نہیں تھی وہ غم و غصہ میں بت بنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے پاکستانی فوج کی شکست کے بعد مولانا اسعد مدنی بنگلہ دیش کے دورے پر گئے اور وہاں مختلف شہروں میں گئے۔ وہاں کی جیلوں میں قیدیوں سے بھی ملے۔ جنہیں بنگالیوں نے پاکستانی کہہ کر جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ انہیں قیدیوں میں ہمارے وطن اور میرے پڑوسی ڈاکٹر انوار حسن ادروی بھی تھے۔ جو اس وقت بنگال کے سب سے مشہور سرجن تھے۔ مولانا نے ملاقات کے وقت ان کا نام اور وطن پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آپ اسیر صاحب کو جانتے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے عزیز ہیں۔ اس تعارف کے بعد مولانا مدنی نے ان کیلئے بہت سی سہولتوں کا بندوبست کیا اور ان کو رہا کرانے میں اپنے وسائل سے کام لیا۔ یہ باتیں بنگلہ دیش سے واپسی پر مولانا نے مجھے لکھنؤ میں بتائیں۔

مولانا مدنی نے بنگلہ دیش سے واپس ہونے کے بعد پریس کانفرنس میں ایک بیان دیا جو بعد میں بڑے ہنگامہ کا باعث بنا۔انہوں نے بنگلہ دیش کی تحریک کوحق بجانب بتایا کہ بنگلہ دیش نے جن حالات میں پاکستان سے علیحدگی حاصل کی ایسا کرنا بنگلہ دیش کے لئے ضروری ہوگیا تھا، جن لوگوں کی پاکستان سے ذہنی وابستگی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ان کیلئے اپنے غم وغصہ کے اظہار کا یہ بیان بہانہ بن گیا۔مولانا مدنی کے بیان کے خلاف اخبارات میں مسلسل بیانات آنے لگے۔اور کڑی سے کڑی تنقیدیں کی جانے لگیں۔ ہر جگہ نامہ نگار مولانا مدنی کو گھیرنے لگے۔مگر جمعیۃ علماء کے حلقے سے ان مخالفانہ بیانات کے جواب میں ایک سطر بھی شائع نہیں ہوئی۔

مجھے لکھنؤ آئے ہوئے ساتھ آٹھ مہینے ہو چکے تھے۔ میں قومی آواز میں کبھی کبھی لکھتا تھا میں نے ان مخالفانہ بیانات کے جواب میں ایک مفصل اور مدلل مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''بنگلہ دیش کا وجود واقعات کی منطقی ترتیب کا نتیجہ ہے'' میں نے اس مضمون کو تاریخ کے حوالے سے ثابت کیا تھا کہ پاکستان میں بنگالیوں کے ساتھ جو ناروا امتیاز برتا جاتا تھا اس کا ردعمل اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا جو آج ہوا ہے،اس پر کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون میں نے اپنے لڑکے رئیس احمد کے نام سے مصلحتاً شائع کرایا تھا۔لیکن قومی آواز کے ایڈیٹر کو معلوم تھا کہ یہ مضمون کس کا ہے۔انہوں نے رئیس احمد ہی کے نام سے چھاپا۔ مضمون بہت ہی مدلل تھا سارے سوالات جو مولانا مدنی سے کئے جارہے تھے ان سب کا تسلی بخش تاریخی واقعات کے حوالے سے جواب دیا گیا تھا۔اخبار الجمعیۃ کے مدیر نے دیکھا اور پرکھا تو پورا مضمون قومی آواز سے لیکر الجمعیۃ میں شائع کردیا۔ مرکزی دفتر سے الجمعیۃ کی کاپیاں مجھے بھیجیں۔انہوں نے سمجھا کہ اسیر صاحب کو اس مضمون کا علم نہیں ہوگا۔ ہاشمی

صاحب سے میں نے بتا دیا کہ یہ مضمون تو میرا ہی ہے مگر مصلحتاً میں نے اپنے لڑکے کے نام سے شائع کرایا ہے۔اس مضمون کے بعد تنقیدوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

اس طرح بہت سے موقعوں پر میں نے اخباری لڑائیاں لڑی ہیں اور جمعیۃ والوں کے موقف کو درست ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہیں۔اس کی یہ صرف ایک مثال ہے۔اس مضمون کے بعد مخالفین کی صفوں میں اضمحلال آ گیا اور پھر کوئی دوسرا مضمون اخباروں میں نہیں آیا۔

فعال اور متحرک دفتر ....

آزادی کے بعد سے تو جمعیۃ علماء کا دہلی دفتر انتہائی فعال رہا ہے پورے ملک کی نگاہیں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جیسے بیدار مغز لیڈر جمعیۃ کے جنرل سکریٹری تھے۔لیکن اتر پردیش کا دفتر بالکل ابتداء میں تو متحرک رہا لیکن بعد میں بے عملی کا شکار ہو کر رہ گیا۔اور صحیح معنی میں کھنڈر بن کر رہ گیا۔صوبہ دفتر کا کارروائی رجسٹر میں نے دیکھا ہے۔اس کی متعدد میٹنگوں میں مجاہد ملت شریک ہوتے رہے ہیں۔انہیں کے دور سے یہاں بے عملی شروع ہو چکی تھی۔اس کی ایک معمولی مثال یہ ہے کہ اس کی کئی میٹنگوں میں دفتر کیلئے جگہ کی تلاش پر تجویز منظور کی گئی ہے۔مگر کسی کارروائی میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کیا جد و جہد کی گئی یعنی تجویز کے پاس کرنے کے بعد رجسٹر کارروائی الماری میں بند کر کے رکھ دیا جاتا رہا۔اور صوبہ دفتر سے اس تجویز پر عمل کرنے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کرتا تھا۔اس لئے صرف رجسٹر میں دفتر کیلئے جگہ کی تلاش کی تجویز پاس کر کے رکھ دی جاتی تھی۔اور صوبہ کی جمعیۃ والوں کو پورے لکھنؤ میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۲ء تک اتنے طویل عرصہ میں کوئی جگہ نہیں ملی جب کہ جماعت اسلامی، مسلم مجلس اور مجلس مشاورت نے اسی شہر میں اچھے خاصے

دفتر بنالئے۔لیکن جمعیۃ نواب گونگے کے باغ کے کھنڈر میں مردوں کی طرح سوتی رہی ۔کوئی اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کیلئے نہیں آتا تھا۔اس میں جہاں صوبے کے عہدہ داروں کے نکمے پن اور بے عملی کا دخل ہے۔وہیں اس میں ان لوگوں کا بھی ہاتھ ہے جولکھنؤ میں اپنے کو جمعیۃ سے وابستہ کہتے تھے،وہ تو ایک دم ناکارہ تھے،وہ صرف باتوں کے طوطا مینا بنانے والے لوگ تھے۔عمل کے نام سے ان کو چڑھ تھی۔میرے لکھنؤ پہونچنے کے بعد ان میں سے اکثر لوگ میرے پاس آتے رہے۔اور تقدس مآبوں کی طرح گفتگو کرتے اور جب جب ان کو کریدا تو اندر سے ایک دم کھوکھلے نکلے ہیں، میں ان سے ایک دم بے نیاز ہوگیا۔

اگر دفتر کیلئے کوئی جگہ بھی تلاش کرلی گئی تو اس میں رخنہ اندازی کر کے بات ختم کردی جاتی تھی، میں نے وہ دفتر دیکھا ہے جسے جمعیۃ نے اپنے سرمایہ سے نادان محل روڈ پر حاصل کیا تھا وہ جگہ اچھی تھی،شاہراہ عام پر تھی،مسلم علاقہ میں تھا۔لیکن لکھنؤ کے ایک دھوبی خاندان نے اس پر ہاتھ صاف کردیا۔اس کے باوجود وہ مجھ سے وابستہ سمجھے جاتے رہے۔میں نے لکھنؤ والوں کو اتنے ہی دنوں میں خوب پڑھ لیا تھا۔اس لئے ان سے کوئی مشورہ نہیں لیتا تھا۔بلکہ بسا اوقات اپنی سرگرمیوں کی ان کو خبر تک نہیں ہونے دیتا تھا۔کیوں کہ اس میں فتور پڑ جانے کا مجھے یقین رہتا تھا۔میں نے اپنے آنے کے چند ہی مہینوں بعد دفتر کیلئے ایک شاندار جگہ مرکزی مقام پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو مرکزی دفتر نے اس پر حیرت کا اظہار کیا۔کہ اتنی جلد دفتر کا مسئلہ جو پچیسوں سال سے اٹکا ہوا تھا حل کرلیا گیا۔میں نے بہت سی آفتوں اور قیامتوں سے لڑ کر سہ منزلہ خوبصورت عمارت کھڑی کردی۔جو بہت ہی رواں دواں سڑک پر ہے۔پھر اس کے بعد دفتر کو متحرک اور فعال بنانے کے لئے مختلف تدبیریں کیں۔تیس

پینتیس ضلعوں سے مستحکم رابطہ قائم کیا۔ ہمیشہ ان کو ہدایات بھیجتا رہا، قومی و ملی سرگرمیوں کیلئے رہنمائیاں دیتا رہا یہی وجہ تھی کہ اضلاع کا جماعتی کارکن مختلف مسائل لیکر بڑے اعتماد کے ساتھ لکھنؤ آتے تھے اور میں ان کے مسائل حل کرکے ان کے اعتماد کو ہمیشہ بحال رکھنے میں کامیاب رہا۔ یہاں صرف دو تین مثالیں دیتا ہوں۔

بریلی کا ایک معاملہ........................

بریلی کے ادارہ کے رجسٹریشن کا ایک معاملہ تھا۔ ادارہ کے ایک ذمہ دار میرے پاس آئے۔اور بتایا کہ میں تین سال سے ادارہ کے رجسٹریشن کی کوشش کر رہا ہوں۔مولانا عبدالرؤف خاں کو تین چار بار زادسفر کے نام پر رقمیں دیں۔لیکن اب تک رجسٹریشن نہ ہوسکا، انہوں نے کیا کیا؟ کیا قانونی رکاوٹ رہی؟ کچھ پتہ نہیں؟ ہر بار وہ یہی کہتے کہ ابھی کام نہیں ہوا۔ میں عاجز آچکا ہوں۔ادارہ کی بہت سی رقم بھی خرچ ہوچکی ہے۔مگر ہنوز روز اول والا معاملہ ہے۔اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔خدارا آپ یہ کام کرادیں تو ادارہ پر آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

میں نے کہا آپ یہاں تین دن رکئے۔تیسرے دن رجسٹریشن سر ٹیفکیٹ لیکر بریلی جائیگا۔ان کو حیرت ہوئی کہ تین سالوں میں جو کام نہیں ہوا وہ تین دن میں کیسے ہوجائے گا، مگر میں راستہ سوچ چکا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا آپ کے پاس بائی لاز ہے۔انہوں نے بائی لاز کے نام پر کچھ مولویانہ تحریریں نکالیں۔میں نے کہا یہ سب لغو ہے۔کاغذ منگوایا، دن بھر میں بائی لاز مرتب کیا۔ پھر میمورنڈم لکھا۔اس پر سات ممبروں کی دستخط کی ضرورت تھی۔بائی لاز کے ہر صفحہ پر تین تین ممبروں کے دستخط ضروری تھے۔وہ تنہا آئے تھے، میں نے دفتر میں وہ ساتوں دستخط بنوالئے اور بائی لاز کے ہر صفحہ پر دستخط کردیئے۔دوسرے دن ان

کودس بجے دن میں لیکر رجسٹریشن آفس پہونچا جوان دنوں حضرت گنج کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ میں نے متعلقہ کلرک سے کہا یہ بائی لاز اور میمورنڈم لیجئے۔ کوئی آبجیکشن لیٹر نہیں جانا چاہئے۔ اور مجھے کل رجسٹریشن سرٹیفکیٹ مل جانا چاہئے۔ پھر بریلی کے مولوی صاحب سے کہا ان کو تیس روپئے دید یجئے۔ میں نے کلرک کو بلا کر اپنے سامنے روپے دلوائے۔ کلرک نے کہا کہ ان کو پرسوں بھیج دیجئے۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں اور میں ان کو لیکر چلا آیا۔ تیسرے دن وہ آفس آگئے۔ رجسٹریشن سرٹیفکیٹ تیار رکھا تھا وہ لے آئے دفتر میں مجھے دکھایا اور بہت بہت شکریہ ادا کر کے تشریف لے گئے۔

بہرائچ کا ایک معاملہ.........................

بہرائچ شہر میں رفاہی سوسائٹی ایک عرصہ سے کام کر رہی تھی۔ اور ورکروں میں اس کا کام ہو رہا تھا۔ غریب مسلمانوں کو قرض دیتے تھے اور سودخور مہاجنوں سے ان کو بچاتے تھے۔ بچت اسکیم بھی چلا رہی تھی۔ سوسائٹی کے چلانے والے کئی سالوں سے اس کے رجسٹریشن کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ متعدد بار اس کام کیلئے کئی وکیلوں کو بھیجا اور ہزاروں روپے ان وکیلوں پر سوسائٹی کے خرچ ہوئے مگر وہ سوسائٹی کو رجسٹرڈ نہ کرا سکے۔

بہرائچ کا ایک نوجوان لکھنؤ میں ملازمت کرتا تھا اس کی میرے دفتر میں آمد و رفت تھی۔ اس نے کہا اسیر صاحب! ہماری سوسائٹی کو رجسٹرڈ کرا دیجئے۔ ہم لوگ تھک چکے ہیں۔ رجسٹریشن کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس سلسلہ میں ہم لوگ بہت زیربار بھی ہوئے، میں نے اس سے کہا کہ سوسائٹی کے کے چند ذمہ داروں کو ساتھ لیکر میرے پاس آؤ۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے اس نے کہا کہ وکیلوں نے بہت پیسے کھائے ہیں

اور ہر بار قانونی نقص بتاتے رہے کہ بائی لاز میں یہ کمی ہے اور ہمیشہ ناکام واپس جاتے رہے۔سوسائٹی کے لوگ سخت پریشان ہیں۔ میں نے کہا کہ وکیلوں کی بات چھوڑو۔ ان لوگوں کو میرے پاس بھیج دو۔دیکھا جائے گا۔نعیم اللہ خاں صدر سوسائٹی اور ان کے ہمراہ دو نفر آئے۔میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا۔انہوں نے اب تک کی کوششوں کی پوری روداد بیان کی۔اور آخر میں کہا کہ ہر ممکن کوشش کر کے ہم تھک چکے ہیں۔انہوں نے اپنا مطبوعہ بائی لاز نکالا۔میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا، بنیادی دفعات پر غور کر کے میں نے یقین کر لیا کہ اس میں کوئی قانونی نقص نہیں ہے۔وکلاء ان حضرات کو دھوکہ دیتے رہے ہیں۔ بائی لاز مکمل تھا۔ میں نے ان کا بائی لاز لے لیا، دوسرے کاغذ پر میمورنڈم لکھا ان سے دستخط لئے، بائی لاز پر دستخط کرائے پھر میمورنڈم کو بائی لاز کے ساتھ نتھی کر دیا۔اور کہا کہ آیئے رجسٹریشن آفس چلتے ہیں۔میں ان کو لے کر حضرت گنج گیا وہی کلرک اپنی کرسی پر موجود تھا۔وہ ہندو تھا اردو زبان بالکل نہیں جانتا تھا۔اور بائی لاز اردو میں تھا۔بائی لاز پڑھ کر اس کو رپورٹ لگانی ہوتی تھی۔کہ بائی لاز میں کوئی قانونی نقص ہے یا نہیں۔ مجھے یہ معلوم تھا۔میں نے اس سے کہا کہ میں کل دن بھر بائی لاز پڑھتا رہا اور مکمل بائی لاز بہت غور سے پڑھ لیا ہے،سوسائٹی ایکٹ کے دائرے میں ہے۔اور اس بائی لاز میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے جو اس ایکٹ کے خلاف ہو۔اس پر آپ اطمینان کر لیں یا مجھ پر بھروسہ کریں۔ وہ مطمئن ہو گیا۔تو میں نے کہا کہ کوئی آبجکشن لیٹر یہاں سے ایشو نہیں ہونا چاہئے اور آپ تین دنوں میں رجسٹریشن سرٹیفکیٹ تیار کرا دیں۔حق المحنت آپ کے پاس پہونچ جائے گا۔رجسٹریشن آفس میں چھپا ہوا ایک آبجکشن لیٹر پڑا رہتا ہے۔نمبر شمار ایک قانونی نقص تحریر ہوتا ہے۔جب آپ رجسٹریشن کی درخواست بائی لاز کے ساتھ دیں گے تو وہ بائی لاز قانونی جائزہ

کیلئے اکسپرٹ کو دیدیا جاتا ہے۔اور وہ بائی لاز میں قانونی نقص نکال کر اسی آبجکشن لیٹر کے مندرجہ دفعات میں سے کسی پر سرخ نشان لگا کر درخواست دہندہ کو بھیج دیتا ہے۔پھر سوال وجواب کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔اور سالوں سال رجسٹریشن کی کارروائی میں لگ جاتے ہیں۔بالخصوص اگر بائی لاز اُردو میں ہے تو اس میں مزید وقت لگتا ہے کیوں کہ آفس میں اُردو داں نہیں ہیں۔مسلسل آفس آنے جانے سے یہ سارے نشیب وفراز میری نگاہوں میں تھے اس لئے میں نے مختصر راستہ انتخاب کیا۔

کلرک نے وعدہ پورا کیا بہرائچ کے لوگ رکے رہے۔اور سرٹیفکیٹ لیکر واپس ہوئے ۔ بہرائچ میں بڑی خوشی کا مظاہرہ کیا گیا جو کام برسوں کی جدوجہد اور ہزاروں روپیہ کی بربادی کے بعد بھی نہیں ہوا وہ کام آناً فاناً ہوگیا۔سوسائٹی کا سالانہ اجلاس اسی ماہ میں ہوا۔وہ لکھنؤ آئے اور مجھے مجبور کر کے اس جلسہ میں لے گئے ۔تمام شعبوں کا معائنہ کرایا اور بڑا اعزاز واکرام کیا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ ہر سال تقاضا کرتے ، مجھے مجبور کرتے کہ میں بہرائچ ان کے پروگراموں میں شرکت کروں ۔مگر میں دوبارہ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ان کے کسی پروگرام میں شریک نہ ہوسکا۔آج تک وہاں کے لوگ مجھے یاد کرتے ہیں ۔صدر سوسائٹی نعیم اللہ خاں تو ہمارے مخلص دوستوں میں سے ہوگئے ۔پچھلے سال علی گڈھ رابطہ کمیٹی کے ساتھ آئے تو تلاش کر کے مجھ سے ملنے میری قیام گاہ پر آئے۔

بنارس کا ایک معاملہ.........................

میں مثالاً دو تین واقعات لکھ رہا ہوں تا کہ معلوم ہو کہ مختلف النوعیت کے کام ہوتے تھے اور لوگ اپنے وسائل وذرائع محدود ہونے کی وجہ سے کتنے مجبور رہتے تھے۔ بس ایک مثال اور۔میرے کرم فرما بنارس کے مشہور تاجر مولانا منہاج احمد صاحب

مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر شمیم میرے دفتر آئے ان کو آرہ مشین لگانے کیلئے بجلی کنکشن کی ضرورت تھی۔ان دنوں مشینری کیلئے بجلی دینے پر سخت پابندی تھی۔کسی کو بھی نیا کنکشن نہیں دیا جا رہا تھا۔اس لئے وہ بنارس میں بہت دوڑ دھوپ کے باوجود کامیاب نہ ہوسکے۔تو میرے پاس لکھنؤ پہونچے۔

میں نے ان سے پوچھا یہ کام کہاں سے ہوگا؟ انہوں نے بتایا کہ ''شکتی بھون'' سے یہ اتر پردیش کا مرکزی بجلی آفس ہے۔دوسرے دن ان کو لیکر شکتی بھون گیا، شکتی بھون میں محمد مبین صدیقی تھے جو حمزہ کے بھائی تھے اور ہر اتوار کو شام چار بجے میرے دفتر آتے تھے اور دیر تک رہتے تھے۔میں نے پہلے ان سے ملاقات کرنی ضروری سمجھی تاکہ کام کا راستہ معلوم ہو، معلوم ہوا کہ ان کا آفس تیسری منزل پر ہے۔عمارت میں خودکار لفٹ ہے۔بٹن دبایا، تیسری منزل پر پہونچ کر ایک شخص سے صدیقی کا دفتر پوچھا، آپ یہاں کیسے؟ میں صورت حال بتائی تو انہوں نے کہا کہ کام تو مشکل ہے، کنکشن دینا ایک دم سے بند ہے مگر دیکھا جائے گا۔

انہوں نے فوراً ایک جگہ بیٹھ کر درخواست لکھوائی اور خود ہی لیکر متعلقہ افسر کے پاس گئے اور کہا سر! یہ میرے ایک خاص عزیز کا مسئلہ ہے۔یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔بجلی نہ ملنے کی وجہ سے بڑی مصیبتوں میں ہیں، یہ کوئی فیکٹری نہیں ہے بلکہ گھریلو صنعت ہے۔انہوں نے درخواست رکھ لی۔صدیقی نے واپس آکر کہا کہ کل آرڈر مل جائے گا، ہم خوش خوش واپس آئے دوسرے دن جا کر آرڈر لیتے آئے وہ جس کام کو ناممکن سمجھتے تھے پلک جھپکتے جھپکتے ہوگیا، ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں وہ آرڈر لیکر بنارس روانہ ہوگئے۔

میرے کام کرنے کی یہ دو تین مثالیں تھیں ورنہ چار سالوں میں بیشمار کام اسی

طرح کے مختلف محکموں اور دفتروں سے متعلق لوگ لیکر آتے تھے ۔ مجھے کہیں نہ کہیں سے رابطہ بنانا پڑتا اور خدا کے فضل سے اکثر معاملوں میں کامیابی ہوجاتی تھی جس کی وجہ سے پورے صوبہ کے جماعتی حلقوں میں میرا نام لیا جارہا تھا۔اس کے برعکس نہ کوئی صدر کے نام سے واقف تھا اور نہ جنرل سکریٹری کو جانتا پہچانتا تھالوگ اپنے اپنے گھروں پرسیوہارہ اورٹانڈہ بادلی میں رہتے تھے۔چار چھ مہینے پرتقریباً لکھنؤ آجاتے یا ذاتی ضرورت سے آتے ، جماعتی کاز کیلئے شاید ہی ان کا کوئی سفرلکھنؤ کا ہوا۔ظاہر ہے کہ اضلاع کے لوگ ان سے کیا واقف ہوتے ، پھر اخبارات میں آئے دن ان حالات پر جو بیانات شائع ہوتے وہ سب میرے نام سے ہوتے تھے ۔ میرا یہ اثر ورسوخ احباب اور جماعتی کارکنوں کے دلوں میں بڑھتا ہوا دیکھ کرصوبہ کے عہدیدار کچھ خوش نہیں تھے۔ بلکہ ذہنی اذیت محسوس کرتے تھے جمعیۃ علماء کا دفتر نیک نام ہورہا تھا، اس کی خوشی ان کونہیں تھی ۔ میرا نام ہرزبان پر کیوں ہے غصہ اس پر تھا۔مولوی جلیل سازشوں میں مستقل مصروف رہتے ،لیکن میں بے نیاز تھا۔کانا پھوسی ،مکھن بازی نہ میں نے سیکھی نہ میرے ذہن ومزاج کے مطابق۔میں گاؤں کا رہنے والا ،کام کا کھرا، نیت کا سچا تھا۔اورصرف دوسوروپئے ماہوار پراپنااوراپنے بچوں کا مستقبل تباہ کرر ہا تھا۔

حلقۂ اثر کی ایک مثال........................

اللہ کے فضل سے میرا حلقہ اثر ان دنوں خاصا وسیع تھا اس کی بھی ایک مثال سن لیجئے ۔حیات اللہ انصاری ایم پی اوران کی بیوی بیگم سلطانہ حیات انجمن ترقی اردو ہند کے واحد اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔ یہ شاندار انجمن ان کی جیبوں میں تھی اورریور بینک کالونی کے ایک فلیٹ میں قید ہوکر رہ گئی تھی ۔انجمن کے نام سے سرکاری امداد وہ حاصل کرتے ،تعلیم بالغان کے نام پر وہ حکومت سے رقم لیتے ۔کاغذ کا کونہ وہ وصول

کرتے اور اردو کاز کے نام پر صفر تھا۔ انجمن ترقی اردو ان کیلئے ایک دودھ دینے والی گائے تھی۔ اردو کے کاز کیلئے ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں تھا۔ نہ اس کے لئے کوئی سرگرمی۔ انجمن کا انتخاب ہوتا تو ضلعوں میں ان کے چند مخصوص افراد تھے جو سلطانہ حیات کے زیر اثر تھے اس لئے ہر بار وہ صدر بن جاتیں۔

ایک بار صوبے میں ممبر سازی ہوئی، گونڈہ والوں نے صوبہ کیلئے جو نمائندے منتخب کئے ان میں میرا نام بھی شامل کردیا۔ اس لئے اب کی بار صوبے کے انتخاب میں میرا عمل دخل ہوگیا۔ گونڈہ، بستی، بہرائچ جیسے اضلاع ان کے زیر اثر تھے۔ یہیں کے لوگ ان کے دست و بازو تھے۔ نانپارہ بہرائچ سے راحت علی خاں، بلرام پور گونڈہ سے حکیم منعم بجنوری، گونڈہ شہر سے حافظ عظمت علی ایک بار تینوں میرے دفتر آئے۔ یہ سب میرے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اب کی بار صدارت بدلنی ہے۔ میں نے راحت علی خاں سے کہا کہ آپ صدارت کے امیدوار ہوں گے، حکیم منعم صاحب نائب صدر ہوں گے۔ ان اضلاع کے ممبران تک یہ بات پہونچ جانی چاہئے اور تمام ممبران کو وقت مقررہ پر لکھنؤ آپ لوگ لیکر آئیں تاکہ الیکشن میں ناکامی نہ ہو۔

یہ خبر بیگم سلطانہ حیات کو ہوگئی وہ بہت پریشان ہوئیں، انہوں نے فوراً دہلی فون کرکے اپنے شوہر حیات اللہ انصاری کو بلالیا کہ ان امیدواروں سے بات کرکے ان کو توڑ لیں۔ انہوں نے لکھنؤ آکر سب سے پہلے ٹیلیفون پر مجھ سے بات کی، میں نے نہایت سادگی سے کہہ دیا کہ میں تو امیدوار نہیں ہوں، البتہ کوئی مناسب امیدوار ہوگا تو اس کو سپورٹ کروں گا۔ اب ان کی الجھن اور بڑھ گئی۔ سب سے بڑی ان کو پریشانی یہ تھی کہ اب کی بار الیکشن آفیسر ہوکر قاضی عدیل عباسی ایڈوکیٹ آرہے

تھے۔ وہ بہت اصول پسند، کھرے اور عملی انسان تھے۔ وہ انجمن کو متحرک اور فعال دیکھنا چاہتے تھے۔ اور پرانے انتخاب سے دل برداشتہ تھے۔ برسہا برس انجمن جس بے عملی کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی اس سے خوب واقف تھے، وہ چاہتے تھے کہ انجمن میں نیا خون آئے۔ اب میاں بیوی سخت پریشان ہوئے ان حالات میں بیگم سلطانہ حیات کا صدر بننا ممکن نہ تھا۔ زیادہ نمائندے مجھ سے واقف اور جو ناواقف تھے وہ مذکورہ بالا احباب کے زیر اثر تھے۔ راحت علی خاں کا صدر ہو جانا یقینی تھا۔ معلوم نہیں کیسے وہ گھبرا کر راحت علی خاں کو اپنے گھر لے گئے۔ کیا لالچ دیا؟ کون سا جال پھینکا؟ کہ وہ پھنس گئے اور اپنا نام واپس لے لیا۔ میں بہت سخت سست اور کھری کھری ان کو سنائی یہاں تک کہ وہ میرا سامنا کرنے سے کترانے لگے۔

پھر سلطانہ حیات نے مولانا اسعد مدنی کو اپنے گھر پر مدعو کیا۔ میں ساتھ تھا۔ انہوں نے مولانا سے شکایت کہ کہ اسیر صاحب ہمارے یہاں کبھی نہیں آتے۔ ہم لوگ ہمیشہ سے جمعیۃ کے ہوا خواہوں میں رہے، اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ اس وقت سے سلطانہ حیات میری طرف سے ہمیشہ اندیشہ میں رہتیں، اور اپنے یہاں ہونے والے ہر فنکشن میں مجھے مجبور کر کے لے جاتیں۔ اور اپنے دفتر میں جب کوئی پروگرام میں نے کیا اس میں پابندی سے شریک ہونے لگیں۔ پھر انجمن سے میری دلچسپی ختم ہوگئی۔ اللہ کے فضل سے میاں بیوی دونوں سے آج تک دعا سلام چلی جا رہی ہے۔

اردو ٹیچروں کی تنظیم........................

اردو ٹیچروں کی تنظیم نے مرے حلقہ تعارف کو اور وسیع کر دیا، نوجوان نسل پڑھی لکھی میرے ارد گرد آ گئی۔ مولوی جلیل نے اسی تنظیم کو میرے خلاف بطور حربہ استعمال کیا اور مولانا مدنی سے شکایت کہ کہ اسیر صاحب نے میری اجازت کے بغیر

جمعیۃ بلڈنگ میں اردو ٹیچروں کا دفتر کھول دیا ہے۔اس فرد جرم کو بار بار مولانا مدنی کے سامنے دہرایا۔

ایک بار مولوی جلیل مولانا مدنی کے ساتھ لکھنؤ آئے، دوسرے کئی صوبائی ارکان بھی اس وقت مولانا مدنی کی آمد کی وجہ سے لکھنؤ آ گئے تھے۔اور مجلس میں موجود تھے۔مولانا منہاج احمد صاحب بنارس سے پہونچ گئے تھے۔ان لوگوں کا قیام اکبری گیٹ پر سید امین کی کوٹھی پر تھا۔وہیں میرے خلاف مولوی جلیل نے سازش رچی وہ مدعی تھے اور مولانا مدنی کو آمادہ کر رہے تھے کہ اسیر صاحب سے باز پرس کی جائے، مولانا منہاج احمد صاحب میری طرف سے دفاع کر رہے تھے۔مولانا مدنی مجھ سے کسی طرح کی باز پرس کرنے کیلئے بالکل تیار نہیں تھے لیکن ان کو اتنا مجبور کیا گیا کہ وہ دفتر آئے، میں دفتر ہی میں تھا مجھ سے مولوی جلیل کے الزامات کے سلسلہ میں بات کی، میں نے جواب میں کہا اولاً تو یہ بالکل افتراء ہے کہ جمعیۃ بلڈنگ میں اس تنظیم کا دفتر ہے۔اگر ان کے پاس کوئی ثبوت ہو تو پیش کریں، ہاں میں اس تنظیم کا سرپرست ہوں، اس تنظیم کو بنانے میں میرا ہاتھ ہے۔پورا لکھنؤ جانتا ہے مجھے اس سے انکار نہیں، لیکن اس تنظیم کا باقاعدہ دفتر جمعیۃ بلڈنگ میں یہ سراسر جھوٹ ہے۔البتہ اس تنظیم کی بہت سی میٹنگیں اس ہال میں ہوئیں۔سارے اضلاع کے نمائندے یہاں آئے۔سارے پروگرام یہاں چلائے گئے، میں اس کو جمعیۃ علماء کی ایک خدمت کی طرح انجام دیتا تھا تاکہ نئی نسل جمعیۃ سے قریب ہو۔لیکن دفتری نوعیت کی کوئی چیز اس بلڈنگ میں نہیں ہے۔میں نے مولانا مدنی سے کہا کہ جمعیۃ علماء سے اس تنظیم میں کوئی مدد نہیں کی جبکہ اس کو کرنا چاہئے تھا اس کے باوجود ہر ایک کی زبان پر ہے کہ اردو ٹیچروں کی الجھی ہوئی گتھی کو جمعیۃ علماء سلجھا رہی ہے، اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی پوری جدوجہد کر رہی ہے۔

حکومت بھی یہی جانتی ہے کہ اس تنظیم کی پشت پر جمعیۃ کا ہاتھ ہے۔ گورنر بھی اس حقیقت سے واقف وزیر اعلیٰ بھی اس سے آگاہ۔حکومت کے دفاتر اور اخبارات سے وابستہ صحافی جمعیۃ کا نام لے رہے ہیں۔اردو کی حمایت میں ہم تجویزیں پاس کرتے ہیں اس کیلئے کوئی عملی قدم ہمارے دفتر نے کبھی نہیں اٹھایا میں نے عملی طور پر اردو کاز میں تعاون دیدیا تو یہ جرم کیسے بن گیا۔مولانا مدنی نے فرمایا میں یہ سب صحیح تسلیم کرتا ہوں مگر مولوی جلیل کی بات بھی رکھ لی جائے۔ مجھے بہت غصہ آیا مگر میں خاموش رہا۔ پھر وہ حضرات چلے گئے، میں نے سمجھ لیا کہ جنگ کا بگل بج چکا ہے۔حملہ کا سائرن ہو گیا۔

عرب مہمانوں کی دعوت......................

ندوۃ العلماء کی سلور جوبلی منائی جارہی تھی۔اس موقع پر اسلامی ممالک سے عرب شیوخ کی ایک بہت بڑی ٹیم لکھنؤ آئی ہوئی تھی،اس اجلاس کی بڑی شہرت تھی،کئی اسلامی حکومتوں کے نمائندے بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔اس وقت مسٹر بہوگنا اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔ان کا دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ ندوہ کے پاس گومتی کا جو باندھ تھا اس کو سبزہ زار بنانے کیلئے ایک بڑا عملہ لگایا تھا۔ بند پر دوب لگائی گئی اور اس کی سینچائی کا مستقل بندوبست کیا گیا۔وزیر اعلیٰ کی طرف سے عرب مہمانوں کو عشائیہ دینے کا پروگرام بنایا گیا۔مہمانوں کے اعزاز میں شہر کے ممتاز لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ کے حکم سے بیس دعوت نامے میرے دفتر کو بھیجے گئے۔دعوت کا پروگرام بڑا شاندار تھا۔ظاہر ہے کہ شاہی دعوت تھی۔ ہر ایک شخص کیلئے ایک مرغ مسلم کی تیاری تھی اور انواع واقسام کے کھانوں کی تیاری کیلئے شہر کے مشہور باورچیوں کو بلایا گیا تھا۔لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے یہ ساری معلومات مجھے ملتی رہتی تھیں۔دعوت نامے میں نے دفتر میں رکھ دیئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دہلی دفتر نے عرب مہمانوں کو عشائیہ دینے کا پروگرام بنایا تھا۔ دہلی دفتر کو وزیر اعلیٰ کے عشائیہ کی اطلاع نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے وہی تاریخ مقرر کی جو سرکاری دعوت کی تاریخ تھی۔ اس لئے وزیر اعلیٰ کی دعوت سے ایک روز قبل مولانا مدنی، مولوی جلیل، وفاء الرحمٰن جامعی اور مغربی اضلاع کے بہت سے جمعیۃ کے کارکن لکھنؤ آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے بتایا کہ کل وزیر اعلیٰ کی طرف سے عشائیہ دیا جا رہا ہے۔ جمعیۃ کی طرف سے دیا جانیوالا عشائیہ از خود کالعدم ہو جاتا ہے۔ ہاشمی صاحب جمعیۃ کی طرف سے چھپا ہوا دعوت نامہ شہریوں کو تقسیم کرنے کیلئے لائے تھے۔ اس پر تاریخ وہی تھی جو سرکاری عشائیہ کی تھی۔ جمعیۃ نے اپنا پروگرام دوسرے دن کیلئے ملتوی کر دیا۔ مگر مشکل یہ آ پڑی کہ اتنی جلدی دعوتنامے چھپ نہیں سکتے تھے۔ اس کی تبدیلی اس لئے ضروری تھی کہ تاریخ بھی بدل گئی تھی۔ اور ہوٹل بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ پوری ایک سطر دعوتنامے کی بدلنی تھی۔ کچھ عقلمندوں نے چاقو سے کھرچ کھرچ کر تاریخ و مقام بدلا تھا وہ اتنا بھدا اور گندہ ہو گیا کہ کسی کے سامنے پیش کرنے کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ پلاسٹک پرنٹنگ تھا۔ کھرچنے کے بعد انتہائی بدنما ہو گیا۔ مجھ سے اس الجھن کا ذکر کیا گیا۔ میں نے وہ سارے کارڈ مانگ لئے اور اپنے کمرے میں آیا کارڈ میں جتنی جگہ تھی اس کی پیمائش کر کے سفید کاغذ پر چاروں سمتوں میں لائن کھینچ کر پوری سطر خوشخط لکھ دی۔ میرا خط اس زمانہ میں اچھا تھا۔ پھر چاروں طرف کی لائن چھوڑ کر قینچی سے کاٹ لیں اور اس کو اس سطر پر چپکا دیا۔ جس کو قلمزد کرنا تھا رنگین کارڈ پر کالی لائنوں کی سفید زمین پر تحریر بلاک کی تحریر کی طرح نظر آنے لگی۔ کارڈ میں ایک نیا حسن پیدا ہو گیا۔ بیک نظر پہچاننا مشکل تھا کہ کارڈ پر کوئی چیز چپکائی گئی ہے۔ ہر ایک نے پسند کیا پھر وہی کارڈ تقسیم کئے گئے۔

وزیراعلیٰ کا عشائیہ......................

کچھ طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر اعزاز کی جگہ پہونچنے کی تاک میں رہتی ہیں، اس عشائیہ میں بھی ایسی طبیعتوں کے لوگ بے چین تھے جو حکومت کی طرف سے دیا جا رہا تھا۔ اس کے سربراہ مولوی جلیل تھے، ان کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ وزیراعلیٰ کی طرف سے دعوتنامے آئے ہیں، جو اسیر صاحب کے پاس ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے مانگے ان کا خیال تھا کہ ایک دو دعوتنامے ہوں گے اور میں اس دعوت نامہ پر چلا جاؤں گا۔ چاہے کوئی جائے یا نہ جائے۔ میں نے ان کو دس دعوت نامے اکٹھا دیدیئے جو صوبہ کے عہدیداران اور ارکان عاملہ کیلئے کافی تھا۔ انہوں نے وہ دعوت نامے ایک اپنے پاس رکھ کر بقیہ اپنے دیار کے چمچوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر اس کے بعد ان کے چند آدمی آئے۔ انہوں نے پھر مجھ سے تقاضا کیا کہ اگر کچھ دعوتنامے اور ہوں تو مجھے دیدیجئے۔ بہر حال وہ صدر تھے، اب کی بار آٹھ دعوتنامے اور دیدیئے، دو کارڈ میں نے رکھ لئے ایک اپنے لئے اور ایک حمزہ کیلئے، شام ہوتے ہوتے ان کے ملاقاتی کچھ اور آگئے، ان کو معلوم تھا کہ تھا کہ اب صرف دو کارڈ دو آدمیوں کیلئے محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ کوئی زائد کارڈ نہیں ہے، میں ان کو صاف لفظوں میں بتا چکا تھا پہلے تو وہ اپنا کارڈ پا کر خوش ہوئے تھے لیکن اپنے دو آدمیوں کو دیکھ کر مرے سر ہو گئے کہ وہ دونوں کارڈ بھی دیدیجئے۔ میں نے دیکھا کہ حرص و آز کا دیو استبداد اپنے فولادی پنجوں سے کام لے رہا ہے تو میں نے وہ دونوں کارڈ ان کے سامنے پھینک دیئے۔ اور اپنے ذہن سے وزیر اعلیٰ کے عشائیہ میں شرکت کا خیال دل سے نکال دیا۔ جب وہ عشائیہ سے فارغ ہو کر لوٹے تو بڑی رات تک ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے رہے۔ اور اپنے لئے بڑا اعزاز تصور کرتے رہے کہ ہم وزیراعلیٰ کی دعوت میں شریک ہو کر آئے ہیں۔

جمعیۃ علماء کا عشائیہ......................

دوسرے دن جمعیۃ علماء کی طرف سے عشائیہ تھا۔ میرے دفتر سے سو گز کے فاصلہ پر گلمرگ ہوٹل ہے ۔ اس کے مالک سے میرا تعارف تھا اسی ہوٹل میں 50/ روپیہ پر ہیڈ کے حساب سے معاملہ کیا گیا تھا۔ تمام کارڈ میرے پاس تھے ۔ جیسے جیسے لوگ آتے گئے مولانا مدنی کے مشورہ سے ان کو دیتا گیا۔ آخر میں میرے پاس پھر دو ہی کارڈ بچا کہ مغرب سے ذرا قبل بنارس کے حافظ عبدالکبیر صاحب اور ان کا چھوٹا بھائی عبداللہ جو دیوبند میں زیر تعلیم تھا دفتر پہونچے ۔ انہوں نے مولانا مدنی سے کہا کہ ہم لوگ عشائیہ میں کیسے شرکت کریں گے۔ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ کوئی کارڈ ہے میں نے کہا اب صرف دو کارڈ ہیں انہوں نے فرمایا کہ ان دونوں آدمیوں کو دیدیجئے ۔ باہر سے آئے ہیں ۔ میں نے بلا تکلف وہ دونوں کارڈ دیدیئے ۔

میں خود اپنی طرف سے دی گئی پارٹی میں شریک نہیں ہوا میں تنہا دفتر میں تھا ساری جمعیۃ علماء گلمرگ میں لذت کام ودہن میں مصروف تھی ۔ اپنا ہمیشہ سے یہ ذہن و مزاج رہا ہے کہ کھانے پینے کی محفلوں سے دلچسپی نہیں رہی ۔ طبیعت حساس بہت ہے ۔ ذرا بھی خودداری کو ٹھیس لگتی ہوئی محسوس ہوئی کہ میں بہانے تراش کر اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہوں ۔ مولانا مدنی ہمیشہ سید امین کی کوٹھی پر قیام فرماتے اور گھر والوں سے تو میری بے تکلفی تھی وہ بھی بضد ہو گئے کہ کھانے کے بعد جایئے ۔ درجنوں افراد جو مولانا سے ملنے آئے وہ دسترخوان پر بیٹھے مگر میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے دفتر آجاتا ۔ مجھے یاد نہیں کہ ان چار سالوں میں کبھی مولانا کے ساتھ سید امین کی کوٹھی پر شریک طعام ہوا ہوں ۔ بعد میں تو مولانا مدنی نے جب میرا مزاج جان لیا تو گھر والوں سے فرماتے یہ نہیں رکیں گے ۔ اصرار مت کیجئے ۔ اس لئے ان دونوں عشائیوں میں شرکت کا دل

میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ بعد میں نہ میں نے کبھی کسی سے اس کا تذکرہ کیا آج
میں ان واقعات کو صرف اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ آپ دفتر میں میری حیثیت اور ایثار
وقربانی کا اندازہ کرسکیں۔

لکھنؤ میں دوعیدیں........................

دفتری مصروفیات اور ناکافی تنخواہ نے کئی بار میری مسرتوں اور تمناؤں کا خون
کیا ہے۔ میں نے دوعیدیں لکھنؤ میں کیں۔ ایک بار تو میں ڈالی گنج چلا گیا وہاں اظہار
احمد کے گھر پر عید منائی اس لئے گھر کی کچھ زیادہ یاد نہیں آئی، لیکن دوسری بار جب میں
نے دفتر میں عید کا دن گذارا وہ میری زندگی کا بڑا کربناک دن ثابت ہوا۔

اپنے اہل وعیال میں عید کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ فجر سے پہلے ہی بچے
جاگ جاتے ہیں۔ باورچی خانے میں برتن کھنکنے لگتے ہیں۔ سیویاں پکائی جارہی ہیں۔
شاہی ٹکڑے بنائے جارہے ہیں، بچے اودھم مچائے ہوئے ہیں، ملکہ نور جہاں چولہے
پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اور بچوں کو بھی ہنس ہنسا کر بہلا رہی ہیں۔ دن نکلتے نکلتے
بچوں کو نہلایا جارہا ہے۔ ایک ساتھ کئی بچوں کو نہلانے کا منظر بھی بڑا ہنگامہ خیز ہوتا ہے
۔ ایک کے بدن پر صابن لگا ملا جارہا ہے کہ دوسرے نے صابن اٹھا کر چہرے پر رگڑ لیا
جب آنکھوں میں صابن جانے لگا تو وہ ہنگامہ مچائے جارہا ہے۔ خدا خدا کرکے غسل
سے فراغت ہوتی تو سارے بچے اپنے اپنے نئے جوڑے، جوتے موزے لیکر ضد کر
رہے ہیں پہلے مجھے پہلے مجھے۔ باری باری کرکے سارے بچوں کو نئے جوڑے پہنا کر
سجایا سنوارا گیا اور ان کے ہاتھوں میں عیدی کے پیسے دیکر جب فرصت ملی تو اپنے سراپا
پر نظر گئی۔ ایک گھنٹہ کی محنت کے بعد زرق برق ریشمی لباس میں وہ سج سنور کر تیار
ہوگئیں۔ ایک دن پہلے سارے زیورات صابن اور ریٹھے سے دھوئے گئے تھے۔ اور

ان میں نئی آب وتاب آ گئی تھی ۔ ناک کی لونگ اور سنہری نتھ جگمگ کر رہی رہی ہے ۔ پیشانی پر چودھویں رات کے چاند کی طرح مانگ ٹیکا کا ڈائمنڈ جھلمل جھلمل کر رہا ہے ۔ پاؤں کی پازیب نئی چمک دمک کے ساتھ نئی سینڈل اور ریشمی موزے پر بہاروں کے پھول برسا رہی ہے ۔کل چوڑی فروش عورت نے آ کر سنہری چوڑیوں سے کلائی بھر دی تھی ۔ رات میں ہتھیلیوں پر مہندی لگائی گئی تھی اب اس کا رنگ خوب نکھر گیا تھا۔ سر کا آنچل خلاف معمول آج پیشانی پر زیادہ جھکا ہوا تھا بچوں کی نظر بچا کر آہستہ سے کہا سج دھج پر تو جی چاہتا ہے کہ..................انہوں نے جھٹ سے مہندی لگا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا کہ بچے کچھ نہ سن لیں ۔ ہماری عید تو اسی وقت ہو جاتی تھی ،صرف دو رکعت عید گاہ میں پڑھنی رہ جاتی تھی ۔

لیکن جب دفتر میں عید کا دن آیا تو دل بڑا اداس تھا ،علی گڈھ یونیورسٹی کے بھیا جی دفتر میں اب بھی رہتے تھے ۔عید کے دن ہم دونوں نے معمول کے مطابق چائے پی اور ساتھ ہی مولوی گنج کی مسجد خواص میں عید کی نماز کیلئے گئے ۔نماز کے بعد ہر شخص ایک دوسرے سے مصافحہ اور معانقہ کر رہا ہے،اور عید کی مبارکباد دے رہا ہے ۔ ہم دونوں ایک طرف کھڑے ان لوگوں کے چہرے سے ابلتی ہوئی مسرتوں کو حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ بھیا جی نے کہا اسیر صاحب آیئے ہم اور آپ معانقہ کر لیں ۔ہم دونوں یہاں اجنبی ہیں ۔ پردیس میں اتنے بڑے مجمع میں رہ کر بھی تنہا ہیں ۔ ہماری طرف کوئی رخ کرنیوالا نہیں وہ لپک کر میری طرف بڑھے تو شدت ضبط کے باوجود میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔لوگوں کی نگاہیں بچا کر ہم دونوں نے آنسو پوچھے پھر بھیا جی نے کہا اب ہم دفتر نہیں چلیں گے ۔ بجھے ہوئے دل کے ساتھ دفتر کی تنہائی ناگن کی طرح ڈسے گی ۔ چاند ریسٹورنٹ نظیر آباد چلیں اس کی کونے کی میز پر بیٹھ کر اپنا

غم کچھ ہلکا کرنے کی کوشش کریں۔ چائے کی پیالی ہمارے سامنے میز پر پڑی ہوئی تھی ۔ ہمارے دل کسی طرح ان کو اٹھانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

جب دل ہی بجھ گیا ہے کیا لطف زندگی میں

میں بھی اسی طرح کے حالات سے گذرتا رہا۔ اس طرح کی قربانیاں دیتا رہا۔ اور مسلسل چار سالوں تک دیتا رہا۔ دفتر آنے والوں پر میری تنخواہ کا اکثر حصہ اٹھ جاتا تھا، لیکن میں اپنی اخلاقی قدروں کی پامالی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے ہمیشہ گھاٹے میں رہا لیکن میں مطمئن رہا۔ اس طرح کی زندگی میں دلوں کو جیتنے کا سب سے کارگر نسخہ خوش اخلاقی اور ہر ایک کیساتھ مخلصانہ تعاون اور بے لوث اور بے غرض خدمت ہے۔ میں یہ حربہ کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس لئے پورے صوبے کے جماعتی حلقے میں میرے حامیوں، دوستوں، عقیدتمندوں کی بڑی تعداد تھی کہ اگر میں سازش کرنے والوں کے خلاف کوئی اقدام کرتا تو میری پشت پر جماعتی کارکنوں کی بہت بڑی جماعت ہوتی ۔لیکن میں اب اس زندگی سے اوب چکا تھا۔ اتنی خدمات، اتنی قربانیوں کے باوجود کم ظرف لوگوں کی سازشوں کا شکار رہنا پڑ رہا تھا اس لئے میں خود بھی اس سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

آخری وار............

دہلی دفتر میں بیٹھ کر مولوی جلیل اور ان کے جیسے چند افراد نے میرے خلاف ایک سازش رچی ۔ اب لکھنؤ میں ایک شاندار دفتر بن چکا تھا۔ لکھنؤ کے مرکزی مقام امین آباد میں قیام کرنے کی ایک عمدہ جگہ ہو چکی تھی ۔ تین دکانوں سے ماہوار آمدنی ہونے لگی تھی، اب دفتر خود کفیل ہو چکا تھا اب دفتر چلانے کیلئے باہر سے چندہ کی ضرورت نہیں رہی تھی کوئی بھی باتنخواہ ملازم رکھا جاسکتا تھا۔ صوبہ کے ارکان نے نہ کبھی

کچھ کہانہ ان میں کچھ کرنے کی صلاحیت ہی تھی۔ مرکزی قیادت کے زیر سایہ نکمے لوگ صوبائی جمعیۃ پر قبضہ جمائے ہوئے تھے، سارے ناکارہ پن کے باوجود پچیس سال سے صدر اور سکریٹری اپنی کرسیوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ صرف ایک فن ان کو آتا تھا وہ تھا کاسہ لیسی، خوشامدانہ طرز عمل، اس لئے کبھی انپر بے عملی کا الزام نہیں آیا۔ اس لئے ان کو کسی ذہین تجربہ کار فعال اور متحرک آدمی کی ضرورت نہیں تھی، لکھنؤ کے اس دفتر کو اپنے اور اپنے لوگوں کیلئے سرائے بنانا چاہتے تھے، اور بنا بھی دیا۔ وفاء الرحمٰن صدیقی جنرل سکریٹری کا لڑکا بے روزگار تھا اس کو لکھنؤ میں رکھنا چاہتے تھے۔ مولوی جلیل اور جامعی دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ بس ان دونوں کو مولانا مدنی کو راضی کرنا تھا، راضی کر بھی لیا اور آنکھ بند کر کے مولانا نے ان کی تجویز پر صاد کر دیا، یہ کیوں ہوا؟ مجھے نہیں معلوم جبکہ مولانا کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی بلکہ غائبانہ ورکروں سے میری تعریف ہی کرتے رہے۔ مگر مولوی جلیل وغیرہ کے فیصلہ پر وہ کیسے راضی ہو گئے مجھے آج تک حیرت ہے۔

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

حاجی عبدالعزیز میرٹھ والے جو پرانے ۴۲۰ قسم کے آدمی تھے۔ وہ سازش کو عملی جامہ پہنانے کیلئے سرغنہ بنائے گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے میرے معاملہ میں بات کرے کیونکہ مجھ پر کوئی الزام نہیں تھا بلکہ میری چار سالہ زندگی کے حیرتناک کارنامے اتنے روشن تھے کہ دیکھے ہوئے سورج سے انکار کرنا آسان تھا لیکن میری خدمات سے انکار کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے صدر اور سکریٹری میں تو جرأت نہیں تھی اس کام کیلئے کوئی بہت بڑا بے حیا اور بے غیرت آدمی ہونا چاہئے تھا اتفاق سے ان کو مل بھی گئے۔

حاجی عبدالعزیز لکھنؤ آئے اور کہا کہ اب آپ کا دفتر سے تعلق ختم کیا جا رہا ہے، میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی زمانہ میں میں نے ایک سیمینار کا اعلان کیا تھا اس میں چند دن باقی تھے۔ اس لئے لکھنؤ میں میرا قیام ضروری تھا۔ میں ڈالی گنج میں ایک مکان کرایہ پر لیکر رہنے لگا۔ سیمینار ختم ہوتے ہی دوسرے دن میں اپنے وطن آ گیا۔ اور ہمیشہ کیلئے الوداع کہہ دیا۔

اے زمین لکھنؤ اے آسمان لکھنؤ   تجھ سے رخصت ہو رہا ہے میہمان لکھنؤ

کچھ بھولی بسری یادیں......................

میں جب تک لکھنؤ میں رہا معاشی اعتبار سے تباہ ہی رہا۔ کیوں کہ تنخواہ صرف دو سو روپے تھے۔ اس کا زیادہ حصہ باہر سے آنیوالے احباب کی ضیافت پر اٹھ جاتا تھا، اس لئے دفتر سے وابستگی میں اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو تباہ کرنے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں تھا۔ اس لئے دفتر سے علیحدگی کا میرے دل پر کوئی اثر نہیں تھا۔ البتہ ایک طرح کی سبکی ضرور تھی، جس کا مجھے شدید احساس تھا۔ اس لئے میری غیرت وخودداری کو ٹھیس پہونچی اور دل کو دکھ پہونچا۔ ملال یہ تھا کہ قربانیوں کی قدر وقیمت اور خلوص کی قیمت کو پہچاننے والا کوئی نہیں رہا۔ تجربہ یہ ہوا کہ اجتماعی زندگی سے وابستہ لوگ اس لئے ہمیشہ ناکام رہے، ساری زندگی جماعت پر لٹا دی اور فاقہ مستیوں کی زندگی گزار کر عبرتناک موت پائی۔ اس کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ کامیاب رہے جو تملق، چاپلوسی خوشامد اور زبانی جمع خرچ کے ماہر تھے۔ لکھنؤ دفتر کے تعلق سے مجھے یہی سبق ملا۔

دفتر کی علیحدگی سے تو ایک گونہ خوشی تھی لیکن لکھنؤ چھوڑتے ہوئے دل بڑا اداس تھا۔ اس کی صحبتیں، اس کی مجلسیں اس کی محبتیں اس کی عنایتیں میرے سامنے

سر جھکائے کھڑی تھیں، جیسے کوئی مہ جبیں اپنے محبوب کو با چشم نم، با زلف پریشاں رخصت کر رہی ہے، لکھنؤ ایک تہذیب ہے، ایک روایت ہے، وضعداروں کی ایک تاریخ ہے، مجلسی آداب رسم ملاقات، کورنش وتسلیمات کی اپنی ایک ادا ہے، ایک دلکش انداز ہے، زبان سے پھول جھڑ رہے ہیں، لب ولہجہ میں شہد کی مٹھاس، سامنا ہونے پر ہاتھوں کی جنبش، گردن کا خم، تبسم زیرلب کی شگفتگی کی ایک تیز خوشبو تھی جو تھوڑی دیر کیلئے دل ودماغ کو ایسا معطر کر دیتی، خوش اخلاقی، پاکیزہ وضعداری لب ولہجہ کی حلاوت، انسان کو رنگ ونور کی شبنمی فضاؤں میں پہونچا دیتی تھی۔

ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ آتے اور مجھ سے بڑی لجاجت سے کہتے کہ اسیر صاحب ہم کو لکھنؤ دکھا دیجئے۔ لکھنؤ سے جتنی حسین کہانیاں وابستہ ہیں۔ لکھنوی تہذیب کی منظرکشی اور عکاسی کتابوں میں جو موجود ہے۔ لوگ اس کو پڑھتے ہیں تو ان کے دماغ میں لکھنؤ ایک شہر کے بجائے اندرسبھا کی دربار بن جاتا ہے۔ وہ لوگ اسی لکھنؤ کو ڈھونڈھنے کیلئے یہاں آتے تھے۔ اور مجھ سے تنہائی میں خوشامدیں کرتے کہ میں ان کو لکھنؤ ضرور دکھا دوں۔

انہوں نے امین آباد دیکھا، نظیر آباد کی سڑکوں پر گھومے، قیصر باغ کی سیر کی، چھت منزل دیکھی، نوابوں کے مقبرے دیکھے، آصف الدولہ کا امام باڑہ دیکھا لیکن ان کو کہیں لکھنؤ نظر نہیں آیا۔ وہ تو اس لکھنؤ کو دیکھنا چاہتے تھے جہاں رتن ناتھ سرشارؔ، رجب علی بیگ سرورؔ سنگ یشب کی کھرل میں افیم گھونٹ رہے ہیں اور فسانۂ عجائب سنا رہے ہیں۔ ایک طرف مرزا ہادی رسوا مشہور طوائف امراؤ جان ادا سے اس کی زندگی کی چٹ پٹی داستان رچے ہیں۔ قیصر باغ میں واجد علی شاہ کا پریخانہ جہاں رہس کا میلہ لگا ہوا ہے۔ بادشاہ سلامت کرشن کنہیا بنے ہوئے ہیں، نیل پری، سبز پری، لال

پری اور ان کی سہیلیاں جوگن بنی ریشمی گیروا لباس زیب تن کئے اپنے کرشن کنہیا کی تلاش میں اپنی سیاہ گھنی اور لمبی زلفیں کندھوں پر بکھرائے، ہرائے قیصر باغ کی روشوں پر گھوم رہی ہیں اور پرسوز آواز میں گا رہی ہیں۔

کہاں ہو میرے کرشن کنیھا؟

ایک طرف بیگمات اودھ چاندی کے قبہ نما پاندان کھولے اپنے گھیر دار پیشواز میں ٹھسے سے میٹھی ہوئی زبان کی گلوریاں بنا رہی ہیں اور چاندی کے ورق میں لپیٹ کر تین حنائی انگلیوں سے بڑی ادا سے پیش کر رہی ہیں جہاں حسن و شباب کے نقرئی اور طلائی پیکر اپنے لکھنوی ناز و ادا کے ساتھ، ہندی سلام عرض کرتی ہے۔ کنیز آپ کی راہ میں نظریں بچھائے ہوئے ہے کا نغمہ جانفزا سنائی دیتا ہے۔

باہر سے آنیوالے اس لکھنؤ کی تلاش کرتے تھے جہاں گھا گھرا پہنے نئی نویلی بھٹیانیں سروں پر تانبوں کی چمکتی چمچماتی دیگچیاں رکھے ہوئے بل کھاتی کمر لچکاتی گلیوں میں اپنی سریلی اور مترنم آواز میں ''کلے پائے، کلے پائے'' کی آواز لگا رہی ہیں جیسے گلی میں بھی چاندی کے کٹورے بج رہے ہیں۔ سبزی فروش کنجڑنیں ماتھے پر بندی لگائے آنکھوں میں کاجل کی لمبی لکیریں کھینچے ہوئے سڑک پر شاہزادوں کی طرح بیٹھی ہوئی ہیں۔

لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں، ہری ہری ککڑیاں کی آواز لگا رہی ہیں۔ گلی کے نکڑ پر ٹھیلہ لگائے اس پر ایک بڑی سی دیگ میں ایک کالا کلوٹا محلّہ کا کلو حلیم بیچ رہا ہے، اپنی کریہہ آواز میں گرما گرم حلیم جو کھائے وہ پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ نخاس چوراہے پر کشمیری چائے اور گلابی چائے کا سماوار چولہے پر چڑھا ہوا ہے۔ لکھنؤ کے من چلے بنچوں پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے پیالوں میں سموسے ڈبو ڈبو کر

کھا رہے ہیں اور گلابی چائے پی رہے ہیں مرغ اور بٹیر کی پالیوں پر گرما گرم بحث کر رہے ہیں۔ ہر گلی ہر موڑ ہر چوراہے کی اپنی اپنی خصوصیات اپنی اپنی دلچسپیاں بھی ان کو دیکھ کر باہر کا آدمی احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ایک مسافر نے رکاب گنج میں سڑک پر جھاڑو لگاتی ہوئی بھنگن سے پوچھا کٹرہ بوتراب کو یہ راستہ جاتا ہے۔مسافر نے ہاتھ سے اشارہ کیا اس نے کہا راستے تو دونوں ہیں لیکن اس میں نشیب وفراز ہے۔اور وہ دور دراز، مسافر دیر تک اس کے لب ولہجہ کی حلاوت اس کے انداز بیان کی فصاحت و بلاغت پر سر دھنتا رہ گیا۔لکھنؤ سے باہر کا ادیب اور شاعر یہاں کی بھنگنوں، بھٹیارنوں، کنجڑنوں سے زبان سیکھے۔ لفظوں کی تراش خراش سیکھے۔جملوں کی ساخت لفظوں کے استعمال کا سلیقہ سیکھے، تبھی اردو زبان کا وہ شاعر یا ادیب کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔

دستار سر بازار گری.........................

میں حمزہ کے ساتھ اکبری گیٹ گیا ہوا تھا، واپسی میں نخاس روڈ پر چینی کے برتنوں کی ایک مکان پر نظر پڑی تو میں نے حمزہ سے کہا کہ دفتر کی ساری پیالیاں زخم خوردہ ہو چکی ہیں، کسی کے سامنے پیش کرنے کے لائق نہیں رہ گئیں۔اس دکان سے ایک درجن پیالیاں خرید لی جائیں۔ہم دونوں دکانوں میں پہونچ گئے۔دکان میں زمینی فرش تھا۔ہم دونوں بیٹھ گئے۔دکاندار سے چائے کی پیالیاں دکھانے کیلئے کہا، اس نے مختلف ڈیزائنوں کی بہت سی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں۔ان میں سے ایک ڈیزائن کو پسند کر کے میں نے کہا کہ اس ڈیزائن کی پیالیاں نکال دیجئے۔دوکاندار نے اس ڈیزائن کی بہت سی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ دیں۔حمزہ ہر پیالی کو دیکھ کر جو صاف ستھری اور بے داغ تھیں ایک طرف رکھ رہے تھے۔اسی دوران محلّہ کی ایک

عورت کالے نقاب میں آئی چہرہ کھلا ہوا تھا، وہ اسی فرش پر بیٹھ گئی ۔جس پر ہم بیٹھے ہوئے تھے ۔ چہرے کا شہابی رنگ تو رخصت ہو چکا تھا۔البتہ سنہرا رنگ گہرا ہو گیا تھا جو اس کی عمر کی پختگی کی علامت تھی ۔ رنگ گورا، بدن چھریرا، سبک ناک نقشہ، چہرے پر گھریلو عورتوں کی سادگی ۔سنجیدگی،عفت وشرافت تھی ۔اس کی عمر تیس بتیس سے کم نہیں رہی ہوگی ۔ وہ ہماری خریداری کو دیکھنے لگی کہ دوکاندار خالی ہوتو اپنی ضرورت کے سامان خریدے ۔ جب حمزہ ایک درجن پیالیاں الگ کر چکے تو پیالیاں میری طرف بڑھا دیں کہ ایک نظر میں بھی دیکھ لوں ، میں پیالیاں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ اس عورت نے ہاتھ بڑھا کر پیالیاں میرے سامنے سے سمیٹ کر اپنے سامنے رکھ لیں اور ہر پیالی میں انگلیاں پھرا کر اندر باہر دیکھ کر رکھتی گئی ۔اس طرح ساری پیالیوں کو دیکھنے کے بعد اس نے تین چار پیالیاں الگ کر دیں اور کہا کہ ان کو بدل لیجئے ۔ یہ ٹھیک نہیں ہیں ، میں نے ان پیالیوں کو دیکھا تو مجھ کو ان میں کوئی عیب نظر نہیں آیا تو خاتون سے پوچھا ان میں کیا خرابی ہے؟ اس نے بتایا کہ پیالیوں کے اندر ایک دو ذرات ابھرے ہوئے ہیں، پیالیوں کے دھونے میں انگلیوں میں خراش بھی آسکتی ہے،شکر ڈال کر چمچہ چلاتے ہوئے ان ذرات سے چمچہ ٹکرائے گا تو ذہن پر ناخوشگوار اثر پڑے گا۔

میں نے دل میں کہا اللہ اللہ ! پیالی میں ایک ذرہ ابھرنے پر انگلیوں میں خراش آنے کا تصور، چمچہ چلاتے ہوئے ذرے سے ٹکرانے پر دماغ پر ناخوشگوار اثر کا خیال یہ صرف لکھنؤ کی خواتین ہی سوچ سکتی ہیں، گویا ہم دیہاتی اور گنوار ثابت ہوئے ، اب مجھے شرارت سوجھی میں نے حمزہ سے کہا،تم بالکل ناتجربہ کار ہو۔تم کو انگلیوں سے دیکھ لینا چاہئے تھا ۔ میرے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک تھی ، کیونکہ میں انگلیوں کے لفظ پر خاص زور دیا تھا۔عورت مرد کا چہرہ اور آنکھیں پڑھنے میں اوراس کی

زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا پوسٹ ماتم کرنے میں بھی کمال رکھتی ہے۔ وہ بھی لکھنوی تہذیب کی پردہ دار خاتون تو اس کی اسپیشلسٹ ہوتی ہے۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ بات کا انداز لطیف مذاق اور مہذب چھیڑ کا ہے۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا ان کو ڈانٹنے سے کیا فائدہ؟ آپ تو تجربہ کار ہیں، میری دونوں کن پٹیوں کے بالوں میں سفیدی آ چلی تھی۔ میں نے اس کے نیلے گلابی ہونٹوں پر ایک ہلکے سے خم کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ اپنی مسکراہٹ پر سنجیدگی کی نقاب ڈال رہی ہے۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، مجھے اپنی چرب زبانی پر ناز تھا۔ مگر لکھنؤ کی ایک گھریلو خاتون کے صرف ایک جملے نے میرے غرور کا سر نیچا کر دیا۔ اور میرا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ دل نے کہا اسیر صاحب اپنی دستار سنبھالئے، یہ لکھنؤ ہے۔

اسے میخانہ کہتے ہیں، یہاں پگڑی اچھلتی ہے

مجھے اتنی خفت اور شرمندگی ہوئی کہ پھر اس خاتون سے مخاطب ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دکاندار سے پیالوں کو پیک کروایا اور فوراً وہاں سے چل دیئے۔ نخاس سے دفتر تک پورے راستہ میں ملک زادہ کا مصرعہ یاد آتا رہا۔

ہم سر تو بچا لائے لیکن ‏ ‏ ‏ دستار سر بازار گری

لکھنؤ کی تلاش.........................

الفاظ کی تراش خراش، طرز ادا، انداز گفتگو، موقعہ ومحل کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال، ضرب الامثال، روزمرہ محاورے کی برجستگی، یہ سب لکھنؤ کی مٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ باہر کا آدمی کتنا ہی فصیح زبان بولے لیکن قدیم لکھنؤ کی تہذیب کی پروردہ نسل کے سامنے ویسے ہی ہوتا ہے جیسے کوئی بنگالی، کوئی فوجی، کوئی انگریز اردو بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ لکھنؤ آ کر ہر آدمی سہما سہما رہتا ہے۔ زبان سے الفاظ نکالتے ہوئے ڈرتا ہے کہ

تبسم ریز لب سے کہیں خودداری وانا کی کائنات پر بجلی نہ گر جائے۔

میں ان لوگوں کو لکھنؤ کہاں سے دکھاتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے لکھنؤ دیکھا ہے۔ اور اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہ لکھنؤ نہ امین آباد میں ہے نہ نظیر آباد میں۔ نہ قیصر باغ میں ہے، نہ عیش باغ میں۔ نہ کالی داس مارگ پر ہے نہ امین آباد پارک میں، وہ لکھنؤ کشمیری بازار میں ہے۔ محمود نگر میں ہے سر کہ رانی گلی میں ہے اور چاول والی گلی میں ہے۔ وہ نخاس، وکٹوریہ گنج، پاٹا نالہ اور فرنگی محل کے آس پاس اور قدیم چوک میں ہے۔ وہ لکھنؤ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہے۔ جس طرح کسی دوشیزہ کی نازک کلائیوں کی سنہری چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں۔

شاہی محلات کی طرح کی حویلیاں کھنڈر بنی ہوئی ہیں۔ دروازوں پر ٹاٹ کا پردہ ہے، دیواروں کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی ہیں۔ کسی کمروں کی چھتیں زمیں بوس ہو چکی ہیں۔ ہر طرف اینٹوں کا نا ہنگم ڈھیر اور ملبہ سے ٹیلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن جب اسی کھنڈر سے دروازے پر پڑے ٹاٹ کے پردے سے مرزا صاحب برآمد ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ چھتر منزل سے نکل رہے ہیں۔ سفید براق چھالٹی کا پاجامہ، ململ کی سفید باریک اچکن ہلکی دو پلی ٹوپی شان کجکلاہی سے زیب سر، پمپ جوتے کی پالش میں منھ دیکھ لیجئے۔ پان کی گلوری کلے میں دبی ہوئی۔ اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر باہر آئے پھر ان کے پیچھے ایک اور چہرہ نظر آتا ہے جیسے کالی گھٹا سے چودھویں رات کا چاند نکل آیا۔ نئے انداز سے سنواری گئی زلف شبگوں نقلی سونے کی ناک میں لونگ ناک میں جھلملاتی ہوئی نقلی سونے کی نتھ۔ کانوں میں جھلمل جھلمل کرتے ہوئے سنہرے آویزے گلاب کی پتیوں کی طرح ترشے ہوئے گلابی ہونٹ جیسے گل لالہ کا سرخ رنگ نچوڑ کر دودھ میں گوندھے ہوئے سفید

میدے میں ملا دیا گیا ہے۔اور پھراس خمیر سے جو پیکر تراشا گیا ہے۔اس کا ایک مکمل نمونہ نگاہوں کے سامنے آئے گا۔حنائی انگلیوں سے ٹاٹ کا کنارہ پکڑے ہوئے کہا جا رہا ہے،کنیز آپ کیلئے چشم براہ رہے گی۔جیسے چاندی کے کٹورے بج اٹھے ہوں۔

دست خود دہان خود.........................

ایک بار دو لیڈیز ٹیچرس نے مجھے اور اظہار احمد کو اپنے گھر پر مدعو کیا۔ پاٹانالے پران کا گھر تھا۔ان کا تعلق لکھنؤ کے قدیم خاندان سے تھا۔ان کے گھر تک پہونچنے کیلئے جب سڑک سے گلی میں آئے تو گلی اتنی گندی تھی کہ پائنچے چڑھا کر گذرنا پڑا۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہو چکے اور رخصت کا پان لیا تو میں نے کہا، آپ لوگ میرے یہاں ماحضر تناول کریں۔ان کو معلوم تھا کہ دفتر میں میں اپنی فیملی کے ساتھ نہیں رہتا ہوں۔وہ میرے دفتر اردو ٹیچرس کی کئی میٹنگوں میں آچکی تھیں۔اس لئے وہ میرے حالات سے واقف ہو چکی تھیں۔میری پیشکش پر ایک نے دوسری سے کہا کہ آپ کے یہاں کون انتظام کرے گا؟ تو میرے بجائے دوسری نے خود جواب دیا تم بھی کتنی بھولی ہو، ان کا مطلب ہے۔دست خود دہان خود، ہم سب اس برجستہ جواب پر ہنس پڑے۔یہ اہل لکھنؤ کا انداز گفتگو تھا۔محاورے اور ضرب الامثال تو ان کے خانہ زاد غلام تھے۔

میری پہلی مطبوعہ کتاب کا آغاز........................

دفتر میں مشہور مزاح نگار جال پاسا بھی آئے تھے اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی بھی۔مشہور ایڈوکیٹ ظفریاب جیلانی میں اور بھیا جی بھی۔ بڑا شگفتہ علمی و ادبی ماحول تھا۔ بھیا جی تو میرے یہاں مقیم ہی ہوگئے۔یہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے

ہر دلعزیز اسٹوڈنٹ تھے۔ظفریاب جیلانی کے ساتھیوں میں تھے۔دونوں نے ایک ساتھ ایل ایل ایم کیا تھا۔یونیورسٹی کیمپس میں ان کو صرف بھیا جی کہا جاتا تھا۔وہ منصفی کے امتحان کے سلسلہ میں یہاں آئے ہوئے تھے۔لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ظفریاب جیلانی ان دنوں شیعہ لا کالج میں صدر تھے۔انہوں نے بھیا جی کو شیعہ کالج میں لکچرار رکھوا دیا۔بھیا جی برسہا برس سے گھر نہیں جاتے تھے، نہ جانے کیا مسئلہ تھا۔ جب ان کی تقرری ہوگئی تو ظفریاب جیلانی نے مجھ سے کہا کہ ان کو کچھ دنوں کیلئے دفتر میں جگہ دیدیجئے۔بعد میں مکان تلاش کر کے منتقل کر دیا جائے گا۔جیلانی میرے بے تکلف ملنے والوں میں تھے،نوجوان بہت ہی تیز وطرار اور ذہین آدمی تھے،اور بہت ہی خوش اخلاق میرے زمانے میں ان کی بارات بلگرام گئی جس میں میں بھی شریک تھا۔ شہری جمعیۃ علماء کا ان کو جنرل سکریٹری بنا دیا گیا تھا اس لئے میں نے ان کے اصرار پر اپنے ساتھ دفتر میں رکھ لیا۔

بھیا جی بڑے شریف اور کم سخن آدمی تھے۔لغویات اور فضول باتوں سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ چھ مہینے دفتر میں رہ گئے،اور کوئی مکان نہ مل سکا۔ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔اس زمانہ میں مجھے ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔اظہار احمد نے اس موضوع پر ایک مختصر سا کتابچہ جو انگریزی میں تھا مجھے لاکر دیا اور کہا کہ یہ گورنمنٹ ریکارڈ کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔اس میں آپ کے موضوع سے متعلق بہت سی باتیں ہیں، میں نے وہ کتابچہ لے لیا اور بھیا جی سے کہا کہ آپ مجھے اس کا ترجمہ لکھوا دیں۔ان کو فرصت ہی فرصت تھی۔صبح چائے کے بعد وہ ایک گھنٹہ کتاب سامنے رکھ کر ترجمہ کرتے جاتے اور میں نوٹ کرتا جاتا۔اس طرح پوری کتاب کا ترجمہ جب مکمل ہوگیا تو میں نے اپنی کتاب لکھنا شروع کی اور

تین چار ہفتوں میں مکمل کر لی، کیونکہ اس موضوع سے متعلق میٹر اور مواد بہت پہلے سے جمع کرتا آرہا تھا۔صرف اس کو مرتب کرنا تھا۔مسودہ کی ایک نقل اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ میں داخل کر کے اشاعت کیلئے امداد کی درخواست دیدی۔ یہ امداد منظور ہوگئی مگر اس کی اطلاع مجھے اس وقت ملی جب میں لکھنؤ چھوڑ کر وطن آچکا تھا۔اس لئے یہ امداد میرے لئے بیکار تھی، کیونکہ میں اس کو شائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔اس لئے میں نے امداد نہیں لی، وہ کتاب جب میں بنارس آیا تو مولانا وحید الزماں کیرانوی نے دیوبند سے شائع کیا۔

اپنے وطن میں.......................

میں لکھنؤ سے اپنے وطن ادری آ گیا۔ذہن میں یہ بات تھی کہ جس مدرسہ دارالسلام کو خون پسینہ ایک کر کے قائم کیا ہے اس کو ترقی دینے میں اپنی زندگی لگا دوں گا۔میں نے آتے ہی اس کا سارا نظام سنبھال لیا۔رفیق قدیم مولانا محمد قاسمی اب بھی ناظم اعلیٰ تھے۔ایک کمرہ درست کرا دیا۔اور سارا دفتری نظام اس میں سمیٹ لیا۔ اور پورا وقت مدرسہ میں دینے لگا اب تک عربی سوم تک تعلیم تھی، جماعتیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ میں نے زیادہ طلباء کے داخلہ کا نظم بنایا۔اور معیار تعلیم کو درجہ پنجم تک بڑھا دیا۔انتظامی مصروفیات کے باوجود ایک سبق دیوان متنبّی کا اپنے ذمہ لے لیا۔ مدرسہ میں نئی زندگی آگئی۔چہل پہل بڑھی ایک دو اساتذہ کا اضافہ کیا تقریباً ڈیڑھ سال تک مسلسل دارالسلام کو آگے بڑھانے میں شب و روز مصروف رہا۔

۱۹۷۷ء کے آخر میں ایک دن جب میں صبح کو مدرسہ پہونچا تو دیکھا کہ ایک بھاری بھرکم با وقار وجیہ کوئی مولانا تشریف فرما ہیں۔سلام و مصافحہ کے بعد تعارف میں معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبدالمتین صاحب قاسمی بنارسی ہیں۔ میں ان سے

متعارف نہیں تھا، ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی، پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہوگیا کہ وہ گفتگو کا فن خوب جانتے ہیں۔ مقصد سفر پوچھا تو ایک لمبی تمہید کے بعد کہا کہ آپ کو بنارس چلنا ہے۔ میں نے کہا سفر مقصد نہیں ہوتا، مقصد کا ذریعہ ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے مقصد سفر پوچھا ہے۔ بنارس کیوں چلنا ہے؟ میری وہاں کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے بتایا کہ حافظ عبدالکبیر صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ اور آپ سے کچھ صلاح ومشورہ کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرے دن میں بنارس گیا۔ حافظ عبدالکبیر صاحب سے ایک دو بار کی ملاقات تھی۔ ایک ملاقات تو لکھنؤ میں ہوئی اور ایک ملاقات بنارس میں خود ان کے مکان مدنی منزل میں ہوئی۔ میں خود ایک میٹنگ کے سلسلہ میں ایک ہفتہ مدنی منزل میں رہا۔ اس لئے ایک حد تک ہم دونوں متعارف تھے۔ وہ مدرسہ جامعہ اسلامیہ میں ملے اور مجھے لیکر ایک استاد مولانا ظفر احمد کے کمرے میں آئے۔

انہوں نے کہا کہ جامعہ اسلامیہ میں آپ کی ضرورت ہے آپ یہاں مستقل رہ جایئے، ہماری یہ دلی خواہش ہے، میں نے کہا میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟ آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ میں تو ایک سیاسی ورکر قسم کا آدمی ہوں ساری زندگی سیاست میں گذری، میں آپ کے مدرسہ کیلئے بیکار آدمی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہاں سے ایک اچھا رسالہ نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کام کیلئے ہم کو آپ کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ایک منصوبہ ہے۔ معلوم نہیں رسالہ نکل سکے گا یا نہیں اور میں اس وقت تک یہاں بیکار رہوں گا۔ درس تدریس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اور میں اس کام کے لائق بھی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں وبال دوش ہوجاؤں گا، یہ خطرہ تو مجھے ہمیشہ لاحق رہے گا، انہوں نے آخری بات یہ کہی کہ آپ

یہاں کچھ نہ کریں، مگر آپ یہیں رہیں گے۔ ہم آپ کو معقول تنخواہ دیں گے۔

ابھی یہ گفتگو چل رہی تھی کہ ہندو مسلم فساد کی بہت تیز افواہ چل پڑی۔ انہوں نے کہا کہ آپ فوراً بذریعہ بس واپس چلے جائیں، ابھی فساد شہر میں نہیں پھیلا ہے۔ جب شہر میں امن وامان ہوجائے گا تب آیئے گا۔ میں عجلت میں اٹھا مولانا ضمیر احمد صاحب جلال پوری اور مولانا افتخار احمد صاحب دونوں حضرات اس وقت جامعہ اسلامیہ میں موجود تھے۔ فساد کی خبر سے وہ بھی پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ میں ان دونوں حضرات کے ساتھ فوراً بس اسٹیشن آیا اور فوراً بس مل گئی اور ہم لوگ حدود بنارس سے باہر ہوگئے۔ پھر پتہ نہیں بنارس پر کیا گذری۔

بنارس سے واپس آکر میں پھر حسب معمول مدرسہ دارالسلام کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ اور دو ماہ تک میں نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ نہ بنارس سے کوئی خبر آئی۔ دو ماہ بعد جامعہ اسلامیہ کے ایک مدرس مولانا حبیب الرحمٰن جگدیش پوری جو آج کل دارالعلوم دیوبند میں ہیں، حافظ عبدالکبیر صاحب نے ان کو ادری بھیجا کہ اسیر صاحب کو ساتھ لیکر آئیں۔ میں ان کے ساتھ ۴؍فروری ۱۹۷۸ء کو جامعہ اسلامیہ بنارس آگیا۔ جس کو اس تحریر کے وقت سولہ برس ہو چکے ہیں۔ تب سے بنارس میں مقیم ہوں۔

بنارس میں زندگی کے شب وروز

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں سولہ برس سے بنارس میں اقامت گزیں ہوں، یہ ایک لمبی مدت ہے، سولہ برس میں ایک بچہ پیدا ہوکر جوان ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس لمبی مدت میں بھی بہت سے نشیب وفراز سے گذرا ہوں گا، مختلف نوعیت کے مسائل سامنے آئے ہوں گے، جو زندگی ہمیشہ موج وتلاطم میں گذری ہے وہ ایک دم سکون آشنا کیونکر ہوسکتی ہے، انسان اگر حساس ہے، رویوں کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتا ہے، لب ولہجہ کے انداز کو پہچانتا ہے، وہ کبھی بے فکری اور سکون کے ساتھ نہیں رہ سکتا، بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میری طبیعت انتہائی حساس ہے، میں زندگی کے واقعات کو سرسری قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوسکتا، میری غیرت وانا کو ذرا ٹھیس لگی تو میں چونک اٹھتا ہوں، میں اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتا، دل ودماغ میں قدرت نے جو روشنی دی ہے میں اس روشنی سے زندگی کی راہوں میں کام لیتا ہوں، یہ میری زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے، میں اس سے دست کش کیسے ہوسکتا ہوں، اس لئے میں یہاں مختلف منزلوں سے گذرا ہوں یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں آج آپ کو سنانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری

بنارس کی زندگی کی داستان کا صرف ایک پہلو میں یہاں ذکر کروں گا، اور وہ میری تصانیف سے متعلق ہوگا کیونکہ میری ساری کتابیں اس سولہ برس کی مدت میں شائع ہوئی ہیں، بنارس بلکہ جامعہ اسلامیہ میری علمی سرگرمیوں کی سرزمین ہے اس نے

مجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ میں ان احسانات کا بوجھ اپنے کندھوں سے اتار نہیں سکتا، اس سے پہلے میری کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، البتہ ہزارہا صفحات کے مضامین لکھے جو اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے لیکن کتاب کے سلسلہ میں میری بدقسمتی میرے ساتھ لگی رہی، میرے چار مسودے جو کسی وقت مجھے بہت عزیز تھے وقت اور حالات کی تیز آندھی میں اُڑ گئے، اب ان کتابوں کا ایک ورق بھی میرے پاس نہیں ہے۔

(۱) ''**غدارانِ وطن**'' قیام لاہور کے زمانہ میں لکھی گئی، جو دوسو صفحات پر مشتمل تھی۔

(۲) ''**کمیونزم تجربات کی کسوٹی پر**'' یہ تین سو صفحات سے زائد میں تھی، جس کے کچھ اجزاء رسالہ ''نقش'' دیوبند میں شائع ہوئے، لیکن پھر مسودہ غائب ہو گیا۔

(۳) ''**نشیب وفراز**'' میرے افسانوں کا مجموعہ تھا، افسانے بہت سے رسالوں میں شائع ہو چکے تھے، ایک ناشر کو مسودہ ڈاک سے بھیجا لیکن مرسل الیہ تک نہیں پہونچا، میرے پاس نقل نہیں تھی۔

(۴) ''**رودادِ قفس**'' میری زندگی بھر کی شاعری ان اوراق میں دفن ہوگئی، پورا مجموعہ کلام کب اور کہاں گم ہو گیا اس کی گمشدگی کا قصہ بھی یاد نہیں۔

پانچویں کتاب میں نے قیامِ لکھنؤ کے زمانہ میں لکھی تھی، کتاب کا نام ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار'' ہے، یہ مسودہ ڈھائی برس میرے پاس گرد کھاتا رہا اور شاید اس کا بھی وہی حشر ہونے والا تھا جو میرے چار مسودوں کا ہوا مگر اسی دوران میں بنارس آ گیا، مسودہ میرے ساتھ تھا، یہاں مولانا وحید الزماں کیرانوی سے اس کا تذکرہ آیا تو انھوں نے مجھ سے مسودہ لے لیا اور چار مہینے بعد وہ کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آ گئی، یہ میری پہلی مطبوعہ کتاب تھی جس پر اتر پردیش اردو اکیڈمی سے مجھے ایک ہزار کا انعام ملا، میری تصانیف کی فہرست یہ ہے۔

(۱)　''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار''
پونے چارسوصفحات پر مشتمل ہے۔
(۲)　''تفسیروں میں اسرائیلی روایات''
قیام بنارس کے دوسرے سال میں نے یہ کتاب مرتب کی ، یہ کتاب بھی دیوبند سے شائع ہوئی جو بڑے سائز کے پونے چارسوصفحات پر مشتمل ہے، کتاب مقبول ہوئی، ابھی چند مہینے ہوئے کیرالہ کے ازہر کالج سے وابستہ ایک اسکالر نے اس کا ملیالم زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی، میں نے اجازت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔
(۳)　''تاریخ جمعیۃ علماء ہند''
یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو بڑے سائز کے ۵۰۰/صفحات پر مشتمل ہے، جس میں تحریک آزادی کی اجمالی تاریخ آ گئی ہے،اس کی تصنیف کی مختصر کہانی یہ ہے۔
جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے تاریخ جمعیۃ علماء ہند کو مرتب کرا کے شائع کرنے کی تجویز پاس کی، مرتب کو دس روپیہ فی صفحہ کے لحاظ سے رائلٹی دینے کا فیصلہ کیا گیا، مولانا وحیدالزماں کیرانوی میٹنگ میں موجود تھے، جب مرتب کے نام پر غور ہونے لگا تو انھوں نے میرا نام پیش کر دیا جو اتفاقِ رائے سے منظور ہو گیا، میں نے ۶/ ماہ کی مدت میں کچھ دہلی دفتر میں بیٹھ کر اور کچھ بنارس میں رہ کر کتاب لکھ دی اور مجھے رائلٹی کے دو ہزار روپے دیئے گئے، کتاب لیتھو پر غلط سلط بغیر پروف ریڈنگ کے عجلت میں شائع کر دی گئی، ۱۹۸۳ء میں بمبئی میں جمعیۃ علماء ہند کا آل انڈیا اجلاس ہوا، اس اجلاس کے موقعہ پر مولانا مدنی کے ہاتھوں اس کی رسم اجراء ادا کی گئی، جتنے نسخے کانفرنس میں گئے تھے وہ ایک ایک کر کے بک گئے ، بقیہ پورا ایڈیشن دو ماہ کی قلیل مدت میں ختم ہو گیا۔

دوبارہ آفسٹ کی کتابت کرائی گئی جو ۸۰۰ر صفحات میں آئی، اس کی اشاعت کا موقعہ ابھی نہیں آیا تھا کہ مولانا وحیدالزماں کیرانوی جمعیۃ علماء ہند سے علیحدہ ہو گئے، اور کتابت شدہ مسودہ جمعیۃ علماء کے مرکزی دفتر کے حوالہ کر دیا گیا جو آج بھی دفتر میں موجود ہے، دوبارہ اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے جبکہ کتاب کی مانگ بہت دنوں تک رہی، اس کے کچھ اسباب ہیں جن کا اظہار جرم گردن زدنی ہے۔

(۴) ''مآثر شیخ الاسلام''

مولانا سید حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی ذاتِ گرامی سے سیاسی راہ سے عقیدت تھی، ان کی ذات اپنے دور میں ایسی تھی کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کا بس چلتا تو ان کی بوٹی بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دیتا، اتنا بغض اور اتنی عداوت رکھتا تھا۔ دوسرا طبقہ ان کے جاں نثاروں اور فداکاروں کا تھا، وہ ان کی راہوں میں دیدۂ و دل فرش راہ کرنے کیلئے تیار تھا اور عقیدت کے پھول نچھاور کر رہا تھا، ان کے زہد و تقویٰ کے گن گاتا تھا اگر اس کے بس ہوتا تو اپنی عمر کا کچھ حصہ ان کی نذر کر سکتا تھا۔

میں نے ان کی ایک مکمل سوانح حیات لکھی جس میں اس دور کی پوری سیاسی تاریخ آ گئی ہے، کتاب کا مسودہ دو سال تک مولانا اسعد مدنی کی خدمت میں رہا، میں اس کو ''الجمعیۃ بکڈپو'' سے شائع کرانا چاہتا تھا کیونکہ حضرت شیخ الاسلام زندگی بھر اس جماعت کے صدر رہے، دو سال کے طویل انتظار کے بعد خطرہ پیدا ہوا کہ مسودہ گم نہ ہو جائے تو میں خود دیوبند گیا اور مسودہ حاصل کر کے مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے حوالے کیا، اسی مسودہ کو دیکھنے کے بعد ان کو ''دارالمولفین'' قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، پھر وہ ادارہ قائم ہوا، اس ادارہ کی سب سے پہلی کتاب یہی ''مآثر شیخ الاسلام'' ہے جو

ملک میں بیحد مقبول ہوئی، فوٹو آفسٹ پر چھپی ہے اور ۵۰۰؍صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں لکھنؤ کی فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی نے دس ہزار روپئے کی امداد منظور کی مگر اس کے چند صفحات نکال دینے کی اس نے شرط لگائی، میں نے رقم لینے سے انکار کر دیا، ان صفحات کا نکالنا مجھے منظور نہیں تھا۔

(۵) ''فن اسماء الرجال''

(۶) ''تاریخ طبری کا تحقیقی مطالعہ''

یہ دونوں کتابیں بھی دار المولفین دیوبند سے شائع ہوئیں جو فوٹو آفسٹ پر ہیں، کارڈ بورڈ کے ٹائٹل ہیں جو خوبصورت ہیں، ایک کتاب ۱۵۷؍صفحات کی ہے اور دوسری کتاب اس سے کچھ زائد صفحات کی ہے۔

(۷) ''تحریک آزادی اور مسلمان''

یہ کتاب در حقیقت میری پہلی کتاب ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار'' میں ترمیم، حذف و اضافہ اور نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، اس میں کچھ مضامین کا اضافہ بھی ہے، فوٹو آفسٹ کی طباعت، عمدہ جلد اور خوبصورت گرد پوش کے ساتھ شائع ہوئی، اس کی مقبولیت کا یہ حال ہوا کہ امریکن کانگریس نے واشنگٹن کی پچاس لائبریریوں کیلئے اس کے نسخے خریدے اور مجھ سے میرا بایوڈاٹا مانگا، کٹیلاگ کس نام سے بنایا جائے مجھ سے میری رائے مانگی۔

(۸) ''شرح دیوان متنبیّ''

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ دیوان متنبیّ کی اردو شرح ہے، جس میں فصیح اور با محاورہ اردو میں ترجمہ، مطلب اور تشریح لغات ہے، ابتداء میں ۴۸؍صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے جس میں متنبیّ کے حالات کے علاوہ اس کے کلام پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے

اوراس کے کلام کی خصوصیات کوشمار کرایا گیا ہے، یہ شرح اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے اب تک دسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تمام مدارس عربیہ اور یونیورسٹیوں کے شعبہ عربی کی لائبریریوں میں یہ کتاب پہونچ چکی ہے۔

(۹) ''دارالعلوم دیوبند: احیاءِ اسلام کی عظیم تحریک''

۵۰۰ رصفحات پر مشتمل ہے، کتاب میں علماء دیوبند کی مذہبی ودینی خدمات کی پوری تاریخ ہے، اس کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ناقابل فراموش تاریخ سے کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں تبلیغ عیسائیت کی پوری کہانی، پھراس کے خلاف محاذ آرائی کا ذکر کیا گیا ہے، پھر آریہ سماج فتنہ کی تاریخ اوراس کا کس طرح مقابلہ کیا گیا، اس کا تذکرہ ہے، قادیانیت کے خلاف کیسے کیسے مورچہ بندی کی گئی، شیعیت نے اسلامی معاشرہ کوکس طرح اپنے زہر سے متاثر کررکھا تھا، اس کی تفصیلی داستان اور پھراس کا جس طرح علاج کیا گیااس کی تفصیل ہے، اس کے بعد بدعات وخرافات، رضاخانی جماعت کی ولادت اوراس کے عہد شباب کی کہانی، پھران کی فتنہ سامانیوں سے جس طرح ملت اسلامیہ کومحفوظ کیا گیااس کی مفصل تاریخ ہے، آخر میں تبلیغی جماعت کی اجمالی مگر جامع تاریخ دیدی گئی ہے، کتاب آفسٹ پر چھپی ہے، کارڈ بورڈ کا خوبصورت کور ہے، کتاب پسند کی گئی اور مقبول ہوئی۔

(۱۰) ''معجم رجال بخاری''

تین سال کی شبانہ روز مشقت کے بعد مرتب کی گئی ہے جوفل اسکیپ سائز کے ایک ہزار صفحات میں آئی ہے، جس میں بخاری کے ہرراوی کا مختصر تعارف اوراس کی تمام روایتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ صحیح بخاری میں اس کی کہاں کہاں روایتیں اورکس درجے کی ہیں، ابھی غیرمطبوعہ ہے، پاکستان کے ایک ناشر کے

پاس جاچکی ہے۔

(۱۱) ''دبستانِ دیوبند کی علمی خدمات''

اس کتاب میں دبستان دیوبند کے علماء کی علمی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے، یہ کتاب ابھی صرف قرآنیات اور حدیث وعلوم الحدیث کی تصنیفات تک محدود ہے، مگر کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کے ترجمہ وتفسیر اور اصول تفسیر، حدیث اور اصول حدیث وشروح حدیث کی جتنی کتابیں ہیں ان کا تعارف آجائے، تقریباً سواسو تصانیف، ان دونوں موضوعات پر آگئی ہیں، ناشر کے پاس کتابت ہوچکی ہے۔

(۱۲) ''کاروانِ رفتہ'' تذکرۂ مشاہیر ہند

پونے تین سوصفحات پر مشتمل ہے، کتاب میں ۴۶۷ر مشاہیر کا مختصر مگر جامع تعارف مع سال ولادت اور سال وفات پوری تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے، فوٹو آفسٹ کی کتابت ہوچکی ہے، ناشر کے پاس طباعت کے انتظار میں ہے۔

(۱۳) ''مولانا قاسم نانوتوی: حیات اور کارنامے''

حضرت نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند کی ایک باضابطہ سوانح ہے، ان کے بچپن سے لے کر وفات تک کے حالات تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، ان کی تمام تصانیف کا مفصل تعارف کرایا گیا ہے اور ان کے مباحث سے رُوشناس کرایا گیا ہے، یہ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوچکی ہے۔

(۱۴) ''مختصر تاریخ اسلام''

یہ کتاب مولوی کے امتحان اور پرائمری درجہ پنجم میں پڑھانے کیلئے لکھی گئی ہے جس میں انتہائی اختصار مگر جامعیت کے ساتھ عہد رسالت اور خلفاء راشدین کی تاریخ آگئی ہے، اس کا ایک جز شائع ہوچکا ہے، اس کا دوسرا جز خلفاء بنوامیہ اور

تیسرا جز خلفاء بنوعباس کے حالات پر ہے، یہ دونوں ابھی طبع نہیں ہوئے، کتابت شدہ فرمے موجود ہیں۔

(۱۵) ''گلزار تعلیم''

لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہے جو درجہ ۹ اور درجہ ۱۰ میں پڑھائی جاتی ہے، کتاب ایک سو صفحات کی ہے، بعض اسکولوں میں داخل نصاب ہے۔

''ترجمان الاسلام'' (سہ ماہی)

یہ جامعہ اسلامیہ بنارس کا ایک علمی و تحقیقی سہ ماہی رسالہ ہے، میں اس کا مدیر بھی ہوں اور اس کے دفتر کا چپراسی بھی ہوں، دونوں کام پوری دلچسپی اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کرتا ہوں، یہ مالی اعتبار سے گھاٹے کا سودا ہے لیکن جامعہ اسلامیہ کے مرعوب کن تعارف کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے جس میں صرف نفع ہی نفع ہے، کسی ادارہ کا ملک میں معتبر ہوجانا بہت بڑا سرمایۂ افتخار ہے، اس رسالہ نے جامعہ اسلامیہ کو یہ سرمایہ وافر مقدار میں بہم پہونچایا ہے،، ہندوستان کے مشاہیر اہل علم تحقیق کی خدمت میں پابندی کے ساتھ مفت بھیجا جاتا ہے، تمام قابل ذکر اسلامی مدارس، تمام یونیورسٹیوں کے ممتاز اہل علم اور مصنفین کی خدمت میں جارہا ہے، رسالہ کا ایک علمی و تحقیقی معیار ہے، دیوبندی مکتبہ فکر کے سارے رسالوں میں اس کو کئی اعتبار سے امتیاز حاصل ہے، اس کے دو خاص نمبر شائع ہوچکے ہیں، ایک ''حدیث نمبر'' اور دوسرا ''مولانا اعظمی نمبر'' دونوں نمبروں کو اچھی مقبولیت حاصل ہوئی، اب اس کی اشاعت کا پانچواں سال پورا ہورہا ہے۔

جامعہ اسلامیہ.......................

میں ۴؍فروری ۱۹۷۸ء کو جامعہ اسلامیہ آیا، اب اس کو سولہ برس ہورہے ہیں، اس دوران اس ادارہ نے جو مجھے ذہنی وفکری سکون دیا، جو عزت ومحبت دی جو

سہولتیں اور آسانیاں فراہم کیں وہ میرے تصور سے بھی ماوراہے، اس کے جملہ شعبوں میں ، انتظامی مسائل ہیں ، اہم تقریبات میں حتیٰ کہ سماجی ومعاشرتی امور میں میری رایوں اور مشوروں کو شرف قبولیت دے کر مجھے جو اعزاز اور احساسِ فخر دیا اس نے مجھے اس ادارہ کا ہمیشہ کے لئے ممنونِ احسان بنادیا۔

میری علمی زندگی اس ننھے پودے کی طرح تھی جس پر بھاری چٹان پڑی ہوئی تھی ،اس کی نشو ونما کے سارے راستے بند تھے، یہاں اس کی نشو ونما کے لئے کھلی فضا اور حیات بخش آب وہوا نصیب ہوئی اس نے تناور درخت کی شکل اختیار کرلی ، یہ صرف جامعہ اسلامیہ کا احسان ہے ، میں نے یہاں پڑھایا کم پڑھا زیادہ ، جامعہ اسلامیہ کی لائبریری ، میرے لئے چشمۂ حیواں ثابت ہوئی ،جس نے مجھے علمی زندگی دی ،اس لائبریری کے بنانے میں احباب کے ساتھ تھوڑی بہت میری کاوشوں کا بھی دخل ہے، آج یہ لائبریری علمی وتحقیقی مرکز بن گئی ہے، اسلامیات کے موضوع کے کسی پہلو پر اعتراض کرنے والوں کی مدافعت کے لئے یہاں ہر طرح کے وسائل موجود ہیں ، میرے شب وروز کا ایک بڑا حصہ اسی چھتنار درخت کے سایہ میں گذرتا ہے جو مجھے ذہنی وفکری سکون وراحت دیتا ہے۔

قلم کا مسافر اتنے طویل سفر کے بعد تھک گیا ہے، اس لئے یہ سفر یہیں تمام ہوتا ہے، اپنی کہانی تھی اور ہر شخص کو اپنی کہانی عزیز ہوتی ہے اس لئے بات دراز سے دراز تر ہوتی چلی گئی۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اسیر ادروی

جامعہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب، بنارس

۵؍اپریل ۱۹۹۴ء، ۲۳؍شوال ۱۴۱۴ھ

☆☆☆☆☆☆☆

داستانِ ناتمام

خودنوشت سوانح

(حصہ دوم)

مولانا اسیر ادروی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین (حصہ دوم)

☆☆☆☆☆☆☆☆۷۶

بنارس کے شب وروز

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بنارس تو میں آ گیا،لیکن آنے سے پہلے اپنے حلقۂ احباب میں جس سے بھی میں نے بنارس جانے کا ذکر کیا ان میں سے جو لوگ یہاں کے حالات سے باخبر تھے بلا استثناء ہر ایک نے یہی کہا کہ جامعہ اسلامیہ کی انتظامیہ کا رویہ آمرانہ اور اساتذہ سے بسا اوقات اہانت آمیز ہوتا ہے،اس لئے کوئی بھی جامعہ اسلامیہ سے زیادہ دنوں تک وابستہ نہیں رہتا ہے،ایک دو سال میں اس کو ترکِ تعلق کرنا ہی پڑتا ہے،اگر تم کو بھی کچھ چر کے سہنے ہیں تو جا سکتے ہو،مگر میں اس کی مکمل صداقت پر یقین نہیں کر سکا اور اس کو اتفاقات پر محمول کیا،اور یہ سمجھا کہ اس کی وجہ اساتذہ کی بے اصولی ، بدمزاجی اور غیر دانشمندانہ رویہ بھی ہوسکتا ہے،مگر بار بار کہنے سے دل میں یہ بات پیوست ہوگئی اور مستقل ایک کھٹک دل میں رہتی تھی جیسے کوئی کانٹا چبھ کر ٹوٹ گیا ہو۔

میں جن دنوں بنارس آیا تو جامعہ اسلامیہ میں عرب امارات کے سفیر کی آمد کا پروگرام بن چکا تھا،اس کے استقبال کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں، جامعہ میں تعمیر کا سلسلہ شب وروز چل رہا تھا،اس وقت جامعہ کی عمارت بہت محدود تھی ،گراؤنڈ فلور کے کمرے تو بن چکے تھے،دارالحدیث کے نام سے ایک بڑا کمرہ ابھی ابھی تعمیر ہوا تھا اور عمارتی لکڑیوں سے بھرا ہوا تھا ،اور کام ہو رہا تھا، دوسری منزل پر صرف جنوبی سمت چار پانچ کمرے بنے ہوئے تھے اور سیڈ مکمل تھی ، اسی منزل پر لائبریری کی

عمارت تھی جس کی چھت تعمیر کے چند دنوں بعد ہی گر گئی تو ''بھیم'' کی جگہ دو بھاری بھرکم گارڈر لگا کر چھت مکمل کی گئی، دوسری منزل کے چاروں سمت چھ سات فٹ چوڑے بارجے تھے مگران کی زمین اوبڑکھابڑ تھی، کام ۲۴ر گھنٹے چل رہا تھا، انتظامیہ کی دلچسپی کا حال یہ تھا کہ کہ بیشتر ارکان ہمہ وقت جامعہ میں موجود رہتے تھے، اس طرح تین مہینوں میں اتنا کام ہوا جتنا کام برسوں میں ہوسکتا ہے۔

پہلا تلخ تجربہ........................

میں جس ہفتہ میں آیا اس وقت مجلس استقبالیہ تفصیلی پروگرام کا خاکہ مرتب کرنے میں مصروف تھی، غالبًا چوتھا یا پانچواں دن تھا کہ ناظم اعلیٰ نے مجھ سے کہا کہ آپ آج نمازِ عشاء کے بعد مدن پورہ روڈ پر جا کر جامعہ اسلامیہ کی قدیم عمارت میں چلے جائیں، وہاں پروگرام مرتب کرنے کے لئے کچھ لوگ جمع ہوں گے اس میں جو مناسب سمجھیں مشورہ دیں تا کہ لائحۂ عمل مرتب کرلیا جائے۔

حسب الحکم میں مدن پورہ کی قدیم عمارت میں پہونچا تو پورا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، جامعہ اسلامیہ کے نائب ناظم دیوار سے ایک چوکور مسند لگائے بڑے جاہ وجلال اور طمطراق سے آلتی پالتی مارے صدرِ مجلس بنے ہوئے بیٹھے ہیں، میں کمرے کے دروازے پر پہونچا اور سلام کر کے بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ نائب ناظم کی آواز گونجی، فرمایا: آپ رجسٹر لے کر نہیں آئے؟ لہجہ بڑا تیکھا اور انداز بڑا آمرانہ تھا، ایک شاک لگا میں سنبھل گیا، میں نے کہا مجھے کیا خبر کہ مجھے رجسٹر لے کر حاضر ہونا تھا، اگر رجسٹر مجھے دیا گیا ہوتا تو میں لے کر حاضر ہوتا، انھوں نے فرمایا کہ پھر بیٹھنے کی ضرورت نہیں، آپ ابھی جایئے اور رجسٹر لے کر آیئے، میں نے دل میں کہا کہ یہ جاہل آدمی آدابِ گفتگو سے ناواقف، تہذیب سے ناآشنا کمرے میں بیٹھی ہوئی بھیڑ کو یہ تأثر دینا چاہتا ہے کہ

دیکھو! میرا حکم کیسے چلتا ہے؟ کالی شیروانی، چوڑی موری کے پاجامہ والا، لکھنؤ برسہا برس گذار کر آنے والا، کیسے میرے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

میرے دل میں پہلے سے کھٹک تھی، نائب ناظم کے اس تیور اور اندازِ گفتگو نے وہی کام کیا جو کسی زخم کو ٹھیس لگنے پر ہوتا ہے، میں تلملا اٹھا اور سر سے پیر تک برستے ہوئے انگاروں میں نہا گیا، دل نے کہا

''گربہ کشتن روزِ اول''

میں دروازہ پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور نائب ناظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: آپ نے مجھے چپراسی سمجھ رکھا ہے جو مجھ پر حکم چلا رہے ہیں، آپ جیسے لوگ بیگ لئے میرے پیچھے پھرا کرتے تھے، آپ کی کیا حیثیت ہے، یاد رکھئے میں اس انداز، گفتگو کا عادی نہیں، یہ کہا اور میرے ہاتھ میں لپٹے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا وہیں سے نائب ناظم کی جانب پھینکا اور کہا اس کو سنبھالئے میں جارہا ہوں مجھے واپس نہیں آنا ہے، یہ کہا اور سیدھے جامعہ اسلامیہ اپنے کمرے میں آگیا، وہاں موجود بھیڑ پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا؟ مجھے اس کی خبر نہیں، لیکن کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا، کیونکہ

شیشہ پتھر پہ گرے اور پھر آواز نہ ہو

کسی نے میرے عمل کو گستاخانہ کہا ہوگا، کسی نے برا بھلا بھی کہا ہوگا، غصہ اور برہمی کا بھی اظہار کیا گیا ہوگا، مگر مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی، میں نے دل میں کہا کہ احباب نے سچ ہی کہا تھا، ابھی ایک ہفتہ بھی پورا نہیں گذرا کہ تہ کی غلاظت سطح پر آگئی۔

صورت حال کی اس تلخی نے مجھے انگاروں پر لٹا دیا، رات بھر اچھی طرح نیند نہیں آئی، طرح طرح کے خیالات دماغ میں گردش کر رہے تھے، کبھی کبھی یہ خیال بھی

سرا ٹھانے لگتا کہ بنارس فوراً چھوڑ دینا چاہئے، دوبارہ تجربہ کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے، ''آزمودہ را آزمودن جہل است''

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی فولادی ہاتھ میرے دل کو مٹھی میں لے کر مسل رہا ہے اور میں تڑپ تڑپ جاتا ہوں، مگر تکلیف کی شدت کے باوجود میں چیخ بھی نہیں سکتا، طبیعت حساس بہت ہے، ذرا سا کسی کے رویہ میں تبدیلی آئی تو گھنٹوں دل کے صحرا میں خیالات کے بگولے اُٹھتے رہتے ہیں، اور عاجز ہو کر خود اپنے ہی کو ملامت کرنے لگتا ہوں اور کہتا ہوں   اے روشنئ طبع! تو بر من بلا شدی

ناظم اعلیٰ کو اسی رات اس واقعہ کا علم ہو گیا، انھوں نے صبح کو بڑی ندامت سے کہا کہ اب آئندہ آپ کہیں نہ جائیں اور تنہائی میں نائب ناظم کو بہت سخت سست کہا جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا، انھوں نے میرے زخموں پر کافوری مرہم کا پھاہا رکھا تو بتدریج اس کی ٹیس کچھ کم ہوئی لیکن طبیعت کئی دنوں تک بہت اُداس رہی اور دل بجھا بجھا سا رہا، جیسے آخر شب کی جھلملاتی ہوئی شمع۔

سفر دہلی.........................

اگلے ہفتے پوسٹر، فولڈر اور دعوت ناموں کی طباعت کے لئے مجھے دہلی بھیجا گیا، مقصد یہ تھا کہ ہر چیز معیاری، دیدہ زیب اور خوبصورت چھپوائی جائے ورنہ اپنے دیار میں یہ سارے کام ہو سکتے تھے مگر میری بدقسمتی کہ الجمعیۃ پریس نے مجھے دھوکے میں رکھا اور سب کچھ لیتھو پر چھاپ کر میرے حوالہ کر دیا جبکہ آرٹ پیپر پر کتابت کرائی گئی تھی، حسن اعتماد کی بنا پر مجھے دہلی بھیجا گیا تھا، اس خراب اور غیر معیاری طباعت سے یہ اعتماد ضرور مجروح ہوا ہوگا اور ہوا، مگر ناظم اعلیٰ کا یہ ظرف تھا اور ان کی اخلاقی عظمت تھی کہ انھوں نے کبھی میرے سامنے اس کا اظہار نہیں جبکہ میں خود پشیمان تھا۔

سفیر کی آمد اور خطبہ استقبالیہ......................

اب سفیر کی آمد کی تاریخ بالکل قریب آ گئی تھی کہ ایک دن ناظم اعلیٰ نے مجھ سے کہا کہ خطبہ استقبالیہ مرتب کر دیجئے مگر زبان وبیان کے لحاظ سے شاندار ہو، الفاظ کی دھوم دھام، جدید تعبیرات کی ایسی فراوانی ہو کہ بغیر مطالعہ کے پوری روانی سے نہ پڑھا جا سکے، میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کا کیا مقصد ہے، اس کے پس پردہ کیا راز ہے؟ میں نے کہا کہ میں جیسا لکھتا ہوں ویسا ہی لکھوں گا، تصنع اور بناوٹ میری تحریر کے حسن کا خاتمہ کر دے گی، اس لئے مجھے آزاد چھوڑ دیں، اسی رات میں آٹھ دس صفحے لکھ دئے اور ان کے حوالے کر دیئے۔

میں یہاں کے لوگوں سے ایک دم ناآشنا تھا اس لئے صدر استقبالیہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا تھا، بعد میں لوگوں نے بتایا کہ یہاں ایک وکیل صاحب ہیں۔

آبنوسی جن کی رنگت، ریشمی جن کا مزاج

وہی صدرِ استقبالیہ ہیں، رنگ گہرا سانولا لیکن طور طریق، لباس، اندازِ گفتگو، جذبات وخیالات ماڈرن ہیں، مولویوں سے ان کو خدائی بیر ہے، وہ اپنی مجلسوں میں ان پر ہمیشہ نکتہ چینیاں کرتے رہتے ہیں، ان کی انھیں خصوصیات کو دیکھ کر ایک ظریف نے ان کو ''کالا انگریز'' کا خطاب دے رکھا تھا، جامعہ کی انتظامیہ نے اپنے دائرۂ کار کے اثر سے مجبور ہو کر ان کو صدرِ استقبالیہ بنا دیا ہے مگر دل سے کوئی پسند نہیں کرتا، میرا لکھا ہوا خطبہ استقبالیہ جب ناظم اعلیٰ نے ان کو دیا اور کہا کہ ایک بار اس کو پڑھ لیجئے تاکہ جلسہ میں پڑھنے کے موقعہ پر دشواری نہ ہو، اس بات سے ان کی انا کو ٹھیس لگی، تیوری چڑھا کر کہا ''میں کوئی جاہل ہوں جو معمولی اُردو تحریر نہ پڑھ سکوں'' انھوں نے برہمی کے انداز میں تحریر لی اور کوٹ کے جیب میں رکھ لی، اسی دن شام کو استقبالیہ کے جلسہ

میں ان کو یہ تحریر پڑھنی تھی۔

ندامت کا پسینہ.........................

وہ بہترین کوٹ، پتلون اور خوبصورت ٹائی کے ساتھ سجے سجائے اسٹیج پر آئے، اور جیب سے خطبہ استقبالیہ نکال کر پڑھنا شروع کر دیا، بھیڑ کافی تھی، معززین شہر اور اہل علم کا مجمع تھا جو ہمہ تن گوش تھا، دو تین سطروں تک ان کے پڑھنے کی رفتار ٹھیک رہی، جوں جوں وہ آگے بڑھے جگہ جگہ ٹھوکر لگنے لگی، رفتار کج مج ہوگئی، کہیں لفظ کا تلفظ غلط ہوگیا، کہیں اضافت اُڑا دی، کہیں عطف کھا گئے، اور کہیں لفظ ہی سمجھ میں نہیں آیا، اسی طرح وہ لنگڑی چال چلتے رہے، یہاں تک کہ جملہ کا جملہ مہمل ہونے لگا، ان کی ان حرکاتِ مذبوحی کو دیکھ کر اہل علم کا طبقہ زیر لب مسکرا رہا تھا، اب ان کو پسینہ آنے لگا، رومال جیب سے نکال کر بار بار پسینہ پونچھنے لگے، چہرے کا رنگ اتنا گہرا آبنوسی تھا کہ اس پر ندامت کی جو سرخی بڑھتی جا رہی تھی اس کا صحیح اندازہ تو نہیں ہو رہا تھا لیکن بار بار پسینہ پونچھنے سے مجمع نے سمجھ لیا کہ یہ ندامت کا پسینہ ہے، خطبہ استقبالیہ کا انھوں نے قیمہ بنا کر رکھ دیا، غنیمت یہ تھی کہ سفیر موصوف اردو زبان سے ایک دم حرف ناآشنا تھے۔

خدا خدا کر کے اجلاس ختم ہوا تو اس کی مکمل روداد مرتب کرنے کے لئے مجھ سے کہا گیا وہ بھی مرتب کر کے میں نے دے دی، شاید جامعہ کی فائل میں کہیں پڑی ہوگی، جامعہ کی عمارت بن چکی تھی، متفرق کام باقی تھے جو چل رہے تھے، تعمیری سرگرمیاں دھیمی پڑتے پڑتے ختم ہوگئیں اور زندگی معمول پر آگئی، جامعہ میں تعلیمی سلسلہ از سر نو شروع ہوا۔

تدریسی ذمہ داری.........................

جامعہ اسلامیہ میں میری آمد کس حیثیت سے ہوئی تھی اس کا مجھے نہ علم تھا نہ

اندازہ، کیونکہ ناظم اعلیٰ سے جو باتیں ہوئی تھیں تو میں نے ان سے بلا تکلف کہہ دیا تھا کہ میری ساری زندگی سیاست کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گذری ہے، تدریسی زندگی ایک شریفانہ زندگی ہے، یہ مرنجا مرنج اچھے لوگوں کی پرسکون زندگی ہے مگر میں بدقسمتی سے اس لائق نہیں، اس لئے اگر آپ یہ سوچتے ہوں کہ میں تدریس کا کام کرسکوں گا تو آپ کی غلط فہمی ہوگی، مجھے اس سلسلہ میں کوئی تجربہ نہیں، اور نہ اب تک کی زندگی میں یہ شریفانہ مشغلہ اختیار کیا تو انھوں نے اس کے جواب میں اتنی اونچی بات کہی جو میرے تصور سے بھی باہر تھی، انھوں نے کہا کہ آپ یہاں کچھ نہ کریں صرف ادارہ میں رہیں تب بھی آپ کا مشاہرہ ہمیشہ جاری رہے گا، ہمارے ذہن میں جو پروگرام ہے وہ کبھی بتا دیا جائے گا، آپ سے کبھی نہ پوچھا جائے گا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔

اجلاس اور تعمیر کا ہنگامہ فرو ہوا اور جامعہ میں تعلیم کا آغاز ہوا تو چند دنوں تک میں اس سے بے تعلق رہا، لیکن بیکاری خود ایک سزا ہے اور میں اس سزا کو بھگتنے کے لئے نہیں آیا تھا اس لئے ایک دن میں نے صدر صاحب سے کہا کہ مجھے ایک دو سبق دیدیئے جائیں تو میرا وقت اچھی طرح گذرے گا، انھوں نے کہا کہ آپ خود کوئی کتاب تجویز کرلیں وہ کتاب آپ کو دیدی جائے گی، کیونکہ ان کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں یا نہیں، صورت نہ شکل، نہ لباس نہ طور طریق، کچھ بھی اہل علم کا نہیں تھا اس لئے وہ نہیں سمجھ سکے کہ یہ کیا پڑھا سکتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے سردست ''دیوان متنبیؔ'' دیدیجئے، انھوں نے بلاتردد کہا ''لے لیجئے'' کل سے اس کا سبق شروع کرادیں، یہ کتاب خود انھیں کے پاس تھی، بس یہی ایک کتاب میں نے لے لی کسی دوسری کتاب کا تذکرہ نہیں کیا، کچھ دنوں کے بعد میں نے ان سے ''ہدایۃ النحو'' مانگ لی، وہ کتاب بھی مل گئی۔

کتابیں تو میں نے لے لیں، مگر پڑھاؤں گا کیسے؟ اس کو پہلے نہیں سوچا، جب ذمہ داری سر پر آ گئی تو خیال آیا، صدر صاحب سے کہا کہ اس سلسلہ میں کون کون سی کتابیں مطالعہ میں رکھتے ہیں؟ انھوں نے بلا تامل از خود وہ کتابیں میرے حوالے کر دیں، میں نے اللہ کا نام لے کر دوسرے دن سبق شروع کرا دیا، یہ میری زندگی کا پہلا دن تھا کہ میں مسند تدریس پر بیٹھا ۱۹۴۲ء میں فارغ ہوا اور اب تک تعلیم وتدریس سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھا، جو شخص نہایت غیر علمی مصروفیتوں میں ۳۵ر سال گذار چکا ہو وہ تدریس کا حق کیا ادا کر سکتا ہے؟ میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔

پہلا درس........................

دوسرے دن درسگاہ میں پہونچ کر میں نے دیکھا کہ ۱۲ر طلبہ کی جماعت میری منتظر ہے چونکہ یہ میرا پہلا درس تھا اس لئے آغازِ کتاب میں جو باتیں بتائی جاتی ہیں میں پہلے سبق کے موقعہ پر بتانا شروع کیا، میں نے کہا کہ:

''آپ عربی ادب کی کتاب پڑھ رہے ہیں اور وہ بھی نظم کی کتاب، ہمارے درس نظامیہ میں یہ ادب کی آخری کتاب ہے، دو باتیں جو مجھے آپ سے کہنی ہیں ممکن ہے آپ کے استاذ نے بتا دی ہوں لیکن میں آپ کو پہلا سبق پڑھا رہا ہوں اس لئے وہ باتیں مجھے دہرانی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جب یہ کتاب نظم کی ہے تو شعر کا لفظی ترجمہ کافی نہیں اور وہ بھی ایسا ترجمہ جس سے شعر کا مفہوم اور شاعر کا مقصد صاف سمجھ میں نہ آئے، یہ تو کتاب کے ساتھ ظلم ہے، شعر کا ترجمہ اُردو تعبیرات کے ذریعہ کرنا چاہئے کہ ذہین آدمی صرف بامحاورہ ترجمہ

سے شاعر کا مقصد سمجھ جائے ، اگر شاعر نے کوئی جدت کی ہے یا کوئی خوبصورت تشبیہ استعمال کی ہے یا سادہ بات کو موثر اُسلوب میں پیش کیا ہے تو ان تمام باتوں سے طلبہ کو واقف ہونا چاہئے۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے مدارس میں ادب پڑھنے کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے کہ عربی الفاظ کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے ساتھ اس کی لغوی تشریح بھی سمجھ لی جائے کہ اگر ان لفظوں کو اپنی تحریر میں استعمال کریں تو کیسے کریں، واحد، جمع ، باب ،مصدر اور مادہ وغیرہ کا علم طالب علم کو ہو جائے ، بس ان دو باتوں کو سر دست ذہن میں رکھیں ، اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ بھی کچھ بتاؤں گا۔

اس کے بعد میں نے صرف پانچ اشعار پڑھائے اور اسی انداز پر پڑھائے جس کا میں نے طلبہ سے اظہار کیا تھا، وقت ختم ہو گیا اور لڑکے چلے گئے، دوسرے دن جب طلبہ اپنے وقت پر آئے تو انھوں نے درخواست کی کہ ان کو دیوان متنبّی ابتدا سے پڑھا دی جائے ، دل نے کہا یہ بڑی خطرناک درخواست ہے، ایسے موقعہ پر نوجوان استاذ دھوکا کھا سکتا ہے،اس کے دماغ میں غرور و پندار کے بھوت ناچنے لگیں گے، وہ سمجھے گا کہ میری قابلیت کا اعتراف کیا جا رہا ہے، حالانکہ یہ صرف دھوکا ہے، اگر اس نے اس طرح کی درخواست منظور کر لی تو اس نے اپنی راہ میں کانٹے بو لئے ، مستقبل میں اس کے تلوے ہمیشہ لہولہان ہوتے رہیں گے کیونکہ اس سے سابق استاد کی توہین و تنقیص ہوتی ہے، دل شکنی اور دل آزاری بھی،اس لئے اس کو اپنے غرور و پندار کی سزا مل کر رہے گی ، میں مدارس عربیہ کی اندرونی فضا اور یہاں کے ماحول سے خوب واقف ہوں، ہر استاد کے ذہن میں یہ چور بیٹھا رہتا ہے، وہ کہتا رہتا ہے کہ آپ سب

سے اچھا پڑھاتے ہیں، یہ باتیں میرے ذہن میں تھیں، میں نے ان کی درخواست کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ آئندہ اس طرح کی درخواست نہ کی جائے۔

ایک سال گذر گیا، انتظامیہ کی طرف سے میرے متعلق کوئی خاکہ نہیں آیا یا حالات سازگار نہیں ہوئے اس لئے میں نے اپنے طور پر اپنی راہ خود بنائی، دوسرے سال عام مدرسین کی طرح چھوٹی بڑی پانچ کتابیں اپنے ذمہ لیں، پھر یہ سلسلہ چل پڑا، ہر سال کچھ نئی کتابیں لیتا رہا اور ان کتابوں کو بھی پڑھانے کی نوبت آئی جن کو میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، اس دوران تاریخ اسلام، تاریخ ملت، صفوۃ المصادر جیسی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی پڑھائیں، پھر نورالایضاح، اصول الشاشی، ترجمہ قرآن، منثورات، مقامات حریری، ازہارالعرب اور حماسہ کے علاوہ شرح عقائد، شرح جامی، شرح شذور الذہب، جلالین، مشکوٰۃ اور ابوداؤد شریف کے اسباق میرے ذمہ آئے، میں باضابطہ مدرس بن گیا، جو بننا تھا بن گیا، زندگی کے دن گذرتے رہے، دینی علوم سے رابطہ از سر نو قائم ہوا، ذاتی طور پر اسلامی تاریخ، اسماء الرجال، جرح وتعدیل اور علوم الحدیث کا مطالعہ کرتا رہا، اور حاصل مطالعہ کو کتابی شکل دیتا رہا اور کتابیں شائع ہوتی رہیں، ادارہ کی تعلیمی سرگرمیوں سے میری دلچسپی بڑھتی گئی اور میں اس کا ایک رُکن ہوکر رہ گیا، انتظامیہ کو یاد بھی نہ رہا کہ مجھ کو کس مقصد سے بلایا تھا اور مجھ سے کیا کام لینا تھا، یہاں کے علمی ماحول، بعض ذہین وفطین اہل علم احباب کی صحبت، اور لائبریری کی ذمہ داری نے کتابوں سے جو دلچسپی پیدا کی تو میں نے جان بوجھ کر اپنے آنے کے مقصد کی جستجو نہیں کی اور انجان بنا رہا، یہانتک کہ کئی سال گزر گئے۔

محمود منزل.........................

جامعہ کی قدیم عمارت بس ایک کوچنگ سینٹر چلانے کے لائق ہے جو چند

کمروں پر مشتمل ہے، دوسری عمارت جوریوڑی تالاب میں بنائی گئی اس وقت بھی اس کی ترقیوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا، ایک چھوٹی سی زمین پر دورویہ عمارت کی تعمیر کی گئی، اب اس کی حیثیت گلیارے سے زیادہ نہیں، دوسری منزل پر مسجد کی تعمیر نے ادارہ کو اور محدود کردیا، درسگاہیں چھوٹی چھوٹی اور دارالاقامہ کے گنتی کے چند کمرے تعمیر ہوئے، اس کمی کو تین منزلہ عمارت بنا کر پورا کرنے کی کوشش کی گئی، اور مطبخ کو چوتھی منزل بنا کر کام لیا گیا اس کے باوجود ہر لمحہ اس کی تنگ دامانی کی شکایت ہے، اساتذہ کے کمرے میٹر اور فٹ کے بجائے انچ سے ناپے جانے کے لائق ہیں، انتظامیہ کو بھی اس کا احساس ہے لیکن زمین ربر تو نہیں کہ اسے کھینچ کر بڑھایا جاسکے، اس کے موقعہ محل کے لحاظ سے جو عمارت ملی، میرے آنے کے چند سالوں بعد محمود منزل کی عمارت خرید لی گئی۔

مدن پورہ روڈ پر ایک بنگالی رئیس کی ایک شاندار حویلی خریدی گئی، ہماری جماعت میں بڑی امنگ تھی، اس عمارت کے اندر ایک مندر بھی تھا اس لئے اس کی خریداری پر ہندوؤں کے اندر زبردست برہمی کے آثار تھے اور اندیشہ تھا کہ ان کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام ہو، اس لئے خریداری اور قبضہ کے بعد پچاسوں مسلمان نوجوان دفاعی تیاریوں کے ساتھ اس بلڈنگ میں شب و روز رہتے تھے، جلدی جلدی سارے کمروں میں نیا رنگ وروغن کیا گیا اور ہر در و دیوار سے ہندوانہ آثار ونشانات مٹائے گئے، عمارت کی پیشانی پر موٹے خط میں سیاہ روشنائی سے اردو رسم الخط میں ''محمود منزل'' لکھ دیا گیا، عمارت میں رہنے والوں کو منہ مانگی رقم دے کر بلڈنگ خالی کرالی گئی، اس عمارت میں ایک بڑا ہال تھا اس میں ایک بہت بڑا آئینہ تھا، میں نے اب تک اتنا بڑا آئینہ نہیں دیکھا، زمین سے اس کی اونچائی ۱۲ رفٹ سے کم نہیں رہی ہوگی، یہ آئینہ بہت ہی خوبصورت سنہرے فریم میں جڑا ہوا تھا جو گردش لیل ونہار سے

دھندلا پڑ چکا تھا، آئینہ کی وہ آب وتاب بھی نہیں رہ گئی تھی، اس کو دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے تھے، اس کے مقصد، ضرورت اور افادیت کے سلسلہ میں عقل حیران تھی اور جہاں علم وتحقیق ہمت ہار جائیں تو قیاس اس منزل پر میر کارواں بن جاتا ہے۔

ایک بار ہم کئی احباب دہلی میں لال قلعہ کی سیر کررہے تھے ہم جب اس کے ایک کھنڈر نما ہال میں پہونچے تو ایک الف لیلوی کہانی سننے کو ملی، ہال کی چھت محدّب تھی جیسا کہ مغل طرزِ تعمیر ہے، اندرونی حصہ میں ہزاروں آئینے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ترتیب اور سلیقے سے جڑے ہوئے تھے، ہمارے گائڈ نے بتایا کہ یہ ''رنگ محل'' ہے، جب اس ہال میں رقص وسرود کی محفل جمتی تھی تو ان ہزاروں آئینوں میں ہر طرف رقاصہ کی تصویر، اس کے لہراتے ہوئے پشواز اور اور اُڑتے ہوئے ریشمی دوپٹے کی قوس وقزح بن جاتی تھی، دیکھنے والوں کی نگاہوں میں ہر طرف حوروں اور پریوں کا بسیرا نظر آنے لگتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہزاروں پری جمال، زہرہ وش حسینائیں محو رقص ہیں، پوری محفل کیف وسرور میں ڈوب جاتی تھی، جام وصراحی کا نشہ ان ہزاروں چھلکتے ہوئے شراب کے پیمانوں کے سامنے پھیکا پڑ جاتا تھا، یہ دوآتشہ، سہ آتشہ شراب اس طرح دل ودماغ پر چھا جاتی تھی کہ کسی کو اپنا ہوش نہیں رہتا تھا، ہال میں کھڑے ہوکر جب ہم نے تصور کی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا تو دل ودماغ پر محض اس کے تصور سے نشہ چھانے لگا اور جب اس ہال سے نکل کر دوسری عمارتوں کی سیر کے لئے چلے تو آنکھوں کو کوئی منظر دلکش نظر نہیں آیا نہ دل اس کی طرف مائل ہوا، کیونکہ ہم دوسرے نشہ میں شرابور تھے اور خمار اتنا تھا کہ قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔

محمود منزل کے اس آئینہ کو دیکھ کر مجھے اسی رنگ محل کا خیال آیا، بنگالی خاندان

میں رقص وسرود عیب نہیں بلکہ سماج میں عزت اور فخر کی بات سمجھی جاتی ہے، میں بنارس میں نے خود بنگالی لڑکیوں کو بڑے بڑے ستار لئے ہوئے میوزک اسکول جاتے ہوئے دیکھا ہے، بنگالی رئیس اپنی لڑکیوں کو رقص وسرود کی تعلیم دیتے تھے، میں نے یہی سمجھا کہ یہ بھی رنگ محل جیسی کوئی چیز ہے، جب اس ہال میں رقص وسرود کی محفل جمتی رہی ہوگی تو سارا منظر اس آئینہ میں منعکس ہوتا رہا ہوگا اور ایک تصویر کے بجائے سینکڑوں تصویریں بیک وقت نظر آتی رہی ہوں گی، کیونکہ آئینہ کی بناوٹ سپاٹ نہیں تھی، اس بڑے آئینہ میں دس انچ مربع کئی درجن آئینے بنے ہوئے تھے اور ہر چوکور حصہ میں الگ الگ تصویریں نظر آتی رہی ہوں گی، اس لئے رقص کا منظر بیک وقت کئی درجن آئینوں میں الگ الگ نظر آتا رہا ہوگا، چونکہ بنگالی رؤسا کے لئے یہ اعزاز کی چیز تھی اس لئے ممکن ہے کہ یہ اس رئیس خاندان کا رنگ محل ہی رہا ہو۔

ایک پیشکش اور میرا انکار.......................

جب اس عمارت پر قبضہ مکمل ہوگیا اور اس پر مسلم تہذیب کی چھاپ نظر آنے لگی تو بعض سیاسی مصلحت سے اس کے ایک باہری کمرے میں جمعیۃ علماء کا دفتر قائم کردیا گیا، ایک لمبے پائپ کو سیاہ وسفید پینٹ کرا کے بلڈنگ کے صحن میں گاڑ کر جمعیۃ علماء کا سیاہ وسفید جھنڈا لہرادیا گیا اور باقاعدہ رسم پرچم کشائی ادا کی گئی پھر ایک محدود پیمانے پر اسی صحن میں جلسہ ہوا۔

دفتر کو متحرک اور فعال رکھنے کے لئے تجویز ہوئی کہ باتنخواہ کسی تجربہ کار آدمی کو رکھا جائے، مقامی ذمہ داروں میں سے کسی نے میرا نام لیا اور کہا گیا کہ آپ صوبائی دفتر کے چار پانچ سال سکریٹری رہے ہیں، دفتری سرگرمیوں کے بارے میں آپ کی واقفیت مکمل ہے، آپ سے بہتر کوئی اس ذمہ داری کو ادا نہیں کرسکتا، عصر سے مغرب

تک آپ دفتر میں رہیں گے اس کا اچھا معاوضہ دیا جائے گا۔
دماغ کے ایک گوشے میں بجلی چمکی، اس کی روشنی میں ایک فیصلہ پر پہونچ گیا، میں نے کہا کہ کسی دوسرے آدمی کو رکھ کر یہ تنخواہ اس کو دیدیجئے اور باضابطہ اس کو دفتر میں رکھ لیجئے میں اس کو جو تعاون دے سکتا ہوں رضا کارانہ طور پر دیتا رہوں گا اور جو کچھ میں کرسکتا ہوں کرتا رہوں گا، البتہ تنخواہ قطعاً نہیں لوں گا، مجھے معاف رکھا جائے۔
لوگوں کے لئے یہ جواب قطعاً غیر متوقع تھا، وہ سمجھتے تھے کہ معمولی معمولی تنخواہ پر تعلیم وتدریس کا کام کرنے والے پیسوں کے مواقع تلاش کرتے ہیں اور جو چاہے چندروپیوں میں ان کی خدمات کو خرید سکتا ہے اور اپنا محکوم بنا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی نے تنخواہ منظور کرلی تو اس نے اپنی غلامی کے محضر پر دستخط کردیا۔
میں اس طرح کے دفتروں کے حالات سے خوب واقف ہوں، جذبات کی رَو میں اس طرح کے دفاتر کھولے جاتے ہیں، ان کے پاس کام کا کوئی خاکہ یا نقشہ نہیں ہوتا اس لئے دفتر میں کام کرنے والا اپنی ساری توانائیاں صرف کرنے کے باوجود ناکارہ اور نکما سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص کی نکتہ چینیوں اور تنقیدوں کا نشانہ بنتا ہے اور کچھ دنوں بعد بے عزتی کے ساتھ نکال دیا جاتا ہے، مجھے یقین تھا کہ اس دفتر کا بھی یہی انجام ہوگا، جب جذبات کی رَو تھمے گی تو نہ دفتر باقی رہے گا نہ دفتری کارکن، یہی حالات تھے جن کی وجہ سے میں نے دوٹوک جواب دیدیا کہ میں مفت کام کرسکتا ہوں معاوضہ اور حق المحنت لے کرنہیں، پیسے کی ضرورت کس کونہیں، میں ابراہیم ادہم یا بایزید بسطامی نہیں کہ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی، میری تنخواہ بھی اس وقت بہت کم تھی لیکن اس پیشکش کو قبول کرنا اس کے انجام کے پیش نظر نادانی سمجھا اور اس کے نتیجہ میں ایک مرحلہ وہ آجائے گا جب میری خودداری مجروح ہوگی، میں نے جو سوچا تھا بعد

میں وہی ہوا، واقعات نے ثابت کر دیا کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔

انتظامیہ کا حسن سلوک......................

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ناظم اعلیٰ نے میری تقرری کے وقت جو کچھ کہا تھا اس پر ہمیشہ مضبوطی سے قائم رہے، اور میری حیثیت صرف ایک استاد کی نہیں رہی، میں ہمیشہ بہت سی پابندیوں سے آزاد تھا، اگر چہ میں نے کبھی بھی اس آزادی سے غلط فائدہ نہیں اٹھایا، میں مشنری ذہن ومزاج کا آدمی ہوں، ہر دم مصروفیت، ہر دم کام، ہمہ وقت نئے نئے پروگرام اور منصوبے اور خوب سے خوب ترکی جستجو میری ہابی رہی ہے، اپنی ذمہ داریوں کو کس طرح عمدہ سے عمدہ تر طریقے سے پورا کیا جائے بلکہ اس میں افادیت کے مزید پہلو پیدا کئے جائیں، ہر کام میں حسن، سلیقہ اور خوبصورتی کی تلاش میری فطرت اور میرا مزاج ہے، تضییع اوقات، گپ شپ، شکوہ شکایت، چغلی اور غیبت، بے مقصد مجلس آرائی، میری طبیعت کے خلاف ہے، ادارہ سے باہر کی زندگی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، فضول سیر وتفریح اور بازاروں کے چکر لگانے سے نفرت ہے، اس لئے ادارہ کے اصولوں کی پابندی اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر کرتا ہوں، کسی دباؤ کی وجہ سے نہیں، اصولوں کی خلاف ورزی پر میرا دل خود ملامت کرتا ہے، میں خود ایک بڑا مدرسہ چلاتا ہوں بلکہ اس کا بانی ہوں، میں اپنے ماتحت اساتذہ کو جن اصولوں اور پابندیوں پر عمل پیرا دیکھنا چاہتا ہوں تو جب میں خود استاد کی حیثیت میں آ گیا تو اس معیار پر مجھے خود اترنا چاہئے، اس لئے میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ بہترین حاکم بہترین محکوم ہوتا ہے، میں ان دونوں حیثیتوں کو اخلاقی اعتبار سے ایک خوددار اور غیرت مند زندگی کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور اس پر کاربند ہوں، اور انتظامیہ کی طرف سے جو سہولتیں مجھے حاصل ہیں میں ان کے لئے احسان مند بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔

ملک وملت بچاؤتحریک........................

میں سیاست کی خارزار وادی سے لہولہان ہوکر آیا تھا اور سوچا تھا کہ اب کبھی بھی اس وادی میں قدم نہ رکھوں گا، مگر حالات کی مجبوری نے مجھے اپنے عہد پر قائم نہ رہنے دیا، جامعہ اسلامیہ میں میرا دوسرا یا تیسرا سال تھا کہ جمعیۃ علماء ہند کے دہلی دفتر نے ملک وملت بچاؤتحریک چلانے کا فیصلہ کرلیا، میں چونکہ صوبائی دفتر میں چار پانچ سالوں تک رہ چکا تھا اور ۳۶/۳۵ ضلعوں میں جمعیۃ کی تنظیم کی تھی اور ان کو متحرک وفعال بنایا تھا، امین آباد جیسے مرکزی مقام پر سہ منزلہ دفتر کی عمارت تعمیر کرائی اور دفتر کو اتنا متحرک اور فعال رکھا کہ پورے صوبے سے جماعتی کارکن اپنے یہاں کے مسائل لے کر اس اعتماد کے ساتھ لکھنؤ آتے تھے کہ ان کا مسئلہ حل ہوکر رہے گا، ان اسباب کی وجہ سے مرکزی دفتر میں میرا ایک وقار تھا، اس لئے اس تحریک کے وقت مجھے ایک ماہ قبل بلانے کا فیصلہ کیا گیا، جامعہ کی انتظامیہ کا تعلق جمعیۃ علماء ہند سے ہے اس لئے ناظم اعلیٰ نے مجھے غیر معین مدت کے لئے دہلی جانے کی اجازت دینے میں ادنیٰ سے تذبذب کا اظہار نہیں کیا لیکن اتنی لمبی غیر حاضری کے لئے میں خود تیار نہیں تھا، اس لئے میں اپنے دوتین احباب کے ساتھ دوتین قبل دہلی چلا گیا، جبکہ عام مدارس میں اس طرح کی رُخصتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

تحریک کا پس منظر........................

اس تحریک کے بارے میں میرا ذاتی نقطہ نگاہ اور تھا لیکن عملی سرگرمیاں اپنی جگہ تھیں، یہ تحریک مسلمانوں کے مخصوص مسائل کو لے کر چلائی گئی تھی اور قانون شکنی کر کے جیل بھرنے کا پروگرام تھا، عملی طور پر میں ایک پُر جوش کارکن کی طرح اس تحریک میں شریک رہا لیکن دل میں جو کھٹک تھی اس کا اظہار میں نے کبھی نہیں کیا، لیکن

آج جب میں نے اس تحریر کے وقت تہیہ کر رکھا ہے کہ دل کی بات پوری سچائی کے ساتھ لکھوں گا اور اپنے عیب و ہنر کو کھول کر بیان کروں گا اس لئے اپنے دل کی کھٹک ظاہر کر رہا ہوں، میں اس تحریک کے پس پردہ ایک خاص جذبے کو کارفرما دیکھ رہا تھا، اس بات کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ اس وقت کے سیاسی حالات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

تین سال اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی تھی اور ایک رات میں پورے ہندوستان کے تمام ممتاز، بڑے اور مشہور لیڈران کو گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا تھا اور فوج کو الرٹ کر دیا تھا، اتنا خوف، اتنی دہشت اور مرعوبیت عوام وخواص میں پھیلا دی تھی کہ ان لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف ایک آواز بھی نہیں سنائی دی۔ پورے ملک میں سناٹا چھایا رہا، اندرا گاندھی ہٹلر یا نادرشاہ کی طرح آمر مطلق بن گئی، اس کے چھوٹے لڑکے سنجے گاندھی نے اس ایمرجنسی کو اور دہشتناک بنانے میں اہم رول ادا کیا، دہلی کو خوبصورت بنانے کے نام پر بے شمار مکانات بالخصوص مسلمانوں کے محلوں کو بلڈوزروں کے ذریعہ ڈھا دیا اور جس نے مزاحمت کی اس کو گولیوں سے بھون دیا گیا، مظلوموں کی فریاد کوئی سننے والا نہیں تھا، مسلمانوں کے ممتاز اور نمایاں لیڈران نے ان حالات کے خلاف زبان نہیں کھولی اور نہ ایک لفظ بولنے کی ان میں ہمت تھی، ہر ضلع، تحصیل اور بلاک کا کوٹہ مقرر کر دیا گیا کہ اتنے لاکھ یا اتنے ہزار لوگوں کی نسبندی ضرور کی جائے اس لئے پولیس شکاری کتوں کی طرح لوگوں پر جھپٹتی تھی اور پکڑ کر زبردستی اس کو ہیجڑا بنا دیتی تھی، اتنی دہشت ملک میں پھیل گئی کہ لوگوں نے سفر کرنا چھوڑ دیا، کیونکہ شاہراہوں پر نسبندی کیمپ قائم تھے اس کے سامنے سے گذرنے والے لوگوں کو پولیس زبردستی پکڑتی تھی اور اس کی نسبندی کر کے

چھوڑ دیتی تھی، وہ لنگڑاتا ہوا اپنے گھر چلا جاتا تھا، ہر محکمہ کے ملازمین کی تنخواہیں روک لی گئیں کہ جب تک اپنی نسبندی نہیں کراؤ گے تنخواہ نہیں ملے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس حکومت کے خلاف پورے ملک میں غم وغصہ کی شدید لہر چل پڑی، دلوں میں غیظ وغضب کا لاوا پکنے لگا اور جب ایمرجنسی ختم ہوئی اور لیڈران جیلوں سے باہر آئے اور کچھ ہی دنوں بعد عام الیکشن کا اعلان ہو گیا تو اس وقت پورا ملک اندرا گاندھی اور اس کے لڑکے سے نفرت اور ان کے خلاف غم وغصہ کی وجہ سے شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا، کانگریس کے خلاف ایک متحدہ محاذ جنتا پارٹی کے نام سے بنایا گیا، اس کے بینر تلے الیکشن لڑا گیا، ہر جگہ کانگریسی امیدواروں کو ذلت آمیز شکست ہوئی اور لاکھوں ووٹوں سے کانگریس کا ہر امیدوار ہار گیا، خود اندرا گاندھی اپنے محفوظ ومضبوط حلقہ انتخاب رائے بریلی سے ایک معمولی لیڈر راج نرائن سے بری طرح شکست کھا گئیں، پورے ملک سے کانگریس کا صفایا ہو گیا، اب پانسہ پلٹ چکا تھا کانگریسی لیڈران مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کر دئے گئے، جنتا پارٹی نے اپنی حکومت بنائی اور اندرا گاندھی کو گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا اور اپنا انتقام لیا، اندرا گاندھی کے جیل جانے سے تو عوام خوش تھے مگر کانگریسی لیڈران نے ان کی ہمدردی میں جیل بھرو تحریک شروع کر دی، اب حالات برعکس ہو چکے تھے جیل بھیجنے والے خود جیل جا رہے تھے، مزید ستم یہ کہ عوام کی کوئی ہمدردی ان کانگریسی لیڈروں کو حاصل نہیں تھی بلکہ لوگ اس کو تملق، چاپلوسی اور ضمیر فروشی سمجھتے تھے، کیونکہ اندرا حکومت کے لگائے زخم ابھی تازہ تھے، انھیں بے غیرت لیڈروں کے ساتھ صدر جمعیۃ بھی اندرا گاندھی کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جیل چلے گئے۔

چند ہی دنوں بعد اندرا گاندھی اور کانگریسی لیڈران چھوڑ دئے گئے، مگر جنتا

حکومت انتقام پر آمادہ تھی، کانگریس مفلوج ہوکر رہ گئی، اندرا گاندھی جہاں جانا چاہتیں حکومت ان پر پابندی عائد کردیتی، ضلع دیوریا میں ایک اہم واقعہ پر اندرا گاندھی نے وہاں جانا چاہا مگر کلکٹر نے ان پر روک لگادی، خشت باری میں ان کی ناک ٹوٹ گئی، اس طرح کانگریس بظاہر بے بال وپر ہوکر رہ گئی۔

اس تاریخی پس منظر نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ ملک وملت بچاؤ تحریک مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لئے نہیں چلائی جارہی ہے بلکہ یہ تحریک اندرا گاندھی کی شہ پر اس کی تائید وحمایت میں جنتا حکومت کے خلاف چلائی جارہی ہے تاکہ کانگریس اور اندرا گاندھی کی گری ہوئی ساکھ کو بحال کیا جائے، ہمارے میمورنڈم میں جتنی باتیں اور جتنے مطالبات تھے کانگریس کے پورے دورِ حکومت میں کبھی پورے نہیں کئے گئے، یہ تحریک تو برسوں پہلے کانگریس حکومت کے خلاف چلائی جانی چاہئے تھی۔

میرے اس خیال کی تائید ایک واقعہ سے مزید ہوئی، تحریک کے خاتمہ پر کالی مسجد سے ہمارا کیمپ اٹھ کر مسجد عبدالنبی صدر دفتر آرہا تھا تو سب سے آخر میں ایک ممبر پارلیمنٹ کے ساتھ ایک ٹیکسی میں دفتر آرہا تھا، وہی ایم پی کالی مسجد میں رضا کار کیمپ کے انچارج اور منتظم تھے، راستہ میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ چلئے ذرا اندرا گاندھی سے ملتے آئیں، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا، میں نے کہا ہمارے پاس وقت ہے چلئے ملتے آئیں، دل میں سوچا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس فولادی عزم وارادہ کی خاتون کو ذرا قریب سے دیکھوں جس کے چشم وابرو کے اشارے پر پورا ملک ناتھے ہوئے بیل کی طرح چلنے پر مجبور تھا، ٹیکسی ایک چوراہے پر موڑ دی گئی اور ہم دونوں اندرا گاندھی کے بنگلے پر پہونچ گئے، وہاں جاکر معلوم ہوا کہ میڈم اس وقت دہلی سے باہر ہیں۔

اس چھوٹے سے اتفاقیہ واقعہ نے میری آنکھیں کھول دیں، دس بارہ دنوں میں ہزاروں آدمیوں کو جیل بھیج کر جنتا حکومت کے خلاف فضا بنانے کے بعد جب تحریک بند کرنے کا اعلان ہوا تو اپنی اس کارگزاری اور کامیابی کا ذکر کرنے اور داد حاصل کرنے کے سوا اندرا گاندھی کے پاس جانے اور کیا مقصد ہوسکتا ہے۔

میں نے اس تحریک میں پوری سرگرمی سے حصہ لیا، رضا کاروں کی فہرستیں تیار کیں ان کے سامنے پُر جوش تقریریں کیں، ان کو بسوں کے ذریعہ روزانہ روانہ کرتا رہا، قائدین کی طرف سے بیانات لکھ کر اخباروں میں شائع کراتا رہا، نظمیں لکھیں، پورے کیمپ کے نظام کو اپنے ساتھیوں کے تعاون سے چلاتا رہا، خود عملی طور پر حصہ لیا، آخری دن گرفتار ہو کر عدالت آیا اور فیصلہ میں کھڑے کھڑے چھوڑ دیا گیا، پھر بھی دل میں اس تحریک کی کامیابی پر کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔

تاریخ جمعیۃ علماء کی ترتیب........................

۱۹۸۱ء میں جب اہل دفتر نے تاریخ جمعیۃ علماء کی ترتیب میرے ذمہ کی تو مرکزی دفتر کا اصرار تھا کہ میں ایک سال کے لئے دہلی آجاؤں اور یہیں بیٹھ کر یہ کام ہو، یہ خیال صحیح تھا کیونکہ ساری فائلیں وہیں ہیں، تمام کاغذات وہیں ملیں گے، دفتر کا یہ فیصلہ درست تھا لیکن میں دفتر کے اندرونی معاملات سے واقف تھا، اس لئے میں اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ دہلی دفتر میں رہ کر یہ کام نہیں کروں گا کیونکہ میں اپنی تدریسی ذمہ داریوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور جو ذہنی سکون جامعہ اسلامیہ میں مجھے حاصل تھا دہلی دفتر میں اس کی توقع نہیں تھی، میری تجویز پر طے یہ ہوا کہ جب جب ضرورت ہوگی میں ہفتہ دو ہفتے کے لئے دہلی دفتر رہ کر کام کروں گا، لیکن ترتیب کا کام بنارس ہی میں رہ کر کروں گا۔

جامعہ نے اس معاملہ میں مجھ کو بالکل آزاد رکھا، نہ سال بھر کے لئے جانے سے اس کو انکار تھا اور نہ ہفتہ دو ہفتے کے لئے بار بار جانے پر اعتراض، یہ میری مرضی پر تھا کہ میں جب دہلی جانے کا پروگرام بناؤں، چلا جاؤں اور جب تک ضرورت ہو وہاں رہوں، جامعہ سے میری غیر حاضری متصور نہیں ہوگی، گویا یہ کام جامعہ اسلامیہ ہی کا کام ہے، چنانچہ اس تاریخ کی ترتیب کے سلسلہ میں متعدد بار میں دہلی گیا، کبھی دس دن کبھی بارہ دن کے بعد واپس آیا۔

ریکارڈ روم کی تنظیم وترتیب.........................

اسی طرح کا ایک مسئلہ اور میرے سامنے آیا، مرکزی دفتر کے ریکارڈ روم کی تنظیم وترتیب میرے ذمہ کردی گئی، ہمارے ناظم اعلیٰ کی مرکزی دفتر کے ذمہ داروں سے گفتگو ہو چکی تھی انھوں نے مجھے دہلی جانے کا مشورہ دیا تو میں نے ان سے کہا کہ یہ کام تنہا نہیں ہوسکتا، دہلی دفتر کا کوئی آدمی تعاون نہیں کرے گا، دفتر والوں کے مزاج سے میں واقف ہوں، اس لئے میں اپنے ہمراہ ایک اور استاد کو لے کر ہی جا سکتا ہوں، میں نے اپنے عزیز دوست مولوی وسیم احمد بنارسی کو اپنے کام میں سب سے بہتر معاون سمجھا، چنانچہ ان کو لے کر دہلی دفتر میں ایک مہینہ مسلسل رہا، متوقع ذہنی اذیت تو مہینہ بھر رہی لیکن دل پر جبر کر کے کام ہوتا رہا، ریکارڈ روم کو منظّم کیا، کاغذات کو مرتب کیا، اگرچہ دفتر کے عدم تعاون کی وجہ سے میرے مزاج اور صوابدید کے مطابق کام نہیں ہوا، میں چاہتا تھا کہ تمام کاغذات کی تین تین کاپیاں فوٹو اسٹیٹ کرائی جائیں اور ان کی تین جلدیں بنائی جائیں اور اصل کاغذات کو ترتیب وار فائل میں جمع کردیا جائے اور اس کو ایک جلد میں محفوظ کردیا جائے، کسی بھی ریسرچ اسکالر کو فوٹو اسٹیٹ کاپی مطالعہ کے لئے دی جائے اور بغیر سخت ضرورت کے اصل ریکارڈ کی فائل کسی کو بھی ہرگز نہ دی

جائے، مگر ایسا نہ ہوسکا، البتہ میں نے تمام کاغذات پر نمبر ڈال کر تاریخ وار مرتب کر دیا اور ہر سال کی فائل الگ کر دی، پھر ان کاغذات کو تعارفی عنوان دے کر ایک مکمل فہرست تیار کر دی کہ کوئی بھی ریسرچ اسکالر ریکارڈ دیکھنا چاہے تو فہرست دیکھ کر مطلوبہ ریکارڈ مانگ لے۔

اس سفر میں مسلسل ایک ماہ دہلی میں رہا، جامعہ اسلامیہ میں نہ اس کو غیر حاضری مانا گیا اور نہ تنخواہ وضع کی گئی، آمد و رفت اور قیام کے اخراجات تو دہلی دفتر کے ذمہ تھے جو ہم نے وصول کر لئے۔

مشورہ کی پذیرائی........................

میں اس طرح کے احسانات کو کہاں تک شمار کراؤں؟ ان کی فہرست بہت طویل ہے، انتظامیہ نے سراسر اونچا رکھا، اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا اور ذکر کروں گا۔

یہاں ایک بڑے رئیس کے یہاں بچوں کی شادی تھی، اس خاندان کا ایک نوجوان کانگریس کا نیتا ہے، مقامی کانگریس کے غیر مسلم لیڈروں سے اس کے تعلقات ہیں، اس نے شادی کا جو دعوتنامہ چھپوایا اس پر گنیش کی مورتی بھی چھپوادی جو عام طور سے ہندوؤں کے دعوتناموں پر ہوتی ہے، یہ ہندوؤں کا ایک دیوتا ہے، ایک مسلمان کی طرف سے جاری ہونے والے دعوت نامے پر اس کی تصویر دیکھ کر اگر مسلمانوں میں برہمی پیدا ہو جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اس دعوت نامہ کا بھی یہی ردِ عمل ہوا، مسلمانوں میں برہمی کے آثار پیدا ہوئے اور کہیں کہیں غصہ کا بھی اظہار کیا گیا، مزید ستم ظریفی یہ کی گئی کہ دعوت نامے میں یہ بھی وضاحت تھی کہ نکاح مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ پڑھائیں گے۔

جب یہ دعوتنامہ مسلمانوں میں تقسیم ہوا اور جامعہ اسلامیہ کی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدہ داروں کو ملا تو دعوتنامہ پر گنیش کی مورتی دیکھ کر ان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، انھوں نے حضرت مفتی صاحب سے مل کر کہا کہ آپ اس تقریب میں ہرگز شریک نہ ہوں، نہ نکاح پڑھائیں، خود مفتی صاحب انتہائی محتاط بزرگ ہیں، ان کو جو روحانی اور ذہنی اذیت پہونچی تھی اس کی وجہ سے خود اس مجلس نکاح میں شریک ہونا ان کو کسی قیمت پر منظور نہیں تھا، اس کی اطلاع اس رئیس کو پہونچی جن کے بچوں کی شادی تھی، وہ نکاح سے ایک دن قبل جامعہ آئے اور مفتی صاحب سے نکاح پڑھانے کی درخواست کی، مفتی صاحب نے دعوتنامہ پر مورتی کی تصویر چھپوانے پر اظہارِ برہمی کرتے ہوئے کہا کہ جب آپ لوگوں کو اسی طرح کا مشرکانہ طور طریق استعمال کرنا تھا تو میرا نام اس میں کیوں گھسیٹا گیا، مفتی صاحب نے نکاح پڑھانے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا، وہ معذرتیں کرنے لگے، لڑکے کی نادانی پر اظہار ندامت کرتے رہے مگر مفتی صاحب راضی نہیں ہوئے اور نہ ان کو راضی ہونا چاہئے تھے، ان کے مقام و مرتبہ، ان کے عہدہ و منصب کا تقاضا یہی تھا کہ اس طرح کے مشرکانہ افعال جہاں ہوں ان کا جانا ناممکن تھا، وہ رئیس منت و سماجت کرتے کرتے جب تھک گئے تو رونے لگے اور کچھ دیر سسکیاں لے کر روتے رہے، میں دفتر میں اس گفتگو اور سوال جواب کے وقت موجود تھا، وہ رو رہے تھے اور مفتی صاحب صاف صاف جواب دے کر خاموش ہو چکے تھے، جب کافی دیر ہوگئی تو میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ کو اس نکاح میں جانا چاہئے، اور نکاح بھی پڑھانا چاہئے، انھوں نے کہا کہ یہ بالکل ممکن نہیں، میں نے عرض کیا کہ کارڈ پر آپ کا نام چھپا ہوا ہے اور کارڈ پر گنیش کی مورتی بھی چھپی ہوئی ہے، وہ دعوتنامہ جن کے ہاتھوں میں پہونچے گا وہ یہی سمجھیں گے کہ مفتی صاحب نکاح پڑھائیں گے، ان

کی منظوری سے نام دیا گیا ہوگا، لوگوں کو کیا معلوم کہ آپ اس مشرکانہ فعل سے ناراض ہیں، آپ مجلس نکاح میں نہیں جائیں گے تو لوگ سمجھیں گے کہ کسی مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکے۔

میں آپ کو صرف وہ روایت یاد دلانا چاہتا ہوں جس میں نہی عن المنکر کے تین درجات بتائے گئے ہیں، آپ اس حکم کے سب سے نچلے درجہ پر قناعت کررہے ہیں جبکہ آپ زبان سے اس کی مذمت کر سکتے ہیں، رائے عامہ کو بیدار کر کے اس مشرکانہ فعل پر آئندہ کے لئے بندش لگا سکتے ہیں، اس طرح آپ پہلے درجہ پر فائز ہو سکتے ہیں، پھر آپ سب سے کمتر درجہ پر کیوں اکتفاء کئے ہوئے ہیں؟ آپ مجلس نکاح میں بالقصد جائیں، اس مشرکانہ فعل کی مذمت میں لاؤڈ اسپیکر پر دس پانچ منٹ تقریر کریں پھر اس کے بعد نکاح پڑھادیں، **من رأى منكم منكراً فليغيره بيده أو بلسانه أو بقلبه وذٰلك أضعف الايمان** کا یہی تقاضا ہے۔

مفتی صاحب نے میری بات مان کر میرا سر اونچا کر دیا اور رئیس صاحب سے کہہ دیا کہ میں آپ کے یہاں آؤں گا اور اس مشرکانہ فعل کی مذمت میں تقریر کروں گا تب نکاح پڑھاؤں گا، وہ رئیس اس پر بخوشی راضی ہوگئے اور کہا کہ اس کی مذمت میں جو کچھ بھی آپ کہیں اس سے مجھے خوشی ہوگی، یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

جب عصر بعد مفتی صاحب حسب معمول اپنی دکان چشمہ فیر پر گئے تو جامعہ اسلامیہ کے چند اعلیٰ عہدہ دار جوش وجذبہ سے بھرے ہوئے آئے اور کہا کہ کل آپ نکاح پڑھانے نہ جائیں ہماری متفقہ رائے یہی ہے، اس کے جواب میں مفتی صاحب نے میری بات ان حضرات سے کہی اور یہ بھی کہا کہ ان کی رائے صحیح ہے، مجھے اس نکاح میں جانا ضروری ہوگیا ہے، اس گفتگو کے بعد وہ حضرات بھی مطمئن ہوگئے اور

بخوشی مفتی صاحب کی شرکت نکاح پر راضی ہو گئے۔

دوسرے دن مفتی صاحب جیب میں ٹیپ ریکارڈ رکھ کر مجلس نکاح میں گئے اور نہایت سخت تقریر کی اور نکاح پڑھا کر فوراً واپس ہو گئے، ہم نے ٹیپ ریکارڈ سے وہ تقریر سنی، ایمان تازہ ہو گیا، میرے مشورہ کو قبول کر کے ان ذمہ داروں نے جو میری عزت افزائی کی کیا یہ فراموش کرنے کی بات ہے؟

اخلاص کے ساتھ خدمت........................

یہی حسن سلوک، یہی عزت افزائی جامعہ اسلامیہ سے میری گہری وابستگی پر مجبور کرتی ہے، میں باتنخواہ ملازم کی طرح کام نہیں کرتا، بلکہ جامعہ کے ہر کام کو ذاتی کام سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ جامعہ کی نیک نامی میں روز بروز اضافہ ہو۔

خدا کے فضل وکرم سے میری علمی وقلمی سرگرمیوں نے اس ادارہ کو پورے ملک میں روشناس ہی نہیں کر دیا بلکہ اس کی عظمت واہمیت میں بے پناہ اضافہ کیا، میری ایک درجن سے زیادہ تصنیفات پر میرے نام کے ساتھ جامعہ اسلامیہ کا نام لازمی طور پر چھپتا رہتا ہے، اور ہر حلقہ میں یہ کتابیں پہونچتی ہیں۔

اس طرح جامعہ اسلامیہ کے رسالہ ''ترجمان الاسلام'' کے معیاری مضامین نے ہر علمی محفل میں بار پالیا، چاہے وہ علماء ومشائخ کی مقدس مجلسیں ہوں یا عصر حاضر کے دانشوروں کی علم وتحقیق سے زمزموں سے گونجتی ہوئی محفلیں، ہر جگہ ''ترجمان الاسلام'' کا ذکر آ ہی جاتا ہے، بات وہی ہے جو متنبّی نے کہی تھی۔ ؎

إِذَا قُلْتُهُ لَمْ يَمْتَنِعْ عَنْ وُصُوْلِهِ
جِدَارٌ مُعَلّٰى أَوْ خِبَاءٌ مُطَنَّبُ

(جب میں کوئی بات کہہ دیتا ہوں تو اس کی پہونچ کو نہ کوئی بلند دیوار روک سکتی ہے نہ کوئی تنا ہوا خیمہ)

ایک ناخوشگوار واقعہ........................

یہاں انتظامیہ شعبہ عربی کے لئے ناظم تعلیمات کے نام سے ایک شخص کو مقرر کرتی ہے جبکہ اس کا تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، لیکن داخلی اختیارات بہت حاصل رہتے ہیں، اس وقت شعبہ عربی کے ناظم تعلیمات ایک بہت بڑے سرمایہ دار تھے، انھوں نے قانون بنایا کہ کوئی استاد رخصت کی درخواست منظور کرائے بغیر نہیں جاسکتا اور اگر چلا گیا تو غیر حاضر مانا جائے گا، اتفاق سے انھیں دنوں مجھے ایک رشتہ کے سلسلہ میں جونپور جانا تھا اور میں اطلاع اور پروگرام جونپور بھیج چکا تھا، اس دن ناظم تعلیمات جامعہ نہیں آئے تھے، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ درخواست کس کو دی جائے، دل نے کہا مفتی صاحب کو دیدی جائے وہ کل ناظم تعلیمات کے حوالے کردیں گے، میں نے ایسا ہی کیا اور جونپور چلا گیا، شام کو واپسی ہوئی، دوسرے دفتر میں رجسٹر حاضری پر دستخط کرنے کے لئے گیا تو دیکھا کہ کل کی تاریخ میں میری غیر حاضری لکھی ہوئی ہے، میں دستخط کئے بغیر واپس آ گیا اور طلبہ کو سبق شروع کرادیا، اسی دوران چپراسی ''کتاب الاحکام'' لے کر میرے پاس آیا اور اس پر دستخط کرنے کے لئے کہا، کتاب الاحکام میں میرے نام نوٹس تھی مجھ سے جواب طلب کیا گیا تھا کہ کل آپ کیوں غیر حاضر تھے، تحریری جواب دیں جبکہ رخصت کی درخواست ان کو مل چکی تھی، اس کے باوجود میرے دستخط کے خانے میں غیر حاضر لکھ دیا تھا، ذہن کو اسی وقت جھٹکا لگا تھا، مزید ستم یہ ہوا کہ میرے نام وجہ بتاؤ نوٹس؟ یہ توہین وتذلیل کا دوسرا واقعہ بھی سامنے آ گیا، میرے مخلص دوستوں نے انتظامیہ کے سلسلہ میں جو کچھ کہا تھا اس کی صداقت پر یہ دوسری مہر تھی، میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب اس سے زیادہ ذلت برداشت

نہیں کی جائے گی ، اب یہ واقعہ آخری واقعہ ہوگا ، یہ سوچتے ہی سر سے پیر تک ایک تیز اور گرم لہر اٹھی اور انتہائی غصہ کے عالم میں چپراسی کے ہاتھ سے رجسٹر لے کر باہر صحن میں پھینک دیا اور کہا کہ جا کر کہہ دو کہ وہ دستخط نہیں کریں گے ، چپراسی تھرتھرانے لگا ، پھر وہ رجسٹر اٹھا کر دفتر چلا گیا اور ناظم تعلیمات سے پورا واقعہ بیان کر دیا ، ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ، علم کا دولت سے ٹکراؤ ہمیشہ ہوتا رہا اور وقتی طور پر ہر موقعہ پر علم ہی کو شکست ہوئی اور دولت غالب ہوتی رہی ، آج بھی علم اور دولت آمنے سامنے تھے ۔

ابھی ناظم تعلیمات کا ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا کہ کئی اساتذہ ہنگامہ دیکھ کر دفتر میں آ گئے تھے ، چند منٹوں کے میں بعد از خود دفتر پہونچ گیا ، انھوں نے خشمگیں لہجہ میں پوچھا ’’ آپ نے کتاب الاحکام کیوں پھینک دیا ؟ ‘‘ تیور انتہائی بگڑا ہوا تھا ، آنکھوں سے غصہ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں ، میں نے اس کے جواب کے بجائے الٹے انھیں سے سوال کر دیا کہ آپ نے رجسٹر میں میری غیر حاضری کے بعد وجہ بتاؤ نوٹس کیوں دیا ؟ انھوں نے کہا کہ آپ کی غیر حاضری پر باز پُرس نہیں کی جائے گی ؟ مجھے اس کا حق حاصل ہے ، میں نے کہا کہ کسی مدرس کی خلافِ ضابطہ غیر حاضری پر جو بڑی سے بڑی سزا دی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کو غیر حاضر لکھ کر اس کی تنخواہ کاٹ لی جائے اس کے علاوہ آپ کچھ نہیں کر سکتے ، آپ نے رجسٹر پر مجھے غیر حاضر لکھ کر قانونی کارروائی مکمل کر لی پھر اس کے بعد وجہ بتاؤ نوٹس دینے کا آپ کو حق نہیں رہا ، کون احمق مجسٹریٹ ہے کہ مجرم کو سزا کا فیصلہ سنا کر حکم دے کہ تم اپنی صفائی پیش کرو ، آپ نے وجہ بتاؤ نوٹس دے کر میری توہین کی ہے ، چونکہ ماحول گرم تھا اکثر اساتذہ اس وقت دفتر میں موجود تھے اس لئے اپنی توہین کا احساس نقطۂ عروج پر تھا میں نے انتہائی برہمی کے انداز میں کہا آپ کو میری توہین کرنے کا حق کہاں سے پہونچتا ہے ؟ آپ کی عزت

سے میری عزت کم نہیں، آپ کو دس بیس آدمی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے تو دس بیس ہزار آدمیوں کے دلوں میں میری عزت اور میرا احترام ہے۔

میری ان باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس لئے وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا، بڑی تلخی کے ساتھ یہ مجلس ختم ہوئی، دوسرے دن جب پھر ناظم تعلیمات آئے تو غصہ سے بھرے ہوئے گئے تھے رات بھر وہ قانون اور ضابطے مرتب کرتے رہے وہ لے کر آئے اور تمام اساتذہ کو دفتر میں بلا کر سنانا شروع کیا، اور تو مجھے یاد نہیں اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ دو دو، چار چار، منٹ بھی اگر تاخیر ہوئی تو مہینہ کے ختم ہونے پر ان کو جوڑا جائے گا اس کے جتنے گھنٹے بنیں گے اتنے گھنٹوں کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی، پوری تعزیراتِ ہند سننے کے بعد کسی نے کچھ نہیں کہا، میں نے کہا یہ سب بکواس ہے، ناقابل عمل ہے، میں ایک دم بغاوت پر آمادہ تھا، وہ اپنا پلندہ لپیٹ کر چلے گئے۔

دل ٹوٹ گیا.........................

دوسرے دن شام کو ناظم اعلیٰ سے میں نے کہہ دیا کہ میں ان حالات میں جامعہ اسلامیہ میں نہیں رہ سکتا، میں نے آپ کی ذات پر اعتماد کیا تھا آج وہ اعتماد بری طرح مجروح ہو گیا ہے، میں ایسے ماحول میں رہنے کے لئے قطعی تیار نہیں، ناظم اعلیٰ بہت زیرک اور ذہین آدمی ثابت ہوئے، ان کے تدبر و فراست کا کئی بار تجربہ کر چکا ہوں، انھوں نے میری بات سن کر برا نہیں مانا، تسلی تشفی کی چند باتوں سے مجھے ٹھنڈا کیا اور کہا کہ میں اس مسئلہ کو حل کر دوں گا، آپ بالکل مطمئن رہیں، آپ یہاں سے جانے کا خیال دل سے نکال دیں، ان کی اعتماد سے بھری ہوئی اطمینان بخش باتوں سے میرے دل کے اندر کی دہکتی ہوئی آگ کی لو کچھ دھیمی ہوئی لیکن اب بھی مختلف طرح

کے افکار و خیالات کی آماجگاہ دل بنا رہا۔

چند ہی ہفتوں کے بعد ناظم اعلیٰ کے تدبر و فراست کا حیرتناک ظہور ہوا، دل ان کی ذہانت و فطانت کا قائل ہو گیا، ایک مشہور مثل سنتا آیا تھا کہ:

سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

اس مثل کی عملی تعبیر میں نے اسی دن دیکھی ، ناظم تعلیمات کی حیثیت انتظامیہ میں انتہائی مؤثر اور باوقار ہے، ان کے خلاف لب کھولنا آسان نہیں تھا ان کو عہدہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کرنا آسان نہیں تھا، اس کے علاوہ وہ ناظم اعلیٰ کے ہر کام میں دخیل و مشیر بھی تھے بلکہ ان کے دست و بازو تھے، صبح و شام ایک جگہ نشست تھی، ناظم اعلیٰ نے ناظم تعلیمات سے اس واقعہ کا ذکر کیا یا نہیں یہ تو مجھ کو معلوم نہیں، لیکن انھوں نے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی ، اور ایک بالکل غیر متعلق مسئلہ کی طرف ان کے ذہن کو موڑتے رہے۔

ہمارے یہاں لڑکیوں کا ہائی اسکول ہے جو اب انٹر کالج ہو چکا ہے، اسی کے نظم اور کنٹرول سے متعلق مختلف مجلسوں میں اپنی تشویش کا اظہار کرتے رہے اور ان سے کہا کہ اسکول لڑکیوں کا ہے، تمام اسٹاف عورتوں کا ہے اس لئے اس اسکول قدرت اللہ گلزار تعلیم کا نگراں بہت ہی معتمد اور بہت ہی مضبوط کیریکٹر کا آدمی ہونا چاہئے جو ہر طرح کے حالات پر نظر رکھ سکے اور ان پر قابو پا سکے، اور نظم و انتظام کی اس میں بھرپور صلاحیت ہو اور جب تک ایسا ناظم اسکول میں نہیں آئے گا تب تک ہر دم مختلف طرح کے خطرات گھیرے رہیں گے۔

وہ کئی ہفتوں تک مسلسل ان سے اپنی تشویش کا اظہار کرتے رہے اور اس کی اہمیت بتاتے رہے، کئی ہفتے بعد انھوں نے ناظم تعلیمات سے کہا کہ مجھے آپ جیسا

آدمی چاہئے، اگر آپ اس ذمہ داری کو قبول کرلیں تو میرا سارا بوجھ ہلکا ہوجائے گا اور میں اس کی طرف سے مطمئن ہوجاؤں گا، دوسرا کوئی شخص اس نازک ذمہ داری کو ادا کرنے کا اہل نہیں، ۷۰۰ لڑکیوں اور ڈھائی درجن لیڈیز ٹیچرس پر نظر رکھنا اور ہر طرح سے کنٹرول کرنا آپ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔

حسن تدبیر.........................

یہ بات جس اعتماد کے اظہار کے ساتھ ناظم اعلیٰ نے کہی ناظم تعلیمات کو یقین ہوگیا کہ یہ بات بہت ہی نیک نیتی سے اوران کی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ کہی گئی، پھر لڑکیوں کے اسکول میں عمل دخل ایسی ہی ایک دلکش اور دلنواز مصروفیت ہے، صنف نازک کی تربت تو ہر شخص کی کمزوری ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ ناظم تعلیمات نے کس جذبے سے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کی حامی بھرلی، یہ ان کے دل کا معاملہ ہے مجھے فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں اور نہ میرے لئے یہ جائز ہے **إن بعض الظن إثم**، مگر انھوں نے بڑی خوش دلی سے اس ذمہ داری کو قبول کیا، جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے، جامعہ اسلامیہ میں اپنے عہد نظامت میں ہفتہ میں دو تین بار آتے تھے مگر قدرت اللہ گلزار تعلیم کی ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ روزانہ بلا ناغہ گھنٹہ دو گھنٹہ اسکول میں ان کی موجودگی ضروری تھی، وہ آتے اور پرنسپل کی کرسی پر بیٹھ جاتے اور پرنسپل عام استانیوں کے لئے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے کسی پر بیٹھ جاتی تھی، حالانکہ یہ آدابِ مجلس کے خلاف ہے **لا تجلسوا علیٰ مکرمة** میں اسلامی تہذیب کا ایک اہم سبق ہے، جامعہ اسلامیہ میں بھی کبھی کبھی یہ منظر دیکھتا ہوں تو بڑا دکھ ہوتا ہے، یہ وہی مزاج ہے جس کے باہر کے لوگ شاکی ہیں، میرے لئے یہ منظر نا قابل برداشت ہوتا ہے مگر اس صداقت کے اظہار کی کوئی صورت

نظر نہیں آتی، کاش انھیں حضرات کا ضمیر بیدار ہو جائے جو ایسی غلطی کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کرلیں، انسان کی عظمت اس میں نہیں ہے کہ وہ کسی باوقار شخص کی کرسی پر بیٹھ جائے اگر چہ عہدہ ومنصب میں آپ سے فروتر ہی کیوں نہ ہو، آپ کی بڑائی یہ ہے کہ اپنے ماتحت کے دفتر میں جاکر کھڑے کھڑے بات کرلیں، اس کی مخصوص جگہ پر بیٹھ جانا آپ کی عزت نہیں آپ کی توہین ہے مگر اس حقیقت کو کم ہی لوگ سمجھتے ہیں، دوسروں کی کرسی پر بیٹھ کر اپنی نگاہ میں بڑے بنتے ہیں، حالانکہ دوسروں کی نگاہ میں وہ اور چھوٹے ہو جاتے ہیں، آپ کے ماتحت کا اگر اعزاز ہوتا ہے تو اس کا اعزاز آپ کے کلاہِ افتخار کا کوہِ نور ہے، آپ اس کی مخصوص نشست گاہ پر بیٹھ کر خود کو دوسروں کی نگاہوں میں کیوں ذلیل کرتے ہیں، دوسروں کے لئے مخصوص جگہ پر بیٹھ کر آدمی بے وقوف اور احمق معلوم ہوتا ہے یا تہذیب سے ناآشنا یا نرا گنوار جس کو دیکھ کر تہذیب سر جھکا لیتی ہے اور زیر لب مسکراتی ہے۔

اپنے حدود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں　　جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

بہر حال جب ناظم تعلیمات نے قدرت اللہ گلزار تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو ناظم اعلیٰ نے ورکنگ کمیٹی میں یہ مسئلہ رکھ کر ان کو قدرت اللہ گلزار تعلیم کا ناظم بنا دیا اور ان کو مکمل اختیارات سپرد کردیئے اور انھوں نے دل کی پوری بشاشت کے ساتھ اس عہدے کو قبول بھی کرلیا اور ازخود جامعہ اسلامیہ کے ناظم تعلیمات کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور ہمارے شعبہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا، میں نے ناظم اعلیٰ سے یہی کہا تھا کہ میں ان کے ساتھ کام کرنے سے مجبور ہوں، انھوں نے کس خوبصورتی سے اس مسئلہ کو حل کیا کہ آخر تک ان کو اس پالیسی کا احساس نہ ہو سکا اور میں تو ان کی اس حکمت عملی پر حیرت زدہ رہ گیا۔

تجربات کی روشنی میں ....

ناظم اعلیٰ کے تدبر وفراست کا اس لمبے عرصہ میں بار بار مشاہدہ کرتا رہا، مجھے ان کی ذات پر ہمیشہ اعتماد رہا اور وہ میرے بارے میں ہمیشہ مخلص رہے، مقامی طور پر پوری جماعت میں ان کے جیسا ذہین وفطین اور حاضر دماغ اب تک کوئی نہیں، اداروں اور جماعتی نظام کو چلانے، الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے اور ہر عقدۂ مشکل کیلئے ناخن گرہ کُشا بننے کی صلاحیت جو ان میں ہے وہ مجھے یہاں کسی میں نظر نہیں آتی، ان کے اندر بلا کی خود اعتمادی اور جرأت ہے، مشکل کو مشکل سمجھنا انھوں نے جانا ہی نہیں، ایسے ایسے مشکل مسئلوں کو انھوں نے حل کیا جب پوری انتظامیہ ہاتھ پاؤں چھوڑ چکی تھی۔

بشری کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں، ان میں ہوسکتی ہیں اور ہیں اس کا کبھی کبھی ظہور بھی ہوتا ہے اس میں زیادہ دخل حالات کی مجبوریوں کا رہا جیسا کہ معلوم ہوا، لیکن ان کی شخصیت جماعت میں اپنا جو مقام بنا چکی ہے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی ہے اس بلند مقام تک کوئی دوسرا نہیں پہونچ سکا، جو لوگ ان پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں، ایک دن بھی ان ذمہ داریوں کو ادا نہیں کرسکتے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

وفاقِ مدارس اسلامیہ......................

۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں جشن صد سالہ منایا گیا، گورنمنٹ نے عام کنشیشن جاری کیا، اسپیشل ٹرینیں چلائیں، پورے ملک میں اتنی ہماہمی تھی کہ توقع سے کہیں زیادہ اجتماع دیوبند جیسے چھوٹے قصبہ میں ہوگیا، مبصرین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میدان عرفات میں حج کے موقع پر مسلمانوں کے اجتماع کے بعد مسلمانوں کا یہ دوسرا اجتماع دیکھنے میں آیا، میں خود اس جشن میں تو شریک نہ ہوسکا لیکن میرا مرتب کردہ ایک کتابچہ وہاں تقسیم کیا گیا جس کی ایک کاپی مجھے جلد ہی کاغذات میں پڑی

ہوئی مل گئی۔

ان دنوں مشرقی اتر پردیش کے چند دنوں ضلعوں میں مدارس عربیہ کا ایک وفاق بنایا گیا تھا جس کا صدر دفتر غازی پور میں تھا، یہ وفاق چند سالوں تک فعال رہا، اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ صدر دفتر سے رول نمبر مدارس کو بھیج دیا جاتا تھا اور پرچہ سوالات مرتب کر کے طبع کرالیا جاتا اور پوری رازداری کے ساتھ امتحان کے نمائندے ان مدارس میں سوالات کی کاپیاں لے کر جاتے، وہی پرچہ سوالات تقسیم کرتے اور اپنی نگرانی میں امتحان کی پوری کارروائی چلاتے، کاپیوں پر سوائے رول نمبر کے اور کچھ نہیں لکھا جاتا، پھر یہ ساری کاپیاں صدر دفتر میں جمع ہو جاتیں اور وہیں ان کو چیک کیا جاتا اور نمبر دیئے جاتے، اور فہرست مرتب کر کے عام مدارس بھیج دیئے جاتے مجھے جامعہ آئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ صدر صاحب نے کہا کہ وفاق کی طرف سے آپ مخزن العلوم دلدار نگر چلے جائیں، پرچہ سوالات مجھے دیدیئے گئے، شام کو پنجاب میل سے چلا، بنارس اسٹیشن پر ہی ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے کسی نے میری جیب صاف کردی، صرف ٹکٹ چھوڑ دیا، بڑی مشکل سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے رات کے دس بجے مدرسہ پہونچا اور امتحان کی کارروائی پوری کی۔

اس وفاق کی طرف سے مجھ سے وفاق کی کارگذاریوں اور طریقۂ کار پر ایک مرتب کرایا گیا اور طبع کرا کے دارالعلوم دیو بند کے اس جشن صد سالہ میں تقسیم کیا گیا۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں آئے

یہ وفاق اپنی افادیت کے لحاظ سے اچھی چیز تھی، اس کے طریقۂ کار میں جزوی تبدیلی کر کے اس نظام کو چلایا جاتا تو عربی مدارس کے بہت سے مسئلوں میں سہولت پیدا ہوتی اور اس کا نظام چاق و چوبند ہوتا۔ عربی مدارس کے طلبہ کا حال یہ ہے

کہ مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، بدتمیزیاں کرتے ہیں، اخلاقی جرائم میں پکڑے جاتے ہیں، ان کا خراج ہوتا ہے تو پورے مدرسہ میں اسٹرائک کرادیتے ہیں اور مدرسہ کے نظام کو درہم برہم کردیتے ہیں اور کبھی کبھی پورا مدرسہ خالی کردیتے ہیں، مجرم طلبہ کے جرم ہوا میں تحلیل ہوجاتے ہیں، دوسرے سال دوسرے مدرسہ میں داخلہ لے لیتے ہیں، ان کو ان کے جرموں کی سزا نہیں ملتی، یہ جرم کرتے کرتے دستارِ فضیلت پاجاتے ہیں، ایسے بدنہاد و بدکردار طلبہ عالم بن کر قوم وملت کو کیا فائدہ پہونچا سکتے ہیں؟ اگر طلبہ کے داخلہ میں مارکس شیٹ اور حسن سیرت کا سرٹیفکٹ لازم کردیا جاتا تو ان سارے فتنوں کا سدباب ہوجاتا، مگر ابتک عربی مدارس نے اس پہلو پر نہیں سوچا اور مصیبتیں جھیل رہے ہیں، یہ وفاق زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا، اس کے کئی اجلاس مختلف شہروں میں ہوئے، میں خود بھی ان جلسوں میں شریک ہوتا رہا لیکن عام مدارس نے اس نظام میں دلچسپی نہیں لی اور صدق دلی سے تعاون نہیں کیا، اس لئے جلد ہی یہ نظام شکست وریخت کا شکار ہوگیا اور پھر اس کا وجود ہی مٹ گیا۔

ریٹائرمنٹ........................

زندگی کا کارواں انھیں نشیب وفراز سے گذرتا ہوا ۱۹۸۶ء کی منزل پر پہونچ گیا، میری عمر اب ۶۰ رسال کی ہوچکی، چونکہ جامعہ اسلامیہ الہ آباد عربک اینڈ پرشین بورڈ سے ملحق ہے، اس لئے سرکاری طور پر مدت ملازمت ۶۰ رسال کی عمر تک ہے، یہاں بھی یہی قانون نافذ ہے، یہاں کے سابق صدر مدرس دوتین سال پہلے ریٹائر ہوکر جاچکے ہیں، وہ بنارس سے جس حال میں گئے وہ میری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے، مجھے بہت پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا کہ میری مدت ملازمت ختم ہورہی ہے، میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں احساسِ مظلومیت کے ساتھ رُخصت نہیں ہوں گا اور ریٹائرمنٹ سے

دو ماہ قبل استعفاء دے کر اپنی مرضی سے جاؤں گا، اپنی مرضی سے جانے اور اخراج کے بعد ذلت سے جانے میں بڑا فرق ہے، خودداری کو اس سے بڑی ٹھیس لگے گی۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم سے میرے بہت مخلصانہ تعلقات تھے اور جب وہ دار العلوم دیوبند کے معاون مہتمم بنائے گئے تو بنارس تشریف لائے تھے، اس موقعہ پر انھوں نے مجھ سے دیوبند چلنے کے سلسلہ میں استمزاج کیا تھا، میں نے اس وقت ان کو جواب دیا تھا کہ میں یہاں ہر طرح مطمئن ہوں، میں یہاں سے کہیں بڑی سے بڑی جگہ جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جب تک حالات بنارس چھوڑنے پر مجبور نہ کردیں، میرا بنارس سے جانا مشکل ہے۔

جب ریٹائر منٹ کو دو تین ماہ رہ گئے تھے کہ اتفاقاً دہلی میں ہونے والے ایک سیمینار کا دعوتنامہ ملا، میں اس میں شریک ہوا، میرے رفیق سفر جامعہ کے ایک اور استاد بھی تھے، سیمینار سے فراغت کے بعد ہم دونوں دیوبند چلے گئے اور وہاں دو دن قیام کے بعد بنارس واپس آئے، ہمارے ناظم اعلیٰ بھی اس موقعہ پر دہلی میں موجود تھے، ہمارے ساتھ ہی قیام پذیر تھے، اس لئے ہمارے دیوبند جانے کا بھی ان کو علم ہوگیا، ان کو شبہ ہوگیا کہ میں اپنے مستقبل کی راہیں ہموار کرنے کی نیت سے دیوبند گیا ہوں، بنارس واپسی کے دو تین دنوں بعد انھوں نے اپنے گھر صدر جامعہ مفتی ابوالقاسم نعمانی کو اور مجھے بلایا، ہم دونوں ساتھ ہی پہونچے، چائے کے دوران انھوں نے مجھے مخاطب کرکے کہا کہ ریٹائر منٹ ایک قانونی مجبوری ہے لیکن آپ کو یہاں سے کہیں جانا نہیں ہے اور مستقبل کے بارے میں جو خدشات میرے دل میں پیدا ہوسکتے تھے انھوں نے از خود دور کردیا اور کہا کہ آپ کی حیثیت عرفی پر کوئی حرف نہیں آئے گا اور نہ آپ کی عزت اور وقار مجروح ہوگا، اور نہ کوئی امتیازی سلوک روا رکھا جائے گا، آپ کا

مقام ومنصب اور مشاہرہ اسی طرح رہے گا جیسا اب تک رہا ہے حتیٰ کہ سالانہ جو اضافہ ہوتا رہا ہے وہ سلسلہ بھی جاری رہے گا، جب ناظم اعلیٰ نے یہ یقین دہانیاں کرائیں تو میں نے دل سے یہ خیال نکال دیا کہ میں یہاں سے کہیں جاؤں، اور تہیہ کرلیا کہ زندگی کے اخیر لمحہ تک جامعہ سے علیٰحدگی کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا، چونکہ اس گفتگو کے وقت مفتی صاحب موجود تھے اس لئے میرے سارے خدشات دور ہوگئے، میں وہاں سے مطمئن ہوکر اٹھا۔

حلقۂ احباب......................

بنارس میں میرے تعلقات انتہائی محدود ہیں، اس کے کچھ اسباب ہیں، میں بنارس میں ناظم اعلیٰ کی شخصیت کے علاوہ دو افراد سے متاثر ہوا اور دل کی گہرائیوں میں ان کی عظمت پیوست ہوگئی، ان کے اخلاص، اخلاق، علم وفضل، دین ودیانت، زہد وتقویٰ، وضعداری وپاسداری حقوق، ذکاوت وفطانت، علمی وتحقیقی بصیرت، دینداری وپاکیزہ نفسی، ان کی ذات پر مکمل اعتماد کا میرے دل ودماغ پر گہرا اثر پڑا، ان میں سر فہرست مفتی ابوالقاسم نعمانی ہیں، دوسری شخصیت مولانا ظفر احمد صدیقی کی ہے، ان کی قدر ومنزلت اور ان کے فضل وکمال کا دل سے معترف ہوں، اخلاص ان دونوں دوستوں کا سب سے گراں بہا کوہِ نور ہے جس کی آب وتاب کبھی کم نہیں دیکھی گئی، مولانا ظفر احمد کے مخلصانہ مشوروں نے میری علمی راہوں میں قدم قدم پر چراغ جلائے ہیں، ایسی مثالیں، ایسے افراد اس دسیسہ کار دنیا میں کمیاب ہیں۔

ذہنی سکون......................

ذہنی سکون اگر کسی انسان کو میسر آجائے تو دنیا کی سب سے بڑی دولت اس کو مل گئی، بندے پر خدا کا انعام واکرام ہے، مجھ جیسے بے عمل انسان پر صرف اس کا فضل

ہے، یہ دولت نہ مال وزر سے حاصل ہوتی نہ عیش وعشرت کے سامان کی کثرت سے، یہ ایک تہی دامن کو بھی نصیب ہوسکتی ہے، مجھے فخر ہے کہ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ دولت مجھے نصیب قدرت نے عطا کی ہے، اب میں پوری بے فکری کے ساتھ اپنی علمی سرگرمیوں میں مصروف ہوں، غم امروز وفردا سے آزاد ہوں، اب نہ بہتر کھانے کا شوق ہے نہ لباس فاخرہ کی خواہش ہے، اس لئے درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگیا، اور ہر سال ایک نئی کتاب شائع ہوجاتی ہے، اور اس کی پذیرائی ہوتی ہے، ایک کتاب کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسری کتاب کی داغ بیل پڑجاتی ہے، دن جامعہ اسلامیہ کا ہے اور رات میری، میرا رہوارِ قلم ہمیشہ رات کے سنّاٹے میں زیادہ خوداعتمادی کے ساتھ چلتا ہے، شور وشغب اور ہنگاموں کے وقت اس کی مثال ایسی ہوجاتی ہے جسے دیہات کے جانور چھتری دیکھ کر بدک جاتے ہیں، تقسیم کار کے اس اصول کی وجہ سے اپنے فرائض منصبی میں کبھی خلل نہیں آیا، ذہنی سکون اگر انسان کو مل جائے تو برسوں کا کام مہینوں میں ہوجاتا ہے، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے، ضخیم سے ضخیم کتابیں اتنے کم عرصہ میں مرتب ہوگئیں کہ احباب حیرت زدہ رہ گئے۔

نئی منزل، نئی راہیں ....

ایک دن ناظم اعلیٰ آئے اور کہا کہ چلئے قدرت اللہ گلزارِ تعلیم چلتے ہیں، یہ لڑکیوں کا اسکول ہے جو جامعہ اسلامیہ ہی کی طرح ایک شعبہ ہے اور اسی تنظیم کے ماتحت ہے جو جامعہ چلا رہی ہے، لڑکیوں کے اسکول سے میرا کیا سروکار؟ دل میں یہ خیال آیا، لیکن پھر میں نے اس خیال کو دماغ سے جھٹک دیا، کیونکہ جب یہ اسکول قائم ہوا تو اس کا بائیولاج میں نے ہی مرتب کیا تھا اور اسکول ہی میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں بائیولاج کی ایک ایک دفعہ پر غور کرکے اس کو منظوری دی گئی تھی، میں اس میٹنگ

میں شریک ہوا تھا، اور قدرت اللہ گلزارِ تعلیم جا چکا تھا، ایک بار ۲۶ / جنوری کو لڑکیوں کا تقریری پروگرام تھا اس کی تقریریں مجھ سے لکھوائی گئی تھیں، اس پروگرام میں ناظم اعلیٰ اور مفتی صاحب کے ساتھ مجھے بھی حکَم بنایا تھا، انعام کے سلسلہ میں ہمیں فیصلہ کرنا تھا، ہم دونوں نے پردے کی آڑ سے یہ پروگرام سنا تھا، ہم دونوں سے مشورہ کئے بغیر تیسرے رُکن نے از خود لڑکیوں کے اسٹیج پر جا کر تقریر بھی کی اور فیصلہ بھی سنا دیا، اور ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے، اور خاموشی سے واپس چلے آئے۔

ان واقعات کی وجہ سے قدرت اللہ گلزارِ تعلیم جانے میں کچھ زیادہ وحشت نہیں ہوئی، میں نے سمجھا اسی طرح کا کوئی پروگرام ہوگا، میں ان کے ساتھ اسکول چلا گیا، پرنسپل کو اطلاع کرائی گئی اور ہم لوگ پرنسپل کے دفتر میں پہونچ گئے، پھر جامعہ اسلامیہ کے سابق ناظم تعلیمات بھی آ گئے جن سے کبھی میری معرکہ آرائی ہو چکی تھی، اب وہ قدرت اللہ گلزارِ تعلیم کے بااختیار ناظم تھے، ہم تینوں پرنسپل کے کمرے میں بیٹھ گئے، میں خاموشی سے بیٹھا پردہ اٹھنے کا انتظار کرتا رہا۔

اعتماد اور اخلاص کے مظاہرے......................

سابق ناظم تعلیمات جامعہ جو قدرت اللہ گلزارِ تعلیم کے مستقل ناظم تھے ان سے میری لفظی جنگ ہو چکی تھی، الفاظ کا تعلق زبان سے ہے، اس لئے ضروری نہیں کہ اگر کسی سے تلخی و ترشی کے کچھ الفاظ حالات کی مجبوری میں نکل جائیں تو ان کی چوٹ کا داغ دل پر پڑ جائے، اگرچہ لفظوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جس کا زخم کبھی نہیں بھرتا۔

جراحات السنان لها التیام
وما یلتام ما جرح اللسان

لیکن ہماری یہ جنگ فضائی تھی الفاظ و آواز فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں، ہم

دونوں کی غصہ بھری آوازیں یقیناً فضا میں تحلیل ہوگئیں، دونوں کے دلوں میں اس زبانی جنگ اور الفاظ کے اسلحہ کا کوئی داغ، نشان نہیں پڑا تھا، اپنے دل کا حال تو میں خود جانتا ہوں، اس یکجائی کے وقت ان کا دل آئینہ کی طرح دمکتا ہوا نظر آیا، جب ہم دونوں قدرت اللہ گلزارِ تعلیم میں جمع ہوگئے تو انھوں نے اپنے بے داغ خلوص کا جو مظاہرہ کیا تو میں ان کی عظمت کا قائل ہوگیا، اسکول کے کئی معاملوں میں میں نے جو رائے دی، جو لائحۂ عمل تجویز کیا اس کو پوری بشاشت سے قبول ہی نہیں کیا بلکہ مجھے ہی سارے اختیارات دیدیئے، اور کہا کہ آپ کام کا خاکہ مرتب کردیں اسی کے مطابق کام ہوگا، پھر میری ذات پر ان کا اعتماد بڑھتا چلا گیا اور ایک مخلص دوست کی طرح میرے ساتھ معاملہ کرتے رہے، اس سلسلہ میں مجھے ان کی دو باتیں اب تک یاد ہیں جو ان کے خلوص وصدق دلی کی سند ہیں۔

ہندی اخبار نکالئے.........................

ایک بار یہ گفتگو آئی کہ بنارس سے ہندی کے کئی بڑے اخبارات نکلتے ہیں، یہ سارے اخبارات کٹر فرقہ پرستوں کے ہاتھوں میں ہیں، مسلمانوں کے خلاف فضا بنانے اور اشتعال پیدا کرنے میں ان کا سب سے اہم رول ہوتا ہے، میں نے کہا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ بنارس ہی سے مسلمانوں کا ہندی کا ایک معیاری اخبار نکالا جائے اور اخبار اس انداز پر نکالا جائے کہ قارئین کو پتہ نہ چلے کہ یہ مسلمانوں کا اخبار ہے، مسلمان لکھنے والوں کا نام بھی ہندی میں ترجمہ کردیا جائے جیسا کہ روس اور چین میں ہوتا ہے کہ عربی ناموں کا انھوں نے اپنی زبانوں میں ترجمہ کررکھا ہے اور اسی روسی اور چینی ناموں سے وہ معروف ہیں، مثلاً کسی رائٹر کا نام عبداللہ ہے تو اس کو بھگوان داس لکھا جائے، کسی کا نام نورالحق ہے تو اس کو ستیہ پرکاش لکھا جائے، عوامی ذہن ومزاج

کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہے، بنارس کے سارے اخبارات روزانہ منگائے جائیں وہ جو بھی زہر پھیلائیں اپنے اخبار میں اس کا تریاق فراہم کیا جائے تاکہ ہندو عوام جو ان اخبارات کی وجہ سے یک رُخ ہوکر مسلمانوں کے دشمن ہوجاتے ہیں دوطرح کی چیزیں پڑھ کر تذبذب کا شکار ہوجائیں کہ یہ بات سچی ہے یا وہ بات، اس سے بہتر نتیجہ کی توقع کی جاسکتی ہے۔

میری باتیں ان کے دل کو لگ گئیں، انھوں نے فوراً کہا کہ میں ابھی آپ کو پچاس ہزار روپئے دیتا ہوں، آپ اس کام کو ابھی چھوٹے پیمانے پر شروع کرادیں، میں نے کہا کہ اس طرح کے عطیات سے اخبارات کامیابی کے ساتھ نہیں نکل سکتے، آپ لوگ اس کو تجارت اور بزنس سمجھ کر کام کریں، اس کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، پریس خریدا جائے، کاغذ کا کوٹہ مقرر کرایا جائے، سرکاری اشتہارات حاصل کرنے کی تدابیر کی جائیں، اخبار کو ٹھیک وقت پہونچانے کے لئے جیپیں خریدی جائیں تب کوئی اچھا اور معیاری اخبار نکالا جاسکتا ہے، اس میں بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، یہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے، کچھ مسلمان ایک لمٹیڈ کمپنی بنا کر سرمایہ فراہم کریں اور اخبار کو بزنس بنادیں اور اس سے منافع حاصل کرنے کے امکانات پیدا کریں تبھی کامیابی ممکن ہے، پھر یہ بات ختم ہوگئی، اس واقعہ سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کا دل کتنا بڑا ہے اور میری ذات پر ان کو کتنا اعتماد ہے۔

ترقیاتی پلان......................

اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے، کہ محدود جگہ ہونے کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ کو اور اونچے پیمانے پر چلانے میں سخت پریشانی ہے، اس عمارت میں کسی سمت سے اضافہ کی گنجائش نہیں، اگر کوئی بڑا قطعہ زمین ہوتا تو آج جامعہ اسلامیہ کہاں سے

کہاں پہونچ گیا ہوتا۔

انھوں نے فوراً تجویز پیش کی کہ آپ فوراً ایک سوسائٹی رجسٹر کرالیجئے میں پانچ بیگھہ رام نگر روڈ پر دوں گا، جامعہ اسلامیہ کے لئے وہاں منصوبہ بند طریقہ سے عمارتیں بنوائی جائیں اور عصر حاضر کے معیار کے مطابق سارے شعبوں کے لئے الگ الگ عمارتیں ہوں، کھیل کے میدان ہوں، لائبریری کیمپس ہو، دارالمطالعہ کی الگ عمارت ہو، غرض کہ زمین کی تنگی سے کوئی منصوبہ تشنہ نہ رہ جائے۔

مگر یہ بات میرے بس سے باہر تھی، اس طرح کے کئی معاملے ہوئے جن کی وجہ سے مجھ سے ان کی قربت بڑھتی چلی گئی اور کبھی بھی پرانی باتوں کا اعادہ نہیں کیا، یہ ان کی عالی ظرفی تھی، قدرت اللہ گلزار تعلیم میں آگے چل کر کئی برس تک ہم دونوں ساتھ رہے اور بڑی خوش اُسلوبی سے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرتے رہے۔

رائیں اور مشورے.........................

ہم لوگ پرنسپل کے کمرے میں تھے، ناظم صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ اسکول میں تعلیم سرکاری نصاب کے مطابق ہو رہی ہے، لڑکیاں ہائی اسکول کے امتحان میں کامیابی کا اچھا ریکارڈ قائم کر رہی ہیں، لیکن یہ تعلیم تو ہر اسکول میں دی جاتی ہے، ہمارا مقصد عام اسکولوں سے الگ ہے، لیکن ہم اپنا دلی مقصد کیسے حاصل کریں ہمیں اس کا راستہ نظر نہیں آتا، اسکول کی تعلیم میں کن باتوں کی اور ضرورت ہے لڑکیوں کی صلاحیت میں مزید کس طرح اضافہ کیا جائے، ان کی تعلیم وتربیت میں خامی اور کمی کیا ہے؟ اور اس خامی اور کمی کو کیسے دور کر سکتے ہیں؟ بس یہی سوچنے کے لئے ہم لوگ یہاں آئے ہیں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس اسکول سے ہمارا مقصد اعلیٰ تعلیم دلا کر ملازمت کے لئے لڑکیوں کو تیار نہیں کرنا ہے، یہاں کی ۹۵ فیصد لڑکیاں ایسے

گھرانوں سے آتی ہیں جن کے ذہنوں میں ملازمت کا تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ ملازمت کو معیوب سمجھا جاتا ہے، بس ہم لوگ چاہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں تعلیم یافتہ ہوں، مہذب سماج میں باعزت جگہ بنا سکیں، تعلیم کے ذریعہ جو تہذیب اور سلیقہ آتا ہے اس کو اپنا کر اپنی گھریلو زندگی میں اپنا رول بہتر طور پر ادا کر سکیں، ہم اسکول میں اسی طرح کی تعلیم کے خواہاں ہیں۔

ناظم اعلیٰ کا روئے سخن میری جانب تھا، میں بالکل خالی الذہن تھا، کبھی ان باتوں کو سوچا ہی نہیں تھا، یک بیک جب یہ باتیں سامنے آئیں تو میرے پاس ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔

جائزہ اور نتیجہ......................

اسکول میں سرکاری نصاب پڑھایا جاتا ہے، میں اس نصاب سے جزوی طور پر واقف تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ ذریعہ تعلیم ہندی ہے، میں تاریخ کی کتاب جو نصاب میں ہے اس کو سرسری طور پر میں دیکھ چکا تھا، ہندو مذہبیات کے بہت سے اسباق نصاب کی کتابوں میں شامل ہیں اور یہ طے ہے کہ نصاب میں کتر بیونت نہیں ہوسکتی، نہ تغیر وتبدل ہوسکتا ہے، اس لئے یہ مان لیا جائے کہ نصاب تو مکمل پڑھایا جائے گا جو حکومت کا منظور شدہ ہے، جن لڑکیوں کی تعلیم اسی نصاب تک محدود ہوگی ان کے ذہن ومزاج پر ہندو مذہبیات کے تھوڑے بہت اثرات ضرور رہیں گے اور یہ سمِّ قاتل ہے، ساری لڑکیاں مسلمان ہیں اگر یہی نصاب پڑھ کر اپنی گھریلو زندگی میں آئیں تو مسلم معاشرہ اپنا خصوص وامتیاز بتدریج کھودے گا، اس کے سدباب کی کوشش ضرور کی جاسکتی ہے، بس یہی ایک گنجائش مجھے نظر آئی۔

میں نے ان حضرات سے کہا کہ مسلمان لڑکیاں اسکول کے سب کام ہندی

میں کرتی ہوں گی ، اس لئے ان کی ہندی اچھی ہوگی ، آئندہ اور بھی اچھی ہوجائے گی ، اُردو جو ایک ضمنی مضمون ہے اس میں وہ یقیناً کمزور ہوں گی اور مسلمان گھرانوں میں بغیر اردو کے کام نہیں ہوسکتا، اس لئے ان کی تعلیم کی افادیت محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ لڑکیاں ہندوؤں کی تاریخی اور مذہبی شخصیتوں سے تو خوب واقف ہوں گی ، لیکن اسلامی شخصیات اور دینی ومذہبی معلومات سے ایک دم نابلد ہوں گی ، بس انھیں دونوں خامیوں کو دور کرنے کی تدبیر کریں تو بہتر ہوگا۔

انھوں نے تجویز رکھی کہ لڑکیوں کا ایک جائزہ لے لیا جائے ، میں نے کہا کہ ساری لڑکیوں کا جائزہ تو دشوار بھی ہے اور بیکار بھی ، آپ نو اور دس درجے کی طالبات کو ایک کلاس روم میں کاغذ اور قلم کے ساتھ جمع کردیں تو جائزہ آسان ہوگا ، فوراً پرنسپل نے حکم جاری کردیا ، ایک کلاس روم میں دونوں درجات کی لڑکیاں سیٹوں پر بیٹھ گئیں تو ہم تینوں کلاس روم میں گئے اور ٹیچر کی جگہ تین کرسیوں پر بیٹھ گئے ، میں نے لڑکیوں سے تین چھوٹے چھوٹے جملے لکھوائے اور کہا کہ اپنے نام اور درجہ لکھ کر کاپیاں جمع کردیں ، جب ساری کاپیاں آگئیں تو دونوں کی کاپیاں الگ کرکے غلطیوں پر نشان لگائے ، کسی لڑکی نے تینوں جملے صحیح نہیں لکھے ، کسی نے دو ، کسی نے تینوں میں غلطیاں کیں ، اور یہ غلطیاں دونوں درجوں کی طالبات کی کاپیوں میں تھیں ، پھر میں نے دینیات کے بھی تین ہی سوالات کئے۔

خلفاءِ راشدین کے نام ترتیب وار بتاؤ ، کوئی جواب نہیں ،
رسول اللہ ﷺ نے کہاں سے کہاں ہجرت کی اور کیوں؟ خاموشی ،
ہمارے پیغمبر ﷺ کہاں پیدا ہوئے اور کہاں دفن ہیں؟ مکمل خاموشی ،

میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا؟ یہ مسلمان گھرانوں کی

لڑکیاں ہیں، جب ہائی اسکول کا امتحان دے کر گھر بیٹھیں گی تو اپنے باپ بھائی کو اُردو میں خط نہیں لکھ سکیں گی اور نہ اپنے بچوں کو صحیح دینی تربیت دے سکیں گی، پھر ایسی تعلیم سے کیا فائدہ؟

دل کو ٹھیس لگی.........................

پھر ہم تینوں پرنسپل کے دفتر میں آئے اور اطمینان سے بیٹھ گئے، چائے آئی تو چائے کے دوران دونوں حضرات نے کہا کہ ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے ہماری نگاہ میں آپ سے بہتر کوئی دوسرا نہیں، اگر آپ یہ ذمہ داری قبول کرلیں تو ہماری مشکل آسان ہوسکتی ہے، اب میں نے سمجھا کہ میرے بلانے کا کیا مقصد ہے؟ ان کو اسکول کے سارے حالات معلوم ہیں، وہ ان خامیوں سے بھی واقف ہیں، آج جو کچھ ہوا وہ صرف ایک ڈرامہ تھا اور کچھ نہیں، میرے دل میں بجلی کی طرح یہ خیال کوند گیا کہ شاید میرے ریٹائرمنٹ کے نتیجہ میں یہ کارروائی ہورہی ہے کیونکہ ایسے لوگوں سے اسی طرح کے گھٹیا کام لئے جاتے ہیں، خود قدرت اللہ گلزار تعلیم میں ایک ریٹائرڈ ٹیچر لڑکیوں کو اُردو پڑھا رہے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی میرے دل کو ایک چوٹ لگی اور جذبات کو ٹھیس پہونچی، میری آواز ایک دم مدھم ہوگئی، کئی منٹ تک میں اپنے خیالوں میں گم رہا پھر عقل نے دل سے کہا کہ اتنے جذباتی نہ بنو، بات تو مکمل ہونے دو، پھر دیکھا جائے گا۔

دوسری بات یہ کہ لڑکیوں کے اسکول میں جانا جہاں صرف عورتوں کی عملداری ہو میری غیرت وخودداری کے خلاف تھا، جہاں انسان جا کر مجرم بن جائے، اور سہا سہا سا رہے، اس جگہ جانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ لڑکیوں کے اسکول کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے، میں سوچنے لگا، خیالات کے بگولے دل کے صحرا میں اٹھنے لگے،

مستقبل کی فلم کی ریل میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی، ایک منظر سامنے آیا، میں اسکول گیا، گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی دیکھا کہ چند ٹیچر شانِ استغناء سے کھڑی باتیں کررہی ہیں، یا چند بڑی لڑکیاں اچھل کود کررہی ہیں تو میں کیا کروں؟ ان کو بے پردگی سے بچانے کے لئے خود پردہ کروں؟ ویسے ہی جیسے کوئی پردہ نشیں اجنبیوں کو دیکھ کر کرتی ہے؟ یہ کیسی ذلت وندامت کی بات ہے؟ میرے پندار اور وقار کا مینار زمین پر گر کر چور چور ہوجائے گا۔

یا پردہ نہ کروں اور درّانہ گھستا ہوا چلا جاؤں، تو ٹیچرس اور لڑکیاں کہیں گی کہ نئے ماسٹر صاحب بہت ہی بداخلاق اور بے شرم ہیں، دیکھ رہے ہیں کہ ہم لوگ بے نیازی اور بے پردگی کے حال میں کھڑے ہیں اور وہ گھستے ہوئے چلے آرہے ہیں، یہ اس سے بھی زیادہ روح فرسا اور شرمناک صورتحال ہوگی، ان حالات میں لڑکیوں کے اسکول میں جانا میرے دل کو کیسے منظور ہوتا، میں نے صاف انکار کردیا کہ مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

لیکن وہ لوگ پہلے سے طے کرچکے تھے کہ ان کو یہ ذمہ داری دینی ہے، میرے انکار کرنے پر ان کو ایک طرح سے تشویش ہوئی تو ناظم اعلیٰ نے اپنی عادت کے مطابق ایک لمبی گفتگو کی جس سے میں نے اندازہ کرلیا کہ ان کی اپنی بھی کچھ مجبوریاں ہین جن کی وجہ سے وہ مجھ سے اصرار کررہے ہیں، ان کی طویل گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ جس طبقہ سے یہ لڑکیاں ہمارے اسکول میں آتی ہیں وہ یہاں کا دولت مند اور دیندار مسلمانوں کا طبقہ ہے، ان کو اپنی بچیوں کی تعلیم سے ملازمت کرانے کا تصور بھی نہیں، وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں ناخواندہ اوراَن پڑھ لڑکیوں سے ممتاز ہوجائیں ان کو تہذیب وسلیقہ آجائے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہوجائے، اگر اسکول

کا نصاب پڑھ کر اپنی تعلیم ختم کر دیتی ہیں تو ہمارے معاشرے میں ان کی صلاحیتوں کا کوئی مظاہرہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے برعکس ہندوانہ ذہن ومزاج کے ساتھ ہندی الفاظ ان کی زبانوں پر ہوں گے، وہ ہندی میں اپنا کام کاج کریں گی، ہندی اخبار اور رسالے پڑھیں گی، اردو سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہوگا، مسلمانوں کی تہذیب کے آثار اورنشانیاں رُخصت ہوجائیں گی، ان باتوں کی وجہ سے ہمارے اسکول کی نیکنامی داغ دار ہوگی وہ کہیں گے کہ اسکول کی تعلیم بے فائدہ ہے اور ہم اس کی جواب دہی پر مجبور ہوں گے۔

اپنی صوابدید کے مطابق کام کیجئے......................

ناظم اعلیٰ نے جیسے میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا، اس لئے اس کو صاف کرنے کیلئے کہا کہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ یہاں کلاس لیں، یا ایک ٹیچر کی طرح کام کریں، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ آپ یہاں آکر جائزہ لیتے رہیں کہ لڑکیوں کو مسلم معاشرہ میں اپنا امتیازی رول کس طرح ادا کرنے کے لائق بنایا جائے، ہم آپ کو اپنی ذمہ داریوں میں شریک کرنا چاہتے ہیں، یہ بات انھوں نے اس انداز سے کہی کہ میں خاموش ہوگیا، میں سمجھ گیا کہ مجھے کاجل کی کوٹھری میں جانا ہی ہوگا، یہ میری دانشمندی کا امتحان ہے کہ میرے سفید دامن پر کوئی دھبہ نہ آنے پائے، خودداری اور ذمہ داری دونوں میں توازن قائم رکھوں، مجھے اپنے دل ودماغ سے کام لے کر سمندر میں سفینہ ڈالنا ہی ہوگا، جہاں استقبال کے لئے مگرمچھ منہ کھولے ہوئے نگل جانے کے لئے تیار ہیں، گرداب بھنور، موج وتلاطم کی فوجیں صف بہ صف کھڑی ہیں، اب خدا ہی اس بےبس اور مجبور کا ناخدا اور محافظ ہے، ہر چہ بادا باد، ما کشتی در آب انداختیم۔

انھوں نے پرنسپل سے کہا کہ آپ کچھ دیر کے لئے یہاں آیا کریں گے اور جو

تجویز رکھیں اس کے مطابق آپ ان کے ساتھ تعاون کریں گی ، پرنسپل ایک بنگالی خاتون ہیں جو جغرافیہ میں ایم اے ہیں، ان کا خاندان کئی پشتوں سے بنارس میں ہے اس لئے بنگالیوں کا مخصوص لب ولہجہ ختم ہو چکا ہے اور اردو صاف بول لیتی ہیں، جب ان کی تقرری کی بات آئی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی صرف بنگالی ہونے کی وجہ سے، انھوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں سے انتظامیہ کو اتنا متاثر کیا کہ سارا نظم ونسق ان کے ہاتھوں میں دیدیا گیا، اب وہ فل پاور پرنسپل ہیں ، پرنسپل نے سمجھا کہ یہ بھی انتظامیہ ہی کے ایک رُکن ہیں اس لئے انھوں نے ہر ممکن تعاون دینے کا وعدہ کیا اور مجلس ختم ہوگئی۔

تہذیب وسلیقہ پہلے، تعلیم بعد میں.........................

جامعہ اسلامیہ کی تدریسی ذمہ داری کے ساتھ اسکول کی دیکھ بھال (جو میرے ذہن ومزاج کے خلاف تھی) ابتداءً بوجھ محسوس ہوئی ،لیکن حالات سے سمجھوتہ کرنا ضروری تھا، میرا ذہن ابھی صاف نہیں تھا، کیونکہ کوئی طریقۂ کار متعین نہیں تھا، یہ راہ بھی مجھے ہی بنانی تھی ،شوخ ہرنیوں کو سنجیدگی ومتانت کی رفتار سکھانی کچھ آسان بات نہیں تھی ،انکو صرف چوکڑی بھرنا آتا ہے، یہی ان کی فطرت کے مطابق بھی ہے۔

انگریزی اسکول سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا،لیکن یہ معلوم تھا کہ ان میں مضامین کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ کسی نئے مضمون کی گنجائش نہیں ہوتی ہے، اس مشکل کو پیش نظر رکھ کر کوئی طریقۂ کار طے کرنا تھا، میرے پیش نظر اُردو زبان وتہذیب اور دینیات کی عام معلومات تھیں، اگر میں ان تینوں باتوں کو لڑکیوں کی دلچسپی کا موضوع بنا دیتا تو میں اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دوں گا۔

اُردو ایک مضمون کی حیثیت سے اسکول میں پڑھائی جارہی ہے، اس کے

لئے مستقل ایک ٹیچر ہے لیکن میں اردو کی اس تعلیم سے مطمئن نہ تھا، کیونکہ یہ طریقۂ تعلیم اس وقت مفید ہوسکتا ہے، جب طالبات میں اُردو کی اچھی صلاحیت پہلے سے موجود ہو، محض شاعروں کے حالات اوران کے کلام پر تبصرہ بلیک بورڈ پرلکھ کر بتا دینا کافی نہیں، تلفظ اور املا کی غلطیاں بدستور رہ جائیں گی، طبع زاد مضمون لکھنا تو ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا اس لئے میں نے سب سے پہلے ان کو خطوط نویسی کی شکل میں املا لکھانے کا فیصلہ کیا، اس سے طریقہ مکتوب نگاری کے علاوہ املا بھی درست ہوگا اور بتدریج طبع زاد مضمون کی راہ پر بھی ان کو لگایا جاسکتا ہے، میں یہی سوچ کر اسکول گیا۔

میں نے پرنسپل سے کہہ کر ہائی اسکول کی طالبات کی ایک گھنٹی خالی کرائی تھی اور کہہ دیا تھا کہ میں صوابدید کے مطابق لڑکیوں سے کام لوں گا، جب میں کلاس میں پہونچا، تو ساری لڑکیاں سروقد کھڑی ہوگئیں اور ادب سے سلام کیا، وہ سب بڑی عمر کی لڑکیاں تھیں، ان کے کھڑے ہونے سے خود مجھ کو حجاب آیا، میں لاکھ استاد سہی، میں غیر ہوں، اجنبی ہوں، میرا ان کا کوئی رشتہ نہیں، مجھے یہ بات پسند نہیں آئی، میں نے کہا آپ بیٹھ جائیں، لڑکیاں بیٹھ گئیں، میں نے کہا، آئندہ آپ میرے آنے پر کھڑی نہیں ہوں گی، اپنی سیٹوں پر بیٹھی رہیں گی اور سلام کریں گی، کیا آپ اس پر عمل کریں گی؟ سب نے کہا ''جی ہاں'' پھر میں نے کہا، میں کسی لڑکی سے کوئی سوال کروں گا تو میرے سوال کا جواب کھڑی ہوکر نہیں دیگی اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی جواب دیگی، کیا آپ اس کی پابندی کریں گی؟ جواب ملا ''ہاں کریں گے'' میں نے کہا یہ میرا پہلا سبق ہے، کیا سبق یاد رہے گا؟ جواب ''بالکل یاد رہے گا''

میرا مقصد.........................

میں اس سوال وجواب سے ان کی ہمت افزائی اور ان میں جرأت پیدا کرنا

چاہتا تھا تا کہ آئندہ کسی بات کے پوچھنے میں ان کو جھجک نہ ہو اور شرم کے مارے زبان سے بات ہی نہ نکل سکے، اس سوال وجواب سے لڑکیوں کے چہرے پر بتدریج بشاشت آتی جارہی تھی، اور یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ اس گفتگو میں دلچسپی لے رہی ہیں، پھر میں نے ان سے ایک بات کا اور عہد لیا، میرا مقصد یہ تھا کہ استاد اور شاگرد میں تہذیب کے دائرے میں جتنی بے تکلفی ہوسکتی ہے وہ لڑکیوں میں پیدا ہوجائے۔

میں نے کہا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اسکول میں گھریلو زبان بولتی ہیں، کیا یہ سچ ہے؟ جھینپی جھینپی دو تین آوازیں آئیں، جی ہاں، میں نے کہا آج آپ لوگ میرے سامنے اقرار کریں کہ جب تک آپ اسکول میں رہیں اپنی گھریلو زبان استعمال نہیں کریں گی، صرف اُردو میں بات کریں گی، آپس میں بھی اور اپنی باجیوں (ٹیچرس) سے بھی، اگر آپ اپنی بولی بولتی رہیں گی تو آپ میں اور ایک جاہل اور اَن پڑھ لڑکی میں کیا فرق رہ جائے گا، آپ دل میں یہ بات رکھیں کہ ہم تعلیم یافتہ ہیں، عام لڑکیوں سے ممتاز ہیں، کیا آپ اس کی پابندی کریں گی؟ یادر کھئے کوئی جھوٹا وعدہ ہرگز نہ کیجئے گا، دل میں پختہ ارادہ کر لیجئے تب جواب دیجئے، دو تین لڑکیوں کی عزم وارادہ سے بھرپور آوازیں آئیں، ہم بالکل اس کی پابندی کریں گی، باقی لڑکیوں نے پھنسی پھنسی آواز میں ان لڑکیوں کی تائید کی۔

اس سوال وجواب میں ۳۵ رمنٹ کی گھنٹی ختم ہوگئی، پورے وقت لڑکیوں کی دلچسپی برقرار رہی، گھنٹی ہوتے ہی میں کھڑا ہوگیا، میرے کھڑے ہوتے ہی ساری لڑکیاں کھڑی ہوگئیں، میں نے مڑ کر یہ منظر دیکھا تو میں کہا کہ یہ آپ لوگوں کی پہلی خلاف ورزی ہے، اس کے جواب میں دو تین لڑکیوں نے کہا، آپ نے اس کے لئے منع نہیں کیا ہے، میں لاجواب ہوگیا، جو شاگرد استاد کی بھول چوک پکڑے یہ اس کی

ذہانت کی دلیل ہوتی ہے، میں نے سمجھ لیا کہ لڑکیاں گاؤدی نہیں ذہین ہیں اور بہت کھلے ذہن کی ہیں، ان کو راستہ پر لگانا آسان ہوگا، میں نے کہا، اچھا اب میں منع کرتا ہوں، جاتے ہوئے میں آپ کو خدا حافظ کہوں گا، اس کے جواب میں آپ سیٹوں پر بیٹھی خدا حافظ کہیں گی، اور آپ جب کبھی کسی کو بھی رخصت کریں تو خدا حافظ کہیں، لڑکیوں نے اس بات کو گرہ سے باندھ لیا اور سال بھر میں ان کی زبان سے خدا حافظ کا لفظ برمحل ادا کرتے ہوئے سنتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔

تعلیم شروع ہوگئی........................

میں نے تعلیم کا آغاز اس طرح کیا کہ دو تین مہینے تک بول کر خطوط لکھواتا رہا اور پچاسوں خطوط لکھوا دیئے، جن میں املا کی بے شمار غلطیاں رہتی تھیں پھر بتدریج کم ہونے لگیں، میں غلطیوں کو ذہن میں رکھ لیتا، دو چار دنوں بعد ان الفاظ کو تحریر میں لانے کے لئے ایسے جملے لکھواتا جن میں یہ الفاظ آئیں، اگر دوبارہ پھر غلط لکھا تو اس کی کاپی پلٹ کر اپنی اصلاح جب دکھاتا تو اس کو سخت شرمندگی ہوتی، بعد میں یہ حکم دیتا رہا کہ جتنے غلط الفاظ لکھے ہیں ان کو دس دس بار لکھ لیا کریں، پھر ان کی کاپیوں کو جانچ کر اس کی تصدیق کر لیتا، اس طرح ان کا املا بڑی حد تک درست ہوگیا اور دو دو صفحے کے خطوط میں بھی شاید کہیں غلطی ہو جاتی تھی، پھر میں نے اپنا طریقہ بدل دیا، صرف مکتوب الیہ متعین کر دیتا اور خط میں فلاں فلاں باتیں، مثلاً گھریلو مسائل یا شہر میں ہنگامہ وفساد کے واقعات یا اسکول میں امتحانات یا لڑکیوں کے جلسے کی سرگرمیوں کو لکھنے کی ہدایت کرتا، لڑکیاں خود اپنے ذہن سے صفحہ دو صفحے کے خط لکھنے لگیں، سال کے آخر میں کوئی عنوان دے کر چھوٹے چھوٹے مضمون لکھوانا شروع کیا، سارا میٹر اور مواد میں زبانی بیان کر دیتا اور کہہ دیتا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو خوب سوچ سمجھ کر ترتیب

اور سلیقہ سے لکھو، اس طرح رفتہ رفتہ ان کی اردو کی صلاحیت بڑھتی چلی گئی، لڑکیاں بیشتر ذہین تھیں، اس لئے جلد راہ پر آ گئیں، ان کی بول چال، لکھنے پڑھنے میں کبھی کبھی کوئی غلطی ضرور ہو جاتی تھی لیکن عام طور پر زبان صاف ہوتی چلی گئی، اس کا اندازہ مجھے کئی موقعوں پر ہوا۔

آپ کا حکم سر اور آنکھوں پر.........................

ایک بار دسویں کلاس کی ہندی ٹیچر بدل گئی، ایک دوسری ٹیچر کو ہندی کا مضمون دیا گیا، لڑکیاں نئی ٹیچر پسند نہیں کرتی تھیں اور اس سے پڑھنے سے انکار کر دیا، پرنسپل نے لڑکیوں کو بلا کر ایک سے زائد بار سمجھایا مگر لڑکیاں راضی نہیں ہوئیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نئی ٹیچر سے نہیں پڑھیں گی، یہ صورتحال کئی دنوں تک رہی، پرنسپل کے لئے یہ بڑی پریشان کن بات تھی، انھوں نے مجھے صورتحال بتائی اور کہا کہ لڑکیاں صرف آپ کی بات مان سکتی ہیں، ہم لوگ سمجھا کر تھک چکے ہیں، آپ ان کو نئی ٹیچر سے پڑھنے کے لئے راضی کر دیں تو مہربانی ہوگی۔

میں اپنے وقت پر کلاس میں گیا، نفع نقصان سمجھا کر کہا کہ ٹیچر بدل جانے سے فائدہ ہی ہوگا نقصان نہیں، لیکن بات ان کی حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی اور صاف جواب دینے میں میری دل شکنی کا بھی ان کو شدید احساس تھا اور میری دل شکنی ان کو منظور نہیں تھی، لڑکیاں کشمکش میں پڑ گئیں، دیر کے بعد بڑی ہمت کر کے ایک لڑکی نے جو ساری لڑکیوں کی نمائندگی کر رہی تھی اور مخالفت کرنے میں سب سے زیادہ پُر جوش تھی، بڑی لجاجت سے کہا:

''آپ تو میڈم (پرنسپل) کی زبان سے بول رہے ہیں''

یعنی آپ کی بات ہوتی تو ہم تسلیم کر لیتے، آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر، دل نہیں

بھی چاہتا تب بھی ہم لوگ آپ کا حکم مان لیتے ،اتنی لمبی بات کو ایک مختصر اور خوبصورت جملے میں وہی لڑکی ادا کرسکتی ہے جو اُردو تعبیرات سے واقف ہو، اس کی بات سن کر میری طبیعت پھڑک اُٹھی کہ میری بات تو نہیں مانی لیکن میرا دل خوش کر دیا، میں مسکرا کر رہ گیا ، پھر کچھ نہیں کہا اور پرنسپل سے کہا کہ پہلی ٹیچر کو کلاس دیدیں، پرنسپل نے ایسا ہی کیا۔

چھٹی بھی ہے اور نہیں بھی ہے........................

ایک دن میں اسکول گیا، برسات کے دن باقی تھے، پانی برس کر کھل چکا تھا، راستے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے، بنارس کی گلیاں بھی کانپور کی گلیوں سے کسی طرح کم نہیں جس کے بارے میں کسی ظریف نے کہا تھا:

''آپ گھر میں، جوتا گلی میں''

کلاس میں صرف تین لڑکیاں تھیں، میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا، کیا آج چھٹی ہے؟ ان میں سے ایک لڑکی نے کہا ''اسکول میں چھٹی بھی ہے اور نہیں بھی ہے'' میں نے کہا اس کا کیا مطلب؟ تو اس نے وضاحت کی:

''اسکول کا گیٹ کھلا ہوا ہے، ٹیچرس موجود ہیں، اس کا مطلب ہے
کہ اسکول کھلا ہوا ہے، اور تعطیل نہیں ہے، کلاس میں لڑکیاں نہیں
ہیں، تعلیم نہیں ہو رہی ہے اس لئے اسکول میں چھٹی بھی ہے''

جواب اتنا بے ساختہ تھا کہ سب ہنس پڑے، مجھے خوشی ہوئی کہ گفتگو کا سلیقہ لڑکیوں میں آ رہا ہے، ادب اور تہذیب کے سارے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ان میں گفتگو کی صلاحیت بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ کلاس میں ہر لڑکی کی زبان رواں دواں اردو ہو چکی تھی، آپسی گفتگو ہمیشہ اردو ہی میں کرتی تھیں حتیٰ کہ لڑائیاں اور جھگڑے بھی اردو ہی میں کرتی تھیں، لیکن ان تمام خوش آئند باتوں کے ان کے دل میں چور بیٹھا ہوا

تھا جس کا اندازہ مجھے ایک بار ہوا۔

اُردو نظم بندی میں.........................

ایک بار ایک جلسہ کے موقعہ پر میں نے کہا کہ جس کے پاس جو نظم ہو لکھ کر لائے اور مجھے دکھادے کہ تاکہ فیصلہ کیا جائے کہ اس کے پڑھنے کا موقعہ ہے یا نہیں؟ دوسرے دن لڑکیاں نظمیں لکھ کر لائیں، ان میں سے کئی لڑکیوں نے اردو نظموں کو ہندی رسم الخط میں لکھا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ان لڑکیوں کو اردو لکھنے میں تکلف تھا اور ان کو زحمت محسوس ہوتی ہے یا کم از کم جھجھک ضرور ہے اس کی تہ میں راز یہ تھا کہ اردو میں لکھنے کے وقت املا کی غلطی کا اندیشہ تھا اس لئے آسان طریقہ یہ معلوم ہوا کہ ہندی میں لکھ لیا جائے، اس دن خلاف معمول میں نے برہمی کا اظہار کیا، ہندی میں لکھنے والی لڑکیوں نے معذرت کی اور آئندہ ہر تحریر اردو میں لکھ کر لانے کا عہد کیا۔

پنبہ کجا کجا نہم.........................

دینیات کی جنرل معلومات کے سلسلہ میں ابھی کوئی طریقۂ کار متعین نہیں کر سکا تھا کہ ربیع الاول کا مہینہ آگیا، ذہن میں ایک خیال بجلی بن کر کوندا اور مجھے راستہ نظر آگیا، میں نے ناظم شعبہ سے کہا کہ آپ لوگ یوم جمہوریہ ۲۶/جنوری کو اور یوم آزادی ۱۵/اگست کو دھوم دھام سے مناتے ہیں اور اسکول میں جلسے کرتے ہیں، وہ تو آپ لوگ خانہ پُری کے لئے کرتے ہیں، مگر خرچ بہت کرتے ہیں، ان تقریبات پر زیادہ توانائیاں صرف کرنے کی ضرورت نہیں، قدرت اللہ گلزارِ تعلیم ایک اقلیتی ادارہ ہے مسلمانوں کا قائم کردہ اسکول ہے، اسکول پر مسلمانوں کی چھاپ رہنی چاہئے، علی گڈھ یونیورسٹی میں، جامعہ ملیہ دہلی میں سالانہ سیرت کے جلسے اسی لئے ہوتے ہیں، اس لئے آپ لوگ بھی اپنے اسکول میں سیرۃ النبی کے جلسے کو پورے اہتمام سے

منانے کا پروگرام بنالیں تو کہیں بہتر ہوگا، سیرۃ النبی کا یہ جلسہ مسلم ادارہ کی شناخت بھی ہے اور ضرورت بھی۔

انھوں نے بلا تامل میری تجویز مان لی اور کہا کہ آپ پروگرام بنائیں، ہم لوگ اس کے لئے بالکل تیار ہیں، اسی مجلس میں ربیع الاول کی ایک تاریخ طے کردی گئی میرا اس سے مقصد یہ تھا کہ دینیات کو لڑکیوں کے لئے ایک دلچسپ موضوع بنادیا جائے اور ایسے حالات بنادیئے جائیں کہ ان کو از خود دلچسپی پیدا ہوجائے، سیرت پاک کے موضوع پر اور سیرت کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں لکھ کر ان کو یاد کرادیا جائے اور اسلامی تاریخ کے ایمان افروز واقعات ان کو ذہن نشین کرادیئے جائیں، عہد رسالت اور عہد صحابہ کے حالات پر اس انداز میں تقریریں لکھی جائیں کہ ان کی ذہنی وفکری تربیت ہو اور ان کے دل ودماغ میں یہ باتیں رچ بس جائیں۔

جلسہ سیرۃ النبی........................

میں نے سیرت کے جلسے کا باقاعدہ پروگرام بنایا، ایک لڑکی کو صدر استقبالیہ نامزد کیا اور اس کو خیر مقدمی تقریر لکھ کر دی، جس میں مہمان عورتوں کا استقبال اور خیر مقدم، اپنے اسکول کا تعارف، اس کے طریقۂ تعلیم کے امتیازات، جلسہ کی اہمیت اور غرض وغایت، جلسہ کے پروگرام کا اجمالی تعارف، آخر میں مہمان خواتین اور انتظامیہ کا شکریہ، یہ سب کچھ تھا۔ درجنوں لڑکیوں کو منتخب کرکے تقریریں لکھ کر دیں، نعتیں اور نظمیں زبانی یاد کرائیں، نظام الاوقات میں ۳۵ رمنٹ کی ایک گھنٹی خالی کراکے ہر ٹیچر کو اپنے کلاس کی لڑکیوں کو تیاری کی نگرانی سپرد کی، پورے اسکول میں خوشگوار فضا اور چہل پہل پیدا ہوگئی، دودن قبل ہزاروں دعوتنامے سائیکلو اسٹائل کرکے تمام بچیوں کے ذریعہ ان کے گھر اور خاندان کی خواتین کو بھیجے گئے اور جب جلسہ کی تاریخ آئی تو بڑی

لڑکیوں کو مہمان خواتین کا استقبال کرنے اور اور کرسیوں تک رہنمائی کرنے کے لئے مقرر کیا، گھر گھر جلسہ کی تاریخ کا انتظار کیا جانے لگا، خواتین کی اتنی بڑی تعداد جلسہ میں شرکت کے لئے آئی کہ اتنا وسیع وعریض اسکول کا ہال تنگ پڑ گیا اور سیکڑوں خواتین نے کھڑے ہوکر کارروائی دیکھی اور سنی، چونکہ خالص عورتوں کا جلسہ پہلی بار ہو رہا تھا اس لئے خوب شہرت تھی، یہ جلسہ گراؤنڈ فلور کے ہال میں ہو رہا تھا اوپر کی منزل ایک دم خالی ہوگئی، اوپر جانے کا راستہ بھی الگ تھا اس لئے انتظامیہ کے ارکان بڑی تعداد میں پروگرام سننے کے لئے موجود تھے، جلسہ کی کارروائی کا آغاز ایک لڑکی نے جلسہ کی صدارت کی تجویز سے کیا، اس نے اسٹیج پر آکر جلسہ کی اہمیت کو مختصر لفظوں میں بتاتے ہوئے ایک ممتاز ٹیچر کا نام صدارت کے لئے پیش کیا ، دوسری لڑکی نے کھڑے ہوکر اس کی تائید کی اور درخواست کی کہ صدر صاحبہ تشریف لائیں اور کارروائی کا آغاز فرمائیں تو لوگ حیرت زدہ تھے، اور جب تلاوت قرآن کے بعد صدر استقبالیہ کی حیثیت سے ایک لڑکی نے بڑے منجھے ہوئے لب ولہجہ میں تقریر کی، مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اسکول کی تاریخ، طریقۂ تعلیم، اسکول کے ماحول کی عمدگی، عام اسکولوں پر اپنے اسکول کی فوقیت پر شاندار لفظوں میں تعریف کرتے ہوئے جلسہ کے پروگرام کا اجمالی تعارف کرایا اور آخر میں پھر ایک بار انتظامیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقریر ختم کی تو ارکانِ انتظامیہ حیرت زدہ رہ گئے، ہر ایک دوسرے کی جانب حیرت ومسرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، ان کو تعجب اس بات پر تھا کہ چند دنوں میں اتنا بڑا انقلاب ہوگیا کہ لڑکیوں میں اتنی ہمت وجرأت پیدا ہوگئی کہ ہماری لڑکیاں اتنی عمدہ، اتنی بے جھجھک تقریر کرسکتی ہیں؟

پھر دوسری لڑکیوں نے تقریریں کیں، نظمیں پڑھیں، کہیں بھی لڑکیوں نے یہ

احساس پیدانہیں ہونے دیا کہ ہم پہلی بار اسٹیج پر آئے ہیں یا ہم نو آموز ہیں، جلسہ میں آنے والی خواتین کے لئے یہ حیرتناک مشاہدہ ان کے خیال وتصور سے بھی زیادہ تھا، وہ سوچ نہیں سکتی تھیں کہ ہماری لڑکیاں اتنے بڑے مجمعے میں اس بے باکی اور جرأت اور ٹھہرے ہوئے لب ولہجہ میں خطاب کرسکتی ہیں، ان کو حیرت اس بات پر تھی کہ ہماری لڑکیاں دین ومذہب کی وہ باتیں بتاتی ہیں جو بڑے بڑے علماء اپنی تقریریوں میں بتاتے ہیں، لڑکیوں کی گھروں میں خوب تعریفیں ہوئیں، انتظامیہ کے اراکین اپنی کارگذاری پر فخر محسوس کرنے لگے، ایک دوسرے سے اس کا تذکرہ کرتے ہر مجلس میں ہفتوں اس جلسہ کا ذکر چلتا رہا، لوگوں کو اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوا، بعد کے سالوں میں تو انھیں لڑکیوں میں سے بعض نے طبع زاد بروقت برجستہ تقریریں کر کے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا۔

ایک سال کے تجربے کے بعد.......................

میں نے پورا سال تجربوں میں گزارا، لڑکیوں کی خامیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لیتا رہا اور ان پر غور کرتا رہا، عملی طور پر ان کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن یہ میری ذہنی اُپج تھی کوئی طے شدہ شاہراہ نہیں تھی کہ آئندہ اس شاہراہ پر کوئی دوسرا چل سکے، میں بہر حال یہاں عارضی طور پر جبراً لایا گیا ہوں، جوں ہی حالات سازگار ہوئے میں اسکول چھوڑ دں گا، دل میں یہ پختہ ارادہ تھا، اس لئے میں نے جو طریقۂ کار اختیار کیا اس کی افادیت بھی سامنے آئی تو اس کو مستقبل میں جاری رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسی نصابی کتاب لکھ دی جائے جو آنے والے ٹیچرس کے لئے گائڈ کا کام کرے، جب پہلا سال ختم ہوا تو میں نے اس کتاب کی ترتیب کی طرف توجہ کی اور ''گلزار تعلیم'' کے نام سے ۱۰۰ رصفحات پر مشتمل ایک کتاب مرتب کردی، اس میں ضرورت کے مطابق دینی معلومات، کچھ تاریخی اور ملکی حالات اور کچھ تاریخی نظمیں

رکھیں ، میرا مقصد یہ تھا کہ دینی معلومات کے ساتھ لڑکیوں کو طبعزاد مضمون لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو، تاریخی نظموں کو خصوصیت سے رکھنے کی وجہ یہی تھی کہ نظم میں جس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے لڑکیاں اس واقعہ کو نثر میں لکھیں اور نثری مضامین تلخیص کرنے کی ہدایت دی گئی۔

انتظامیہ نے دوسرے سال اس کتاب کو طبع کرادیا، اور ''قدرت اللہ گلزار تعلیم'' کے نصاب میں شامل کردیا، اب اس کتاب کی مدد سے املا کا بھی کام لیا جاسکتا ہے اور صحت زبان کا بھی۔ دینی معلومات فراہم کرنا تو اس کتاب کا مقصد ہی تھا، بعد میں میں نے نویں کلاس کی لڑکیوں کے لئے تو پہلا ہی طریقۂ کار رکھا، دسویں درجہ کی طالبات کو گلزار تعلیم کے ذریعہ تعلیم دینے لگا۔

میں جتنے دنوں کام کرتا رہا، پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کرتا رہا، ماحول کی نزاکت بھی میرے پیش نظر رہی ، ہر طرح کی اخلاقی نگرانی کے ساتھ آزادروی کے امکانات پر بھی نظر رکھتا تھا، لڑکیوں میں عزت واحترام کے ساتھ تمام ٹیچرس پر بھی اثر انداز تھا، اکثر اپنی پریشانیاں میرے سامنے رکھتیں اور میں انتظامیہ کے ذریعہ ان کی پریشانیاں دور کرتا رہا، ان اسباب کی وجہ سے انتظامیہ نے ٹیچروں کے انتخاب میں بہت سے اختیارات دے رکھے تھے، ترقی وتنزلی، انٹرویو وغیرہ میں میری رائے کو ترجیح حاصل تھی، کئی ٹیچرس کو میں نے از خود رکھ لیا اور ان کو کلاس بھی دلوادی اور بعد میں انتظامیہ نے منظوری دی، انتظامیہ نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔

نظم ونسق میں تبدیلی.........................

انتظامیہ میں دو گروپ ہوگئے، مخالف گروپ طاقتور ہوگیا، انتخاب میں وہ کامیاب ہوگیا، نئے عہدیداران آگئے، ان کے بارے میں مجھے شرح صدر نہیں تھا،

جو صاحب ناظم اعلیٰ ہوئے وہ پہلے ہی سے مجھے اپنا حریف سمجھتے تھے، ان کے خیال تھا کہ سابق انتظامیہ کی اکثر کارروائیوں میں ان کا ہاتھ رہتا ہے، ایک بار ان سے سوال و جواب بھی ہو چکا تھا، وہ پرائمری درجات کے انچارج تھے اور اس عہدے سے سبکدوش کئے گئے تھے، تو اس سبکدوشی میں بھی ان کو میرا ہاتھ نظر آیا تھا اور مجھ سے باز پُرس کرنے کے لئے میرے کمرے پر آگئے تھے، اس لئے ایسے ذمہ دار کی ماتحتی میں کام کرنے میں کئی خطرات تھے، وہ اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد اپنا ایک مضبوط گروپ بنا چکے تھے، اور اپنے مخالفین سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچنے لگے تھے۔

چارج لینے کے کچھ ہی دنوں بعد وہ ''قدرت اللہ گلزار تعلیم'' میں آئے اور کلرک سے میرے بارے میں پوچھا کہ ان کو کیا حق المحنت ملتا ہے، کلرک نے بتایا کہ وہ کوئی حق المحنت نہیں لیتے ہیں، وہ رضا کارانہ اسکول کو دیکھتے ہیں اور کام کرتے ہیں اس کا کوئی معاوضہ انھوں نے کبھی نہیں لیا، یہ باتیں دوسرے دن کلرک نے مجھ سے بتائیں، تو میں نے دل میں کہا کہ خطرہ کا الارم ہو گیا، اب میں ایام گذشتہ کے بعض واقعات کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لینے لگا، مجھے دو سال پہلے کی ایک بات یاد آئی۔

الزام تراشی کے بہانے ....

ایک لڑکی انتہائی ذہین و فطین، انشا پردازی کی اچھی صلاحیت کی مالک تھی، وہ میرے درجہ میں طبعزاد خطوط لکھنے میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی، میں نے اس کی کاپیاں دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ اگر اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی نظر رکھی جائے تو ہلکے پھلکے مضامین جلد لکھنے لگے گی، میں نے عام لڑکیوں کے ساتھ اس پر خصوصی توجہ دی اور چھوٹے چھوٹے مضامین لکھوانے لگا، اس کو انشا پردازی کا بہت شوق تھا، وہ رسالے منگاتی تھی اور پڑھتی تھی، کچھ عرصہ بعد میں نے ایک تجربہ کیا، اس کو دو تین

کتابیں دے کر کہا کہ ان کتابوں میں فلاں فلاں حصوں کا مطالعہ کر کے ایک مضمون لکھو، اس نے ایک ہفتہ کی محنت کے بعد جو مضمون لکھا وہ اتنا اچھا تھا کہ اس کی اصلاح کے بعد اس لائق تھا کہ اس کو معمولی رسالوں یا اخبار میں شائع کیا جا سکتا تھا، میں نے کہا کہ آوازِ ملک میں نو آموزوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں، تم چاہو تو مضمون نقل کر کے ڈاک سے بھیج دو، اس نے ایسا ہی کیا، مضمون اخبار میں آ گیا، موجودہ ناظم اعلیٰ کے ذہن میں سازش کے بچھو رینگنے لگے اور اپنے ایک ہم خیال رُکن کو لے اس بچی کے گھر چلے گئے، محلّہ کا معاملہ تھا، آپس میں رشتے ناطے بھی تھے، عزیز و اقارب کی طرح گھر والوں سے ملے، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بچی کی تعلیم کے بارے میں پوچھا اور پھر اس کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ بیٹی تم مضمون بھی لکھتی ہو؟ اس نے کہا ''جی'' ان لوگوں نے کہا ذرا اپنی کاپیاں دکھاؤ کہ تم کیسے لکھتی ہو؟ اس نے چار پانچ کاپیاں اصلاح شدہ ان کے سامنے لا کر رکھ دیں، وہ دونوں بغور ان کاپیوں کا مطالعہ کرنے لگے، اس کی تہ میں راز یہ تھا کہ ان کو یقین تھا کہ لڑکیوں میں مضمون لکھنے کی صلاحیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی بالخصوص ہمارے معاشرے کی لڑکیوں میں تو ممکن ہی نہیں ہے، استاد نے لکھ کر لڑکی کے نام سے شائع کرا دیا ہے، اگر اس کا ثبوت مل جاتا ہے تو اسکول کے ساتھ مجھے بھی موردِ الزام بنا دینے کی پوری سازش تھی، یعنی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ جب کاپیاں دیکھیں تو ان کا نشہ ہرن ہو گیا، ؎

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال ست

وہی مضمون جو اخبار میں آیا تھا اس کا اصل مسودہ کاپی میں موجود تھا، پہلی بار جب اصلاح کے لئے آیا تو اس ورق پر مضمون بدلنے کی ہدایت درج تھی، پھر وہی مضمون جب دوبارہ لکھ کر اصلاح کے لئے آیا تو پیراگراف میں باہمی ربط کا فقدان تھا

ان پر نمبر شمار دے کر تقدیم و تاخیر کی ہدایت لکھی ہوئی تھی، تیسری بار پھر وہی مضمون ہدایتوں کے مطابق لکھا گیا تو ترتیب اور پیراگراف کا باہمی ربط اور جملے صحیح اور درست تھے، بعض جزوی ترمیم کی گئی، اسی مسودہ کو نقل کر کے لڑکی نے اخبار کو بھیجا تھا، ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ لڑکی نے اپنی محنت اور صلاحیت کے بل پر یہ مضمون لکھا اور اتنی منزلوں سے گذر کر تب اخبار میں شائع ہونے کے لائق ہوا ہے۔

خوئے بدرا بہانۂ بسیار......................

یہ باتیں بہت دنوں پہلے کی ہیں، جب ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، جب ناظم اعلیٰ کے عہدے پر وہ فائز ہو گئے تو ایک بار وہ اسکول آئے اور ہائی اسکول کی لڑکیوں کی کاپیاں منگوائیں جو میں لکھواتا تھا، دو درجن کے قریب کاپیاں تھیں، وہ گھنٹوں ان کا مطالعہ کرتے رہے، دوسرے دن پرنسپل نے مجھے یہ واقعہ بتایا، یہ سن کر دل پر چوٹ لگی اور طبیعت بجھ گئی، میں نے اس دن اسکول کا کوئی کام نہیں کیا اور اُلٹے پاؤں واپس آ گیا، اور یہ عزم کر کے آیا کہ دوبارہ اسکول نہیں آنا ہے، بعد میں ان کے اظہارِ ندامت اور خوشامدوں کے باوجود میں اسکول نہیں گیا اور صاف انکار کر دیا، میں نے سمجھ لیا کہ لڑکیوں کا اسکول ہر مرد کے لئے چاہے وہ عمر کی کسی بھی منزل میں ہو، کاجل کی کوٹھری ہے، آپ کے سفید دامن پر کالکھ نہ لگے تب بھی دھبہ تو لگ ہی سکتا ہے، مجھے اپنی عزت عزیز ہے، اپنی غیرت و خودداری عزیز ہے، اپنی نیکنامی بہت قیمتی دولت ہے، میں اپنی زندگی کے اخیر لمحوں تک ان کی حفاظت کروں گا، میں نے پورے عزم کے ساتھ ترکِ تعلق کا قدم اُٹھایا تھا، تین سال بعد جب دوبارہ انتخاب میں ان کو شکست ہوئی اور دودھ کی مکھی کی طرح انتظامیہ سے نکال دئے گئے اور سابق ناظم اعلیٰ پھر اپنے عہدے پر آئے تو انھوں نے اسکول کے سلسلے میں پھر گفتگو کی تو میں نے ان

سے بھی معذرت کرلی اور اسکول جانے سے انکار کردیا۔

دورۂ حدیث......................

اسکول سے وابستگی میرے ذہنی خلجان کا باعث بنی رہی، میری علمی سرگرمیوں میں فتور پڑا، اسکول کے بہت سے پروگراموں میں مجھے مجبوراً دخل دینا ہی پڑتا تھا، جب ترک تعلق کرلیا تو ذہنی سکون حاصل ہوا، اور میں نے اپنی زندگی جامعہ اسلامیہ کی چہار دیواری میں محدود کرلی، جامعہ میں تعلیم عربی ششم تک تھی، میری خواہش تھی کہ جامعہ کو ایک مکمل ادارہ کی شکل دیدی جائے اور دورۂ حدیث قائم کرکے اس کی تکمیل کردی جائے، لیکن انتظامیہ اس پر کسی طرح راضی نہیں تھی، ان کے سامنے کچھ دشواریاں تھیں جو ان کے ذہن کی پیدا کردہ تھیں، درحقیقت وہ کچھ نہیں تھیں۔مفتی ابوالقاسم نعمانی اب صدرِ جامعہ تھے، دس سالوں کے تجربے سے ان کی علمی صلاحیتوں کا مرعوب کن احساس میرے دل میں پیدا ہوچکا تھا، میں نے دیکھا کہ ہر علم وفن کی کتابوں پر ان کو مکمل عبور حاصل ہے، فقہ وفتاویٰ تو ان کا خاص فن ہی تھا، عربی صحافت ان کی گھٹی میں پڑی ہے، منطق وفلسفہ کی ساری کتابیں وہ کھنگال چکے ہیں، جلسوں میں ان کی تقریریں احادیث کا سبق بن جاتی ہیں، ذہانت وذکاوت خداداد ہے، اس لئے میں نے اپنے ذہن میں دورۂ حدیث کا خاکہ بنالیا تھا، مفتی صاحب سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی رہتی تھی، انھیں سے مجھے معلوم ہوا کہ انتظامیہ کی اصل دشواری یہ ہے کہ دورۂ حدیث قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زادِ راہ باندھ کر پورے ملک میں شیخ الحدیث تلاش کیا جائے اور یہ کام ان کے بس کا نہیں، اس لئے دورۂ حدیث قائم کرنے کے حق میں نہیں ہیں، اس کا حل میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھا، ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی دامت برکاتہم کی ذاتِ گرامی اپنے علم

وفضل، زہدوتقویٰ میں اپنی مثال آپ ہے،انھوں نے ہمارے مفتی صاحب سے ایک سے زائد بار فرمایا کہ آپ لوگ دورۂ حدیث کیوں نہیں قائم کرتے ؟ یہ ساری باتیں میرے حافظہ میں تھیں اور میں کسی مناسب موقعہ کی تلاش اور انتظار میں تھا۔

۱۹۸۸ء میں اپنے لڑکے جمیل احمد سلّمہٗ کو دیوبند بھیجا، وہ جامعہ اسلامیہ سے عربی ششم پڑھ کر گیا تھا،لیکن وہ دوتین نمبروں کی کمی کی وجہ سے میرٹ لسٹ میں نہیں آسکا، مولانا ارشد مدنی کو میں نے اپنے تعلقات کی بنیاد پر سفارشی خط بھی لکھ دیا تھا، انھوں نے بغیر پڑھے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا، یہ سن کر میرا خون کھول گیا، یہ واقعہ میرے جذبات کے لئے مہمیز کا کام کرگیا،جمیل احمد بنارس آ گیا۔

اتفاق سے ناظم اعلیٰ اور ناظم تعلیمات دونوں ایک ساتھ دفتر میں آئے ، اسی دن مفتی صاحب کی موجودگی میں میں نے کہا کہ امسال دورۂ حدیث قائم ہوگا ، ان دونوں حضرات نے کہا کہ شیخ الحدیث کہاں سے لائیں گے؟ میں نے کہا کہ وہ تو ہمارے درمیان موجود ہی ہیں ، اہل علم کو اہل علم پہچانتے ہیں ، ہم لوگ شیخ الحدیث تلاش کر چکے ہیں ، میں نے حضرت مفتی صاحب کی طرف اشارہ کردیا ، میں نے کہا بس آپ حضرات ہاں کہہ دیجئے ، سارا کام ہم خود انجام دیں گے ،انھوں نے حامی بھر لی ،مگر کہا کہ کتابوں کا بندوبست بھی آپ ہی لوگوں کو کرنا ہے،ہم نے یہ منظور کرلیا۔

صدرِ جامعہ مفتی صاحب کے سامنے اسباق حدیث کا خاکہ پیش کر چکا تھا کہ کون سی کتاب کون پڑھائے گا ،سارا نقشہ میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھا،صحاح ستہ کی فراہمی کا مسئلہ سامنے آیا تو مفتی صاحب کے اثرات نے چشم زدن میں اس مسئلہ کو حل کردیا، میں ان کے ہمراہ دو دن لوگوں کے پاس گیا، پھر تنہا مفتی صاحب نے اپنے رسوخ سے کام لیا،تقریباً ۳۲؍ ہزار روپئے جمع ہوگئے ،اور خود ایک رفیق سفر کے

ساتھ دہلی اور دیوبند سے کتابیں خرید لائے۔

پہلے سال دس لڑکے دورۂ حدیث میں شامل ہوئے، یہ پہلے دن ہی سے طے کرلیا گیا تھا کہ ختم بخاری کے فوراً بعد اسی سال فارغ ہونے والوں کو دستارِ فضیلت دیدی جائے گی اور جلسۂ عام میں دستار بندی کردی جائے گی، اس کے لئے لمبا چوڑا پروگرام نہیں بنایا جائے گا، خدا کے فضل وکرم سے آٹھ سال ہوگئے ہر سال دورۂ حدیث میں طلبہ کم وبیش رہتے ہیں، یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا، ہر سال حافظوں، قاریوں اور مولویوں کو جلسۂ عام میں دستارِ فضیلت باندھی جارہی ہے اور عوام کے سامنے جامعہ کی کارگزاری آجاتی ہے۔

صدارت کا مسئلہ........................

جامعہ کی انتظامیہ میں چونکہ اہل علم نہیں اہل ثروت ہیں، اس لئے مالی اعتبار سے یہ ادارہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، لیکن علمی ترقی اور تعلیم نظام میں بہتری اور شعبہ عربی کو آگے بڑھانے اور ترقی یافتہ معیار پر اس کو چلانے کے بارے میں کم ہی سوچتے ہیں، یہ بات ان کے ذہنی حدود سے باہر کی بات ہے، ایک شخصیت ضرور ایسی تھی جو انتظامیہ اور تعلیمی نظام کے درمیان پل کی حیثیت رکھتی تھی، وہ مفتی ابوالقاسم نعمانی کی ذات تھی، جب وہ جامعہ اسلامیہ کے صدر بنائے گئے تو دل نے کہا ''حق بحقدار رسید'' جہاں ان کا علم وفضل، ذہانت وفطانت، زہد وتقویٰ، ہر شک وشبہہ سے بالاتر تھا، وہیں ان کی ذات پر پوری انتظامیہ ہی نہیں پوری جماعت کو مکمل اعتماد تھا، اسلئے جلد ہی تعلیمی ترقی کی راہیں کھلیں اور کچھ دور تک ادارہ اس پر چلا بھی، لیکن بعض ناخوشگوار حالات نے ان کے دل ودماغ میں ہلچل مچادی، دل میں ایک کھٹک ہلکی ہلکی پہلے سے چلی آرہی تھی کہ ایک واقعہ نے اس میں مزید شدت پیدا کردی، جس کا انجام بڑا ہی تلخ ہوا۔

جامعہ اسلامیہ عربک اینڈ پرشین بورڈ الہ آباد سے ملحق ہے، تنخواہیں گورنمنٹ ادا کرتی ہے، اس تنخواہ کو ناجائز تو کوئی نہیں کہتا لیکن متقشف علماء اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں، جب وہ ناخوشگوار واقعہ ہوا تو مفتی صاحب نے اس پہلو پر بھی غور کرنا شروع کر دیا، پھر دفتری کارروائیوں میں بھی کچھ جھول ہوتا ہے، اندراجات کے بارے میں یہ یقین مشکل ہے کہ وہ سو فیصدی درست ہیں، اہم ترین کاغذات پر صدر ادارہ کے تصدیقی دستخط ضروری ہیں، اس لئے محتاط دلوں میں کھٹک پیدا ہوسکتی ہے، شاید یہ بات بھی ان کے دل میں آئی، اور یک بیک انھوں نے اپنے مخلص احباب سے مشورہ کئے بغیر صدارت سے استعفاء دیدیا، استعفاء کا مطلب ادارہ سے بے تعلقی اور علیٰحدگی، یہ علیٰحدگی بڑے دوررس نتائج کی حامل تھی۔

میرے دل کو اس کارروائی سے بڑا دھچکا لگا، دل کسی طرح اس کو صحیح طریقۂ کار تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہوا، اس کے کئی اسباب تھے، یہاں جماعتی نظام کچھ زیادہ مضبوط نہیں، نہ عقیدہ کی صلابت ہے نہ دیوبندی مکتبۂ فکر کی پُر جوش وکالت، مزید ستم یہ کہ جماعت میں اقتدار کی کشمکش کے بھی آثار تھے اور جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو کر اور بھی کمزور ہوسکتی ہے، جماعتی شیرازہ بندی کی صلاحیت وقوت صرف مفتی صاحب کی ذات میں تھی، پورے علاقہ یا پوری جماعت کے کسی فرد میں یہ صلاحیت مجھے نظر نہیں آئی، دوسری بات یہ کہ مفتی صاحب ایک بااثر شخصیت کے ساتھ ساتھ اس ٹیم کے ایک فرد تھے جو تمام مخالف فرقوں کے خلاف اعلانِ جنگ کئے ہوئے ہے، ان کو ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا تھا، راہیں ہموار کرنی تھیں، عوام کے ناروا اور دل آزار سلوک کو برداشت کرنا تھا لیکن اپنے مشن سے ہٹنا ان کو زیبا نہیں تھا، شخصیت میں طاقت ادارہ سے وابستگی سے مزید آتی ہے، ادارہ سے علیٰحدگی اقدامی قوت کو کمزور کرتی ہے،

بسا اوقات قائد اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، اس لئے اس کی قوتِ کارکردگی متاثر ہوتی ہے، ان اسباب کی وجہ سے استعفاء کی خبر میرے لئے سوہانِ روح بن گئی، لیکن مفتی صاحب اپنے طرزِ عمل پر مضبوطی سے قائم رہے، پائے استقامت میں ذرا بھی جنبش نظر نہیں آئی، اس صورتحال پر غور کرنے کے لئے ناظم اعلیٰ نے مجھ سے مشورہ کیا اور بتایا کہ استعفاء کا واپس ہونا اب انتہائی مشکل ہو چکا ہے، مجبوراً کوئی دوسری راہ اختیار کرنی ضروری ہوگئی ہے، بہت غور وفکر کے بعد دل ایک تجویز پر مطمئن ہوگیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ صدارت سے استعفاء نہیں بلکہ منصب تدریس سے بھی استعفاء ہے، استعفاء کے منظور ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ سے کلی طور پر علیحدہ ہو جائیں گے، اور یہ جامعہ کی موت سے کم نہیں حادثہ ہوگا، اس لئے میری تجویز ہے یہ ہے کہ آپ کے یہاں دورۂ حدیث قائم ہے اور اہم ترین کتاب بخاری شریف اور ترمذی شریف وہ پڑھاتے رہے ہیں جو بالعموم ہمارے مدارس میں شیخ الحدیث پڑھاتے ہیں، آپ اپنے یہاں شیخ الحدیث کے منصب کا اضافہ کریں اور مفتی صاحب کو اس عہدے کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اس طرح جامعہ اسلامیہ سے ان کا تعلق اور وابستگی ہمہ وقتی ہو جائے گی۔

ناظم اعلیٰ نے بتایا کہ ان کو تنخواہ لینے سے بھی انکار ہے، وہ بغیر تنخواہ کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، میں نے کہا یہ اور خطرناک بات ہے، مفتی صاحب بھی انسان ہیں فرشتہ نہیں، بشر ہیں فوق البشر نہیں ہیں کہ رسولوں اور نبیوں کی طرح اپنے دل کو مخالفین کی نکتہ چینیوں اور اعتراضوں سے متاثر نہ ہونے دیں، فطری طور پر ان حالات سے انسان متاثر ہوتا ہے، کبھی کبھی دل کو بہت سخت چوٹ پہونچتی ہے، مفتی صاحب کو بھی یہ چوٹ پہونچ سکتی ہے، اس کے بعد اس کا ردعمل جو ہوگا اس پر قابو پانا دشوار تر

ہو جائے گا اور جب کبھی ایسی نوبت آئی تو مفتی صاحب جو رضا کارانہ خدمت انجام دے رہے ہیں اس سے بھی علیحدہ ہو جائیں گے کیونکہ وہ آزاد ہیں، اور مجبور نہیں رہیں گے اس لئے تنخواہ ضروری ہے، یہ ایک اخلاقی زنجیر ہے، اس کا پاس ولحاظ ہوگا، بورڈ کی تنخواہ کے بجائے آپ جامعہ کی آمدنی سے تنخواہ دیں اور مفتی صاحب کو مجبور کر دیں کہ وہ اس تنخواہ کو قبول کر لیں۔

اس وقت عام مدرسین کی تنخواہیں پندرہ سو سے زیادہ نہیں تھیں، ناظم صاحب نے شیخ الحدیث کے منصب کے لئے ڈھائی ہزار تنخواہ مقرر کر دی، پھر اور کیا مرحلے آئے مجھے خبر نہیں، لیکن انجام یہ ہوا کہ مفتی صاحب شیخ الحدیث ہو گئے، گاڑی اپنی پٹری پر آ گئی، جامعہ کا مستقبل بڑی حد تک محفوظ ہو گیا، ادارہ کے خیر خواہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

ذہنی خلفشار کے دور میں توجہ صرف ایک مسئلہ کے حل کرنے پر رہی، صدارت کا منصب جو خالی ہوا وہ خالی ہی رہ گیا، ناظم اعلیٰ نے ہم دونوں سے مشورہ کے بعد ایک استاد کو قائم مقام صدر بنا دیا، لیکن اس عہدے کے قبول کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد دفتر کا رویہ ان کے لئے باعث تشویش بن گیا، کئی مواقع پر ان کی خودداری اور انا کو ٹھیس پہونچی، اس تکلیف دہ رویہ کو وہ برداشت نہ کر سکے، ان کی بیزاری بڑھتی رہی، یہاں تک کہ انھوں نے صدارت کے عہدے سے استعفاء دیدیا، مسئلہ پھر الجھ گیا، بڑی طویل گفتگو کے بعد کچھ ذمہ داریوں کو انجام دینا تسلیم کر لیا اور انجام دیتے رہے، عملاً صدارت کی جملہ ذمہ داریوں کو انھوں نے قبول نہیں کیا، سالوں صدارت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا، الہ آباد بورڈ کو اس پر اعتراض تھا، انتظامیہ نے ایک اور مدرس کے بارے میں بدرجۂ مجبوری سوچنا شروع کیا لیکن انتظامیہ کے واقف کار مطمئن نہیں تھے، اس لئے

کوئی کارروائی آگے نہیں بڑھائی، تادم تحریر صدارت کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا ہے۔

''ترجمان الاسلام'' کا اجراء......................

جامعہ اسلامیہ میں میرے بلانے کا ایک مقصد ایک رسالہ کا اجرا بھی تھا، لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے دس بارہ سالوں تک وہ ساعت سعید نہیں آئی کہ یہ منصوبہ عملی شکل اختیار کرے، بات وہی سچ ہے: کل أمر مرهون بأوقاتها، ۱۹۹۰ء میں فیصلہ ہوا کہ جامعہ اسلامیہ سے ایک رسالہ شائع کیا جائے، کچھ عربی مدارس سے رسالے نکالے جاتے ہیں وہ سب ماہنامے ہیں، عملی طور پر اس سلسلہ میں جو دشواریاں ہیں میں ان سے واقف ہوں، اس لئے پہلے ہی دن سے میرا خیال ماہانہ رسالہ کے بجائے سہ ماہی رسالہ کا تھا، رسالہ کے اجرا میں مضامین کی فراہمی سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے، مدارس سے وابستہ ہمارے علماء کرام یوں ہی کوتاہ قلم واقع ہوئے ہیں وہ سال میں ایک ہی مضمون لکھ کر دیدیں تو سمجھ لیجئے کہ بڑا کرم کر دیا، یہی وجہ ہے کہ مدارس کے رسالے میٹر اور مواد کے لحاظ سے پست ہوتے ہیں، ایسے پامال، فرسودہ باتوں سے رسالہ بھرا ہوا ہوتا ہے کہ آدمی رسالہ اٹھاتا ہے، ادھر ادھر پلٹ کر رکھ دیتا ہے، پھر اس کو کبھی کھولنے کی نوبت نہیں آتی، کم پڑھے لکھے لوگ یا اس مدرسے کے حلقۂ اثر کے چند افراد رسالہ کی تعریف لکھ کر بھیج دیتے ہیں تو ان کو رسالے میں بطور سند چھاپ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارا رسالہ اہل علم کے نزدیک بڑا معیاری ہے، علمی و تحقیقی مضامین کے لئے وقت اور محنت درکار ہے، اہل علم و تحقیق سے روابط قائم کرنے کی ضرورت ہے، اہل علم، اہل قلم افراد کو نظر میں رکھ کر ان سے تقاضے اور اصرار کر کے مضامین حاصل کرنے کی ضرورت ہے، تبھی جا کر کوئی معیاری رسالہ نکالا جاسکتا ہے۔

اس لئے طے یہی کیا گیا کہ رسالہ سہ ماہی ہو، اور اس کا سائز ۱۸x۲۲ یعنی

ڈیمائی سائز ہو، رسالہ کی ساری ذمہ داریاں میرے سر آئیں، مضامین فراہم کرنا، کتابت کرانا، پریس بھیجنا، حوالۂ ڈاک کرنا، لفافہ بنانا، پیک کرنا، غرضیکہ ابتداء سے انتہاء تک سارا بوجھ اس عمر میں میرے کندھوں پر ڈال دیا گیا۔

میں نے پہلا شمارہ مرتب کیا، آفسٹ کی کتابت کرائی، ناتجربہ کار پریس والے سے طباعت کرائی، لیتھو سے بھی خراب چھپائی ہوئی، البتہ ٹائٹل یک رنگا ہونے کے باوجود دیدہ زیب اور صاف ستھرا چھپا تھا، شہر میں پبلسٹی کیلئے رسم اجراء کا ایک پروگرام بنایا گیا، ۲۶؍جنوری ۱۹۹۰ء کو ''قدرت اللہ گلزار تعلیم'' کے ہال میں یوم جمہوریہ کا پروگرام تھا، شاندار اسٹیج بنا ہوا تھا، پورے ہال میں کرسیاں تھیں، شام کو اسی ہال اور پنڈال میں رسالہ کی تاج الدین اشعر ایڈیٹر اخبار ''قومی مورچہ'' کے ہاتھوں رسم اجراء ادا ہوئی، انھوں نے رسالہ کی ایک کاپی صدر جلسہ پروفیسر حفیظ بنارسی کو پیش کی، انھوں نے حاضرین کے سامنے اس کی رونمائی کی، احباب میں سے مفتی صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب اور میں نے مختصر مختصر تقریریں کیں، رسالہ کی ضرورت واہمیت بتائی، مہمان خصوصی نے اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا، پھر شرکاء تقریب میں رسالہ تقسیم کیا گیا، اس طرح سادگی کے ساتھ یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

رسالہ کے پہلے ہی شمارے نے علمی حلقوں کی نگاہیں اپنی طرف منعطف کرالیں اور بے پناہ خراج عقیدت حاصل کیا، اس شمارے کے ایک مضمون ''مسلمانوں کا مسیحا'' کا تذکرہ بہت سی علمی مجلسوں اور مختلف الخیال حلقوں میں ہوا، بے طلب وتقاضا بہت سے خطوط اس سلسلہ میں ادارے کو موصول ہوئے، جن کو بعد میں ترجمان الاسلام کے تیسرے شمارے میں شائع کردیا گیا۔

آج رسالہ کی عمر چھ سال ہوچکی ہے، ساتویں سال کا پہلا شمارہ جنوری

۱۹۹۶ء میں شائع کردیا گیا ہے جس میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی کے سلسلہ میں دوسال سے چلنے والی ایک علمی وتحقیقی بحث کا آخری حصہ ہے، اور اداریہ میں محاکمہ کیا گیا ہے کہ ترجمان الاسلام کا جب دوسرا سال شروع ہوا تو اس کا آغاز حدیث نمبر سے کیا گیا، حدیث کے سلسلے میں معرکۃ الآراء مضامین بالخصوص تدوین حدیث کی تاریخ کا بھرپور جائزہ لیا گیا، اور دوسرے عنوانات پر تحقیقی مضامین شامل کئے گئے۔

رسالہ کی عمر کا تیسرا سال تھا کہ عالمی شہرت کے مالک استاد محترم محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا، تعزیت کیلئے جب صاحبزادگان محدث جلیل کے یہاں گیا تو میں نے ان سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ آئندہ ترجمان الاسلام کا شمارہ محدث اعظمی نمبر ہوگا، تیسرے دن اپنے احباب کے ساتھ فوٹو گرافر لے جاکر مختلف مقامات، یادگار وآثار کے فوٹو اتروائے اور لے کر بنارس چلا آیا، اپنے حلقۂ احباب میں عنوانات دے کر مضامین لکھوائے تاکہ تکرار نہ ہو، جو عام طور پر ایسے نمبروں میں ہوتا ہے، ترتیب میں علمی اور تحقیقی مضامین کو اوّلیت دی گئی، تاثراتی مضامین کا حصہ مختصر رکھا گیا تاکہ شخصیت کا باوقار تعارف ہو۔

تین سو سے زائد صفحات میں یہ نمبر شائع ہوا اور ہفتہ عشرہ میں ساری کاپیاں نکل گئیں، جنھوں نے حاصل کرنے کی تاخیر کی ادارہ ان کی فرمائش کی تکمیل میں قاصر رہ گیا، اس طرح رسالہ نے اپنی زندگی کے چھ سال پورے کئے، مضامین کے انتخاب، تعلقات، رواداری، مروت، شخصی احترام کا کبھی دخل نہیں ہونے دیا گیا جبکہ مدارس سے شائع ہونے والے رسائل اس ادارہ کے بزرگوں کے ''تبرکات'' سے بھرے رہتے ہیں، چاہے دورِ حاضر سے ان تبرکات کا تعلق ہو یا نہ ہو، اس کی کوئی افادیت مطلوب ہو یا نہ ہو۔

ترجمان الاسلام کے اجراء کے بعد درجنوں اداروں نے اپنے اپنے ترجمان نکالے، اور نکالتے جارہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہرادارہ اپنا ترجمان نکال کر اپنے ادارہ کو مکمل سمجھے گا، یہ اچھا رُجحان ہے، وقت کا یہی تقاضا ہے، اخبارات ورسائل پڑھنے کا عوام کو چسکا لگ چکا ہے، اداروں کے یہ رسالے بہت اچھا اصلاحی کردارادا کرسکتے ہیں، بس شرط یہ ہے کہ اپنے رسالہ کو دلچسپ بنائیں، خوبصورت شکل میں پیش کریں، مضامین میں تنوع ہو، رسالہ ایسا دلکش ہو کہ آدمی مجبور ہوکر ہاتھ میں اٹھالے لیکن افسوس یہ ہے کہ کاغذ، کتابت، طباعت کے لحاظ سے بہت ہی دیدہ زیب ہونے کے باوجود موجودہ دور کے ادبی معیار سے فروتر محسوس ہوتے ہیں، ان رسالوں میں دلچسپی وہی لوگ لیتے ہیں جو اس ادارہ کے حلقۂ اثر میں ہیں اور صرف تبرک سمجھ کر اس کو خریدتے ہیں، دوسرے حلقہ اثر کے لوگ یا مختلف الخیال اہل علم ان کو ہاتھ نہیں لگاتے، اس طرح ان کی افادیت کا دائرہ بہت محدود ہوکر رہ جاتا ہے، یہ رُجحان غلط ہے کہ رسالے صرف خانہ پُری کیلئے نکالے جائیں، ان کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو، عصر حاضر کے مسائل اور اس کے تقاضوں کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

اپنے لوگوں کے رسالوں میں ایک خامی اور محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ان رسالوں میں زبان وبیان کے جدید اُسلوب، اُردو تعبیرات، دلکش اور خوبصورت بنانے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی، شاید زبان وبیان کے اس حسن کو وہ اپنے تقدس وتقویٰ کے مناسب سمجھتے ہیں، اور مرکری لائٹ کے زمانے میں مٹی کا دیا جلانے پر بضد ہیں اور سمجھتے ہیں اس سے دنیا کے ظلمت کدوں میں روشنی پھیلے گی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسالے اداروں کو چندہ دینے والے کم پڑھے لکھے لوگوں کو پیش نظر رکھ کر نکالے جاتے ہیں جبکہ علمی اداروں کے رسالے خواص اور

پڑھے لکھے طبقے کے لئے نکالے جاتے ہیں تا کہ ملت اسلامیہ کا وہ طبقہ جو عوام پر اثر انداز ہوتا ہے اس کی فکر ورائے کو متاثر کیا جائے تا کہ وہ مثبت اندازِ فکر لے کر عوام کے سامنے آئیں، کجروی پہلی اہل علم میں اور قوم کے دانشور طبقے میں آتی ہے، اس لئے اہل علم کو راہِ اعتدال پر لانے کے لئے علم وتحقیق کے کڑے سے کڑے معیار کو مدنظر رکھ کر رسالوں میں مضامین آنے چاہئیں تا کہ ان کے تشکیکی ذہن سے شک کے کانٹوں کو نکال دیا جائے اور وہ کھلے ذہن اور دل ودماغ سے دین کی خدمت کر سکیں، ہم نے ابتداء سے اس اصول کو گرہ باندھ لیا ہے اور سختی سے اس پر کاربند ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ جامعہ اسلامیہ میں لکھنے والوں کا کوئی حلقہ تیار نہیں کرسکا، کئی افراد ایسے تھے کہ اگر اس طرف توجہ کرتے تو بہت کامیاب ہوتے لیکن بتدریج ماحول ایسا غیر علمی ہوگیا کہ سنجیدگی ومتانت کے ساتھ کوئی اس پہلو پر سوچنے کے بھی لائق نہیں رہا، دینی مدارس کی اندرونی فضا عام طور پر ایسی ہوتی جارہی ہے کہ اس میں مفید تعمیری ذہن رکھنے والے مفقود ہوتے جارہے ہیں، دین کی خدمت کا نام لینے والے تنگ نظری، بغض وعناد، باہمی آویزش اور چپقلش میں سر سے پیر تک ڈوبے رہتے ہیں، وہ دین کی خدمت کیا کرسکیں گے۔

بنارس شہر.........................

۱۳؍لاکھ انسانوں کے اس شہر میں میرا کوئی حلقۂ احباب نہیں اور نہ عوام سے میرے روابط ہیں، میں شہر کے محلوں اور بازاروں سے بھی صحیح طور پر واقف نہیں، ایک بار گنگا کے گھاٹوں کو دیکھا ہے، جب کچھ دوستوں نے ایک...... کرایہ پر لیا، اور بیچ گنگا میں ہم نے مغرب کی نماز ادا کی، کچھ کھانے پینے کا شغل رہا، پھر کچھ نظمیں اور لطیفے، کچھ تفریحی گفتگو، کچھ ہنسی اور قہقہے اور واپس ہوگئے، پھر دوبارہ جانے کی نوبت نہیں آئی،

ایک بار کشتی کے ذریعہ دھرہرا کی مسجد گئے، وہاں عصر کی نماز پڑھی اوراس کی دیوار پر لگے ہوئے کتبے کی نقل لی اور چلے آئے۔

بنارس آج کل کی سیاسی اصطلاح میں نہایت حساس شہر مانا گیا ہے، یہاں فساد کی چنگاریوں کو شعلہ جوالہ بنتے دیر نہیں لگتی، یہاں ہندو مسلم دنگوں کی مسلسل اور مربوط تاریخ ہے، ان فسادات کے دنوں میں یہاں کا ماحول اتنا خوفناک اور دل دہلا دینے والا ہوجاتا ہے کہ بڑے مضبوط اور فولاد کا جگر رکھنے والے بھی کانپ جاتے ہیں، تھرا جاتے ہیں، یہ واقعات اتنے ہولناک اور دردناک ہوتے ہیں کہ ان کی دہشت اور خوف زندگی کو فراموش کرنا مشکل ہوجاتا ہے، انھیں واقعات کو قلمبند کرنے کے لئے میں نے ڈائری لکھنی شروع کردی اوراہم واقعات کو نوٹ کرکے رکھ دیا ہے، یہ ڈائری اگرچہ ترتیب سے نہیں ہے لیکن ہر بڑے اوراہم واقعہ کے بارے میں اندراج موجود ہے، بنارس کی ۱۸ر سالہ زندگی میں متعدد بار ایسے خوفناک اور دل دہلانے دینے والے حادثات ہوئے کہ روز وشب کا ایک ایک لمحہ قیامت کی گھڑی بن گیا، اور فسادات کا سب سے کربناک پہلو یہ ہے کہ ساری قیامت صرف مسلمانوں پر ٹوٹتی ہے، ہندو غنڈوں سے کہیں زیادہ حکومت کے ذمہ دار افسران اوران کی پولیس غنڈہ گردی کرتی ہے، مسلمانوں کی اس وقت کی بے بسی، مظلومیت وبیچارگی خون کے آنسو رلانے پر مجبور کرتی ہے۔

ہر فساد کے موقع پر کرفیو کا نفاذ ضروری ہے، مسلمانوں پر سارے مظالم انھیں کرفیو کے اوقات میں ہوتے ہیں، پولیس مسلح ڈاکوؤں اور قاتلوں کی طرح مسلمانوں کے مکانات میں گھس جاتی ہے، دروازے توڑے جاتے ہیں، شٹر کاٹے جاتے ہیں، پولیس گھسنے کا راستہ بنا کر گھروں کے اندر پہونچتی ہے اور وہ سب کچھ کرتی ہے جو ایک

خونخوار ڈاکو کرسکتا ہے، بندوق کی زد میں عورتوں اور مردوں کو رکھ کر الماریوں اور تجوریوں کی کنجی مانگی جاتی ہے، اور روپیوں، پیسوں اور زیورات پر پولیس کتوں کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے اور گھر والوں کو بندوق کے کندوں سے پیٹ کر اپنی جیبیں بھر کر واپس لوٹ جاتی ہے، سارے شہر پر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔

ہم لوگ جامعہ اسلامیہ کی چہار دیواری میں قید ہوکر رہ جاتے ہیں، کرفیو کے زمانے میں اپنی کوٹھری میں جوکسی بزرگ کے مزار کی طرح ہے محدود ہوکر رہ جاتا ہوں، دل ودماغ کو مصروف رکھنے کے لئے قلم کاغذ کا سہارا لیتا ہوں اور کئی کئی گھنٹے دروازہ بند کئے پڑا رہتا ہوں، میری کئی کتابیں اور مضامین اسی ماحول میں لکھے گئے ہیں اور شر سے خیر کا پہلو نکلا ہے، میری کتاب ''کاروانِ رفتہ'' اسی کرفیو کے سناٹے میں مرتب ہوئی ہے، جو پونے چار سو مشاہیر کے تذکروں پر مشتمل ہے، اور اسی سال حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے۔

ایک حادثہ......................

حادثہ سے زیادہ شاید حادثہ کی یاد کربناک ہوتی ہے، میں اپنے دل کا حال کچھ ایسا ہی پاتا ہوں، ۳ر مئی ۱۹۹۵ء کو گذرے کتنے دن ہوگئے، لیکن آج بھی اس حادثہ کی یاد آتی ہے جو اس دن میرے دل پر گذرا تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل کے زخموں کے سارے ٹانکے کھل گئے اور ہر زخم سے خون رِس رہا ہے، اسی تاریخ کو ۴۲ر سالہ رفاقت کے بعد رفیقۂ حیات نے میرا ساتھ چھوڑا۔

بیوی کو شریک زندگی اور شریک حیات کہا جاتا ہے لیکن اس کی معنویت کا صحیح احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس دنیا سے رَخت سفر باندھ لیتی ہے، دلوں کی امنگ، جذبات کی ترنگ، حوصلوں کی اولوالعزمی، شاندار مستقبل کا خواب اور اس کے

لئے جدو جہد اس کی موت کے ساتھ ان سب پر موت طاری ہو جاتی ہے، جیسے ساری توانائیاں کسی غیر مرئی ہاتھ نے یک بیک سلب کر لیں، جیسے لمبے سفر سے پا پیادہ چلا ہوا مسافر تھک کر چور ہو جاتا ہے اور ایک قدم آگے چلنے کی اس میں سکت نہیں رہ جاتی ہے، میں ایسے ہی حادثہ سے گذر رہا ہوں۔

وہ عرصہ سے صاحب فراش تھی، بستر پر لیٹی ہوئی چھت کو تکا کرتی تھی جیسے اوپر جانے کی تیاری کر رہی ہے، میں بنارس آتے ہوئے ہر بار آخر میں اس سے رُخصت لینے جایا کرتا تھا، اب کی بار جب میں رخصت لینے کے لئے گیا تو اس نے اپنے کمزور ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

''جلدی آیئے گا''

یہ اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا اس کے اندر کی آواز ہے، کیا وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ میرے سفر کا وقت قریب آچکا ہے، اگر آپ نے دیر کر دی تو مجھے کون رخصت کرے گا؟ آپ سامنے ہوں گے، آپ کا ہاتھ میری پیشانی پر ہوگا تو میں خوشی سے جان دیدوں گی، یہ سوچ کر میرا دل دھڑ کنے لگا اور چلتے ہوئے جب میں نے مڑ کر دیکھا تو اس کی نگاہیں میرے قدموں پر تھیں، آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ مجھ کو رخصت کر رہی ہے یا وہ خود پا بہ رکاب ہے اور میں اس کو رخصت کر رہا ہوں، ہر بار بنارس آتے ہوئے مجھے یہ اندیشہ لاحق رہتا تھا کہ میں اس کو زندہ دیکھ سکوں گا یا نہیں؟ اب کی بار جب بنارس آیا تو خطرہ شدت اختیار کر چکا تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے ٹیلیفون کا ایک سیٹ میرے کمرے میں آگیا ہے، جب اس کی گھنٹی بجتی تو دھڑ کتے ہوئے دل کے ساتھ ریسیور اٹھاتا تھا کہ شاید حادثہ کی خبر ہو،

میں ایک دن عصر بعد کمرے کے باہر احباب کے ساتھ بیٹھا ہوا باتوں میں مصروف تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، احباب میں سے ایک نے کمرے میں جا کر ریسیور اٹھایا، میں اپنی جگہ بیٹھا رہا، فوراً انھوں نے کہا کہ آپ کے لڑکے جمیل احمد کا فون ہے، یہ سنتے ہی دل اتنی زور سے سینہ میں دھڑکا جیسے سینہ چیر کر باہر نکل جائے گا، میں نے کہا خدا خیر کرے، میں نے ریسیوران کے ہاتھ سے لے لیا تو لڑکے نے میری آواز پہچان کر صرف اتنا کہا ''اماں کی طبیعت زیادہ خراب ہے'' میں کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے ٹیلیفون رکھ دیا، صرف ایک جملہ میں اس کی آواز بھرا گئی، دوسرا جملہ ادا کرنے کی اس میں طاقت ہی نہیں رہی، شدت گریہ سے اس کی آواز حلق میں بند ہو کر رہ گئی تھی میں نے سمجھ لیا کہ حادثہ بہت قریب آ چکا ہے۔

میں دو بجے رات میں گھر پہونچا، وہ موت وزیست کے دوراہے پر تھی، زندگی موت سے دست وگریباں اور نبرد آزما تھی، لیکن زندگی کمزور اور موت طاقتور تھی، پانچ دنوں کی مسلسل نبرد آزمائی نے زندگی کو تھکا ڈالا تھا اور اس نے ہتھیار ڈال دئے تھے، چھٹے دن مغرب کی نماز ہو چکی تھی، یٰسین پڑھی جا رہی تھی میرے بچے اور بچیاں، عزیز واقارب چاروں طرف سے گھیرے ہوئے کھڑے تھے، میں ایک جانب اپنی لٹتی ہوئی کائنات دیکھ رہا تھا کہ اس کا داہنا ہاتھ ذرا سا اٹھا پھر یک بیک آنکھیں کھلیں جو ٹھیک میری جانب تھیں، گویا جانے والی مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہے، پھر یک بیک آنکھیں بند ہو گئیں اور منکا ایک طرف ڈھلک گیا، زندگی موت سے شکست کھا گئی، میرے بھرے پُرے گھر کو ایک رشتہ میں باندھنے والی ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو گئی، صبر وضبط کا باندھ ٹوٹ گیا، آنکھوں سے جلتے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے نکل کر پلکوں پر آ گئے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون پڑھ کر باہر نکل آیا، دوسرے دن خود اپنے

ہاتھوں اپنی آدھی زندگی کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر کے لٹے ہوئے مسافر کی طرح واپس آ گیا۔

گھر میں ہر طرف اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں، ہر چیز کو اس کی ذات سے نسبت تھی، جس چیز پر نظر جاتی وہیں اس کی تصویر کھڑی ہو جاتی، یادوں کی اس یلغار نے میرے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا، مگر اب ویران ویران سا لگنے لگا، زندگی ایک اجڑے ہوئے گلستاں کی طرح بن گئی جس میں کبھی بہار آنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

میں پرانی یادوں میں شب و روز کھویا کھویا رہتا، جب میں حالات کی سختی سے تھک کر چور ہو جاتا، جد و جہد کی کڑی دھوپ سے جلا بھنا گھر آتا تو اس کے وجود کا گھنا سایہ میری راحت رسانی کے لئے موجود رہتا، اس کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں سکون و طمانیت کا خزانہ مل جاتا، اور میری ساری ذہنی تکان دور ہو جاتی، آج میں اس سرمایۂ سکون و راحت سے محروم ہوں، تنہائی کا عذاب جھیل رہا ہوں اور قید تنہائی کے دن کاٹ رہا ہوں۔

بیماری کے وقت انسان کو صحت کی امید رہتی ہے، اس کے لئے تدبیریں کرتا ہے، مختلف علاج کرتا ہے اور کبھی بھی مایوس نہیں ہوتا، اور علاج کا سلسلہ بند نہیں کرتا کیونکہ امید کا چراغ اس کی نگاہوں کے سامنے جلتا رہتا ہے، معالج لاکھ اس کے صحت مند ہونے سے مایوسی کا اظہار کر چکے ہوں، لیکن وہ کسی حال میں ہمت نہیں ہارتا اور صحت کی حصولیابی کی جد و جہد میں لگا رہتا ہے لیکن میری نگاہوں کے سامنے تو امید کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھی نہیں ہے، میری زندگی کو ایسا روگ لگ گیا ہے جو لا علاج ہے، اس سے نجات پانے کی کوئی سبیل نہیں، خود مجھے بھی یہ یقین حاصل ہے، ایسے انسان کی ناامیدی کتنی کربناک ہو سکتی ہے، اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا جائے

ایک دن تنہائی میں بیٹھا اس کی یاد میں کھویا ہوا تھا، اس کے خیال کو دماغ سے جھٹک نہ سکا، میں نے ان کیفیات کو چند اشعار میں قید کر دیا، احساسِ تنہائی، مستقل کی کربناک زندگی کا تصور جو ذہن میں تھا وہی اشعار میں آ گیا۔

اک حادثہ جو سر سے بہ ظاہر گذر گیا
وہ زہر بن کے میری رگوں میں اتر گیا
دل ہے کہاں؟ دماغ کہاں؟ کچھ خبر نہیں
شیرازۂ حیات کچھ ایسا بکھر گیا
ویرانیاں ہیں اب تو چمن کے نصیب میں
اک قافلہ بہار کا آکر گذر گیا
توڑا ہے دم وہیں پہ دل ناصبور نے
منہ موڑ کر جہاں سے شریک سفر گیا

میرا مستقبل میری نگاہوں کے سامنے پوری تابناکیوں کے ساتھ موجود تھا، اور یہی سب سے زیادہ روح فرسا سانحہ تھا، آخری شعر اسی کا ترجمان ہے۔

اب ساری زندگی ہے کڑی دھوپ کا سفر
اک پیڑ سایہ دار تھا، وہ بھی گذر گیا

اسیر ادروی
ادری، ۱۴؍جنوری ۱۹۹۶ء

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

حضرت مولانا اسیر ادروی! مختصر تعارف

نام.................مولانا اسیر ادروی

وطن.................قصبہ ادری، ضلع مئو

ولادت...........۱۹۲۶ء، قصبہ ادری، ضلع مئو

تعلیم ....ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، پھر مفتاح العلوم مئو، احیاء العلوم مبارکپور، دار العلوم مئو، اور آخر میں (۱۹۴۲ء) جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد سے سند فراغت حاصل کی ....فراغت کے بعد سیاست کی خارزار وادیوں میں ایک لمبی مدت گزارنے کے بعد ۱۹۷۸ء میں جامعہ اسلامیہ بنارس آیا، اور اب تک اس سے وابستہ ہوں، اس دوران مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں۔

فہرست تصنیفات مولانا اسیر ادروی

اسمائے کتب	صفحات	مطبوعہ	سنہ طباعت
دار العلوم دیوبند احیاء اسلام کی عظیم تحریک	۴۷۰	دار المؤلفین دیوبند	۱۹۹۲ء
مآثر شیخ الاسلام	۵۰۴	// // //	۱۹۸۷ء
تحریک آزادی اور مسلمان	۵۵۱	// // //	۱۹۸۸ء
حضرت شیخ الہندؒ حیات اور کارنامے	۲۹۱	شیخ الہند اکیڈمی //	۱۹۹۸ء
مولانا قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے	۴۳۲	// // //	۱۹۹۵ء
مولانا رشید احمد گنگوہی حیات اور کارنامے	۴۱۲	// // //	۱۹۹۷ء
عہد رسالت: غارِ حراء سے گنبد خضریٰ تک	۴۱۵	// // //	۲۰۰۰ء
جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار	۴۷۴	مرکز دعوتِ اسلام //	۱۹۸۱ء

تاریخ جمعیۃ علماء ہند حصہ اول	۵۷۶	مرکز دعوتِ اسلام //	۱۹۸۲ء
تفسیروں میں اسرائیلی روایات	۴۴۶	کتبخانہ حسینیہ //	۱۹۸۳ء
شرح دیوان متنبّی	۵۶۲	// // //	۱۹۸۴ء
تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ	۱۲۸	دارالمؤلفین دیوبند	۱۹۸۵ء
فن اسماء الرجال	۱۶۸	// // //	۱۹۸۸ء
کاروانِ رفتہ	۲۷۱	دارالعلوم حیدرآباد	۱۹۹۳ء
دبستان دیوبند کی علمی خدمات	۱۸۲	دارالمؤلفین دیوبند	۱۹۹۸ء
مجاہد اسلام مولانا رحمت اللہ کیرانوی	۳۳۰	فرید بکڈ پو دہلی	۲۰۰۴ء
مولانا امام الدین پنجابیؒ	☆☆	قمر الباری دیوریا	۲۰۰۲ء
گلزارِ تعلیم	☆☆	قدرت اللہ گلزار تعلیم بنارس	۱۹۸۸ء
تبلیغی جماعت احیاء اسلام کی عالمگیر تحریک	☆☆	قاسم العلوم زمانیہ	۱۹۹۲ء
عقیدۂ توحید اور اس کے عملی تقاضے	☆☆	// // //	۱۹۹۰ء
جواہر حدیث	☆☆	مدرسہ دارالسلام ادری	۲۰۰۳ء
احادیث کے جواہر پارے	☆☆	جامعہ قاسمیہ ادری	۲۰۰۵ء
عورت اور اسلام	☆☆	مدرسہ دارالسلام ادری	۱۹۹۵ء
جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ	☆☆	للہ پورہ بنارس	
معجم رجال البخاری	۱۲۰۰	غیر مطبوعہ	
داستانِ ناتمام (خودنوشت)		کتب خانہ حسینیہ دیوبند	۲۰۰۹ء

﴿گم شدہ تصانیف﴾

(۱) کمیونزم تجربات کی کسوٹی پر (۲) غدارانِ وطن

(۳) نشیب وفراز (افسانوں کا مجموعہ) (۴) روداد قفس (مجموعۂ کلام)

☆☆☆☆☆☆☆